www.Paksociety.com

ماہنامہ

نئے افق

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
www.Paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

مغربی ادب سے انتخاب

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتہ: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

افسانہ

ناول

مستقل سلسلے

خط و کتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 ایک از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

www.Paksociety.com



مشتاق احمد قریشی

کراچی چینوٹوں بھرا کباب......

کراچی شہر کئی شہروں کا شہر ہے کراچی کا ہر علاقہ اپنی آبادی' اپنے بازاروں اور افرادی قوت کے باعث اپنی جگہ ایک مکمل شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس شہر کو شہر بنانے اور اس کی اکثریتی آبادی کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کی پہل ایم کیو ایم نے کی تھی اسے یقیناً شہر کراچی کی اکثریت نے پزیرائی بخشی اور اس کا ساتھ دیا لیکن اس کی مقبولیت نے حاسدوں کو ہوا بھی دی انہوں نے بھی اپنی سی کوشش کر کے کراچی والوں کے دل جیتنے کی کوشش کی لیکن انہیں وہ پزیرائی وہ مقبولیت میسر نہیں آسکی جو ایم کیو ایم کے حصے میں آچکی تھی' پہلے اس پر لسانی جماعت کا لیبل لگایا گیا پھر دہشت گرد تنظیم کے عنوان سے نوازا گیا لیکن شہر کراچی کی اکثریتی آبادی اس کے گرد جمع ہوتی رہی اس کی مقبولیت کو ہی دیکھتے ہوئے دوسری اقلیتی جماعتوں' سیاسی جماعتوں کی بغل بچہ تنظیموں کی باسی کڑھی میں ابال آنا شروع ہوا اور ہر لسانی اور سیاسی مذہبی تنظیم وجماعت کی ذیلی تنظیم یا طلباء تنظیموں کے سہارے انہوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کراچی کی سڑکوں پر' یونیورسٹی کالجوں میں دہشت گردی سے کرنا شروع کیا اور اپنے اسلحہ کے زور پر لوگوں کو نہ صرف قتل وغارت کیا بلکہ شہریوں کو بلیک میل بھی کرنا شروع کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ ابتداء میں ایم کیو ایم نے بھی اپنی تنظیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لوگوں سے چندے وصول کیے ہوں اور یقیناً لوگوں نے خصوصاً کراچی کی اکثریتی آبادی نے اپنے مالی تعاون سے از خود بھی نوازا ہو جسے لوگوں نے جلن و حسد کے باعث بھتہ کہا اور پھر اسی بھتے کی وصولی کے لیے خود بھی لوگوں کو پرچیاں دھمکیاں دینا شروع کر دیں' اب کوئی بھی جماعت یا تنظیم عطیہ یا چندہ وصول نہیں کرتی بلکہ اپنے زور بازو اپنی قوت کا مظاہرہ کر کے اپنے حامیوں کو اور اپنے علاقوں میں رہنے والے تمام حامی اور غیر حامیوں کو ذرا دھمکا کر بھتہ وصول کر رہی ہے اب اگر کراچی کے کسی علاقے میں ایک سے زیادہ یا کئی جماعتوں تنظیموں کے حامی رہتے بستے ہیں تو پھر ان لوگوں کے لیے دہرا عذاب ہے کہ انہیں اگر اس محلے اس گھر میں رہنا ہے تو پھر سب کو ہی بھتہ دینا ہے۔ کاروباری علاقوں کی تو بات ہی الگ ہے' اب تو رہائشی علاقوں سے بھی فی گھر کے حساب سے وہ بھی حسب حیثیت بھتہ وصول کیا جا رہا ہے۔ ایک تنظیم یا جماعت نہیں ہے اب تو چاہے وہ کوئی مذہبی جماعت ہو دینی جماعت ہو یا سیاسی اور لسانی جماعت ہو۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ بھتہ وصولی

کا مقابلہ ہو رہا ہے کہ کون کس سے زیادہ بھتہ وصول کرتا ہے۔ اس بھتہ وصولی کا ہی شاخسانہ کراچی میں ہونے والا یہ قتل عام ہے' اس قتل عام سے ان دہشت گردی کرنے والوں کو دہرا فائدہ حاصل ہوتا ہے ایک تو مخالف جماعت کے کسی سرگرم کارکن سے راستہ صاف ہوتا ہے دوسرے مخالف جماعت پر اپنی دھاک بیٹھانا بھی مقصود ہوتا ہے' اپنی قوت وطاقت کا اظہار بھی ہوتا ہے کراچی کے رہنے والے عام لوگوں کو مرعوب کرنا بھی مطلوب ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے اور الیکشن قریب آ رہے ہیں ان تمام ہی سیاسی لسانی مذہبی جماعتوں میں اپنی قوت کے اظہار کا جنون بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ایک دوسرے کو ڈرانے خوف زدہ کرنے کے علاوہ اس سے وہ یہ فائدہ بھی حاصل کرنا چاہ رہے ہیں کہ ان علاقوں کے ووٹر حضرات بھی سمجھ لیں کہ یہ علاقہ کس کا ہے اور انہیں ووٹ کیسے اور کس کے کہنے پر استعمال کرنا ہے۔

کراچی کو ان لوٹ مار کرنے والے بھتہ خوروں نے چیونٹی بھرا کباب بنا دیا ہے ہر کوئی اپنا حصہ بقدر قوت حاصل کر رہا ہے بلکہ اب تو بات آگے ہی بڑھتی جا رہی ہے اور یہ لوٹ مار کرنے والی تنظیمیں کراچی کے معصوم بے گناہ شہریوں کو خونخوار گدوں کے مانند نوچنے کھسوٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اب جب کہ ان کے منہ کو بھتے کا خون لگ چکا ہے ان سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی کیونکہ اب تو اس بہتی گنگا میں انتظامیہ اور پولیس بھی خوب خوب ہاتھ دھو رہی ہے۔ اب بھتہ صرف سیاسی مذہبی جماعتیں ہی وصول نہیں کر رہیں بلکہ پولیس بھی کسی سے پیچھے نہیں' ہر کوئی کراچی شہر کے لوگوں کو بلکہ کراچی شہر کو ہی دونوں ہاتھوں سے لوٹنے پر لگا ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ قبضہ مافیا جو اب تک کراچی کے خالی پلاٹوں پر قبضہ کر رہی تھی اب پورے کراچی پر ہی قبضہ جمانا چاہ رہی ہے اور کراچی میں لگی اس آگ سے حکمران اپنے ہاتھ تاپ رہے ہیں' مزے لے رہے ہیں اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگ رہی اب دیکھنا یہ ہے کہ کراچی کب تک یونہی چیونٹیوں بھرا کباب بنا رہے گا اور اسے چیونٹیوں کی جگہ گدھ یونہی نوچتے رہیں گے' خون کی ہولی کھیلتے رہیں گے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ دبنے پر تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کراچی شہر پر ظلم وستم توڑنے والوں کے لیے تمام راستے کراچی والے مسدود کر دیں اور انہیں کہیں جائے پناہ نہ ملے۔ اللہ وہ وقت نہ لائے اور اہلِ کراچی اہلِ پاکستان کی حفاظت فرمائے اور ان عاقبت نااندیشوں کو عقل سلیم عطا فرمائے' آمین۔



www.Paksociety.com



عمران احمد

> حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین چیزیں میت کے ساتھ قبرستان تک جاتی ہیں اُن میں سے دو لوٹ آتی ہیں اور صرف ایک چیز اس کے ساتھ رہتی ہے ساتھ جانے والی چیزیں ایک تو اس کے رشتہ دار ہیں دُوسرے اس کا مال (چارپائی وغیرہ) اور تیسرے اس کا عمل اُن میں سے رشتہ دار اور مال تو لوٹ آتا ہے (اور صرف) اس کا عمل اس کے ساتھ رہ جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

عزیزان محترم..... سلامت باشد!

مئی کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ قارئین کی اکثریت نے پرچے میں ہونے والی تبدیلیوں کو پسند کیا۔ یہ تبدیلیاں ہم نے قارئین کی آراء کی روشنی میں ہی کی ہیں۔ البتہ کچھ قارئین نے مختصر افسانوں کی اشاعت پر تنقید کی ہے۔ جبکہ اکثریت نے اسے پسند کیا ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ افسانوں کے معیار کو مزید بہتر کریں تاکہ یہ تنقید کرنے والے دوستوں کے معیار پر بھی پورے اتر سکیں۔ اپریل کے شمارہ میں محترم حسام بٹ کی علالت کے باعث بازی گر شائع نہیں ہو سکی۔ دراصل ہم آخری وقت تک اس کا انتظار کررہے تھے اس لیے اداریہ میں تذکرہ نہیں کرسکے۔ بہرحال اس ماہ بازی گر شامل اشاعت ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی روحانی مسائل اور ان کا حل کے عنوان سے ایک نیا سلسلہ بھی شروع کیا جائے گا۔ جس سے قارئین کو بہت فائدہ ہوگا۔

شہر کا احوال ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا ہر روز لاشے اٹھائے جارہے ہیں۔ لوگ مہنگائی بیروزگاری کے باعث خودکشیاں کررہے ہیں۔ عوام سڑکوں پر سراپا احتجاج ہیں اور قوم کے تیر خواہ حزب اقتدار میں ہوں یا حزب اختلاف میں سب چین کی بانسری بجارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو رحیم و کریم ہی ہے بس ہم مسلمان ہی اپنے حال پر رحم کریں اور اپنی حالت تبدیل کرنے کا سوچیں۔

شہناز بلنو..... کراچی۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم اور دعائیں۔ اللہ کرے سب کے گھروں میں خیریت ہو۔ اس ماہ نئے افق مجھے بہت لیٹ ملا ہے آنچل کے ساتھ۔ اس لیے تھوڑا بہت ہی مطالعہ ہوسکا ہے۔ محترم یعقوب جمیل کے انتقال کا پتا چلا تو افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ بازی گر کی جگہ یعقوب صاحب کا ناول چھپا ہے۔ لیکن ابھی پڑھا نہیں ہے۔ یقینا کہانی اچھی ہی ہوگی ان کی ہر تحریر کی طرح۔ عمران بھائی آپ نئے افق میں افسانے کیوں چھاپ رہے ہیں۔ افسانوں کے لیے آپ کا دوسرا پرچہ ہے نا نئے افق کا مزاج افسانے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ آپ یوں بھی کرسکتے ہیں کہ ہر ماہ کسی خاص موضوع پر تین کہانیاں لگا دیا کریں۔ موضوع کوئی بھی ہوسکتا ہے معاف کیجیے گا افسانوں کا سلسلہ مجھے پسند نہیں آیا۔ پچھلی مرتبہ میں نے ایک مشورہ دیا تھا کہ کسی ایک موضوع پر کہانیوں کا خاص نمبر نکالا جائے لیکن سوائے نگاہ برادران کے کسی اور نے رائے نہیں دی کیوں بھئی؟ محمد فہد اور عبدالمالک کیف کے خطوط ملکی حالات پر تبصرے سے پر ہیں۔ میں آپ دونوں کے خیالات سے پوری طرح سے متفق ہوں اور صرف ایک دعا کرتی ہوں کہ یااللہ ہمارے ملک کے کرتا دھرتاؤں کے دلوں میں خوف آخرت یعنی جواب دہی کا خوف بٹھا دے یہ ایک لمحے کے لیے سوچیں کہ جب ہم سے ہمارا اللہ ہمارے اعمال کے بارے میں پوچھے گا تو ہم کیا جواب دیں گے اور پھر کیا ہم اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے کہ "تم میں ہر ایک داعی ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا۔" کاش یہ لوگ سمجھیں بس اب تو انصاف کے لیے روز قیامت ہی آجائے گا۔ پھر اللہ ان سے خود پوچھ لے گا۔ طاہرہ کیسی ہو چلو اب جب تم کراچی آؤ تو میرے گھر ضرور آنا۔ ملاقات ہی تو کرنی ہے ناز سلوش جب کراچی اپنے بھائی کی بارات لے کر آئی تھی تو مجھ سے ملنے کے لیے ٹائم نکال کر آئی تھی۔ عالیہ میں تمہارے فون کا انتظار کررہی ہوں۔ تم نے عمران بھائی کو دوبارہ فون کیوں نہیں کیا۔ کم از کم اپنا نمبر ہی مجھے دے دیتیں۔ طاہرہ تم نے گردش کے ہیرو کے کردار پر اعتراض کیا ہے بھئی اگر وہ بھی شاہ زیب کی طرح ہوتا تو پھر گردش اور زنجیر میں کیا فرق رہ جاتا۔ ناظم بخاری کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ساتھ آپ سے آپ کے والد کی وفات پر تعزیت بھی کرنی ہے اور آپ کی شادی کی مبارک باد بھی دینی ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ یہاں خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں آپ ایک اچھے رائٹر ہو یہ میں کہہ رہی ہوں اب اپنے دل کو اس خوشی سے آباد کرلو۔ رہی آپ کی بیگم کے بدذوق ہونے کی بات تو بھائی یہاں میرا اور آپ کا دکھ سانجھا ہے۔ میرے بھی میاں جی نے کبھی میری کوئی اسٹوری نہیں پڑھی۔ یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے انہیں سیاست میں زیادہ دلچسپی ہے سیاست پر ہی بات کرتے ہیں اور ٹی وی پر بھی کرنٹ افیئر کے پروگرام دیکھتے ہیں۔ پھر بھی ہماری زندگی ماشاء اللہ بہت خوش گوار گزر رہی ہے۔ مسلمان شادی دو وجوہ سے کرتا ہے ایک اپنے آپ کو پاکیزہ رکھنے کے لیے دوسرے مسلمانوں کی تعداد میں اضافے کے لیے تو میرے بھائی میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نیک اور سعادت مند اولاد عطا فرمائے اپنی دلہن کو میرا بہت پیار دینا۔ اب دوبارہ سے نئے افق کے لیے لکھو اور گفتگو کی محفل میں پابندی سے آؤ سدا خوش رہو۔ مجاہد ناز عباسی میرے مزاج اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہیں۔ آپ کو گردش بھی پسند آرہی ہے اس کے لیے شکریہ۔ عبدالحکیم ساجد شکر ہے کہ تھن آباد والے میری ایک پکار پر جاگ گئے۔ محفل میں آپ کو پاکر اچھا لگا۔ باقی سب لوگ کہاں ہیں؟ گردش کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ریاض حسین قمر صاحب ایسی بات نہیں ہے بھائی تو بہنوں کو بہت پیارے ہوتے ہیں۔ بلکہ شاید بہنیں بہنوں کو زیادہ پیار نہیں کرتیں۔ بھائی زیادہ کرتے ہیں۔ اب

دیکھیں نا بہن نے تو کوئی جواب نہیں دیا۔ بھائی فوراً بول پڑے آپ یقین کریں کہ جب ہم سنگلا ڈیم میں گھوم رہے تھے تو میں نے آپ کے بارے میں سوچا تھا بلکہ میں جس جس شہر میں گئی وہاں رہنے والے اپنے تمام بہن بھائیوں کو یاد کیا تھا۔ گردش آپ کو بھی پسند آرہی ہے۔ میں اللہ کے شکر کے بعد اپنے تمام قارئین کا دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ سنگاہ گروپ کا خط بہت اچھا لگا۔ لیکن بہت مختصر تھا کیا بات ہے بھئی کیا قلم میں روشنائی ختم ہوگئی تھی۔ نظم پسند کرنے کا شکریہ۔ مجھے شاعری آتی نہیں ہے۔ بس یوں ہی کبھی کبھی چند الفاظ لکھ لیتی ہوں۔ دراصل یہ وقتی کیفیت ہوتی ہے۔ میرے میاں جی جب بھی ملک سے باہر جاتے ہیں تو قلم سے کچھ الفاظ خود بخود لکھے جاتے ہیں۔ ورنہ عام حالات میں نہیں لکھ پاتی۔ عبداللہ شاہد میرے بھائی کیسے ہو پتا نہیں کیا بات ہے۔ میں تمہارے بارے میں بہت سوچتی ہوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم دکھی ہو مجھے بتاؤ تمہارے بچے کس کے پاس ہیں۔ تنہا ہو یا کوئی ساتھی بھی ہے۔ اپنے بارے میں ضرور بتانا۔ بھائی ارشاد قریشی آپ کیسے ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہوئی یا نہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ نے ملاقات کی بات کی تو بھئی ہم تو تین دن اسلام آباد رہ کر واپس آگئے چلو زندگی رہی تو آئندہ۔ منیر احمد ساغر آپ کا شکریہ آپ کو گردش پسند آرہی ہے اور آپ نے بھی پر اسرار نمبر نکالنے پر عمران بھائی کو فورس کیا۔ میں تو عمران بھائی کے بہت دنوں سے پیچھے پڑی ہوں۔ وہ شاید گھبرا رہے ہیں میرے خیال میں سارے رائٹر ایک ایک خوف ناک اور پر اسرار کہانی بھیج دیں یوں عمران بھائی کو نمبر نکالنا ہی پڑے گا۔ انجم فاروق ساحلی تم ایک اچھا سا زبردست پر اسرار ناول لکھو۔ مجھے پر اسرار کہانیاں بہت پسند ہیں۔ پھر میں ڈرتی بھی ہوں۔ سچی کہانیوں میں فاخرہ سلطانہ کی بیٹی پڑھی۔ یقین نہیں آیا کہ ایک ماں اپنی اولاد پر اس قدر ظلم و ستم کرسکتی ہے وہ بھی بیٹی ہونے کی سزا۔ افسانہ دوستی ایک عام سی کہانی تھی پڑھنے میں قطعی مزہ نہیں آیا۔ امید سحر اچھی لگی۔ سفلی علم بہترین تھی۔ باقی سب بھی ٹھیک ہی تھیں۔ جاری سلسلے بھی سب اچھے تھے کراچی کے حالات ایک بار پھر بہت خراب ہوگئے ہیں۔ ایک بندہ مار دیا جاتا ہے اس کے نتیجے میں دوسرے کئی بے گناہ مار دیے جاتے ہیں۔ گاڑیاں جلائی جاتی ہیں ٹرانسپورٹ بند کاروبار بند لاکھوں افراد پریشانی میں مبتلا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کے احتجاج سے کس کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ کاش ہم ٹھنڈے دل سے بیٹھ کر یہ بات سوچیں اللہ ہمیں شعور دے ہماری سوچ بہتر ہوگی تو عمل بھی بہتر ہوگا۔ اب اجازت چاہوں گی اس دعا کے ساتھ کہ اللہ میرے ملک پر اور اس میں بسنے والے لوگوں پر رحم فرمائے آمین

شہنی ارشاد. کراچی۔ محترم عمران بھائی السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے۔ میرے نئے افق کے سارے ساتھی آپ سب کیسے ہیں۔ غیر حاضری کافی لمبی ہوگئی ہے۔ اصل میں، میں پاکستان ہی میں نہیں تھی لیکن پابندی سے نئے افق کا مطالعہ جاری تھا۔ خطوط کی محفل میں بھی غائبانہ طور پر شرکت کرتی رہی اور پتا چلا کہ کس کس نے مجھے یاد کیا ہے۔ جن لوگوں نے یاد رکھا اور خاص طور پر اپنی دعاؤں میں ان سب کا بے حد شکریہ اس ماہ جب ارشاد قریشی صاحب کا خط پڑھا تو فوراً خط لکھنے کے لیے بیٹھ گئی۔ آپ نے مجھے اتنا زیادہ یاد کیا کہ مجھے آنا ہی پڑا۔ بھیا میں نے لکھنے کی چھٹی کبھی نہیں کی یہ تو ہمارے عمران بھائی کی مہربانی ہوتی ہے کہ میری طویل کہانی کے لیے نئے افق کے صفحات کم پڑ جاتے ہیں اس لیے وہ روک لیتے ہیں۔ مختصر کہانی مجھ سے لکھی نہیں جاتی آپ کو میری تحریریں پسند آتی ہیں۔ اس کے لیے دلی شکریہ قبول فرمایئے۔ گفتگو کے آغاز میں محترم یعقوب جمیل صاحب کی رحلت کا پڑھ کر دلی افسوس ہوا اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین۔ اس مرتبہ حسام بٹ پوری طرح سے غائب ہیں۔ پرچے میں بازی گر کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ محمد فہد بہت شکریہ کہ تم نے یاد رکھا۔ دعاؤں میں ضرور یاد رکھا کرو عبدالمالک کیف کیسے ہو تمہارا بہترین تبصرہ اور ملکی حالات پر تجزیہ پسند آیا مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی قانون کوئی حکومت ہی نہیں ہے۔ بس ہر جگہ ہر ادارے میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی صورت حال دکھائی دیتی ہے۔ اس حکومت کو لانے کے ذمہ دار بھی تو عوام خود ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہو رہا ہے اسے بھگتنا تو پڑے گا اس لیے تو کہتے ہیں کہ ووٹ امانت ہے اور اسے اس کے اہل ہی کو دینا چاہیے اللہ کرے کہ ہماری عوام میں صحیح ووٹ دینے کا شعور پیدا ہوجائے۔ ناظم بخاری آپ کے بابا جان کے انتقال کی خبر پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ ساتھ ہی آپ نے اپنی شادی کی خوش خبری بھی دی ہے۔ میری جانب سے دلی مبارک قبول کریں۔ انکل ریاض بٹ آپ مجھے بھول گئے ناں۔ جایئے میں آپ سے ناراض ہوں۔ عبداللہ شاہد بھائی آپ بھی بھول گئے یا پھر ناراض ہیں۔ یاد نہ کرنے کی وجہ ضرور بتائیں۔ اس مرتبہ نئے افق ابھی موصول ہوا ہے اس لیے پرچے پر تبصرہ نہیں ہوسکے گا۔ امید ہے ہمیشہ کی طرح اچھا ہی ہوگا۔ کاش بخاری آپ کے بارے میں کچھ اڑتی اڑتی خوش خبری ملی ہے سنا ہے آزادی مل گئی ہے۔ اور اب گھر والے سونے کی زنجیروں میں قید کررہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دائمی خوشیاں نصیب کرے آپ کو یہ شکایت ہے کہ میں نے آپ سے فون پر بات نہیں کی۔ لیکن میرے بھائی اس بات کے لیے میں پہلے ہی اپنے تمام بھائیوں سے معذرت کرچکی ہوں کہ میں کسی سے فون پر بات نہیں کرتی۔ نئے افق موجود ہے نا ہمارے رابطے کے لیے۔ امید ہے آپ کا گلہ دور ہوجائے گا۔ اس مرتبہ بھی بہت سے اہم لوگ غائب ہیں۔ سنگاہ انکل آپ کی کہانی زبردست تھی۔ مبارک باد قبول کریں۔ بہت سلام کے بعد دعا کی گزارش ہے۔ تمام برادران کو بہت سلام متقبول انکل کہاں غائب ہیں آپ۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سب کے گھروں میں خیر و عافیت رکھے اور پاکستان کو آباد رکھے آمین۔

سرور شاد..... تھن آباد۔ محترم عمران احمد! السلام علیکم تجانے کتنے دوستوں کے بے حد اصرار پر نئے افق کی محفل میں حاضری دے رہا ہوں۔ اپنی مرضی سے گیا تھا اور اپنی مرضی سے ہی آپ سب کے درمیان آیا ہوں۔ اس میں آپ سب کی یاد کا دخل ضرور ہے۔ جس طرح مجھے بار بار واپس بلایا گیا۔ مجھے پڑھ کر کافی حیرانی ہوتی تھی۔ سب مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتے ہیں؟ مجھے اس کی سمجھ نہیں اگر آپ سمجھا سکیں تو سمجھا دیں۔ میں نئے افق کو پڑھتا رہا ہوں۔ جس نے جو میرے بارے میں لکھا مجھے یاد ہے اور کچھ نے تو مجھ پر کچھ زیادہ ہی نظر کرم کی اور کچھ نے سوچا کہ چلو اس سے جان چھوٹی ایسے ہی چھوٹی چھوٹی بات پر لڑتا جھگڑتا رہتا ہوں۔ کسی کی بات برداشت نہیں کرتا اچھا ہی ہوا کہ اس محفل سے چلا گیا۔ چلا تو گیا تھا کسی سے ڈر کر نہیں گیا تھا۔ اپنی مرضی سے گیا تھا اور اب آپ سب کی محبت واپس لے آئی ہے۔ ایک بڑی تحریر کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے میری یہ اسٹوری آپ سب کو کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور کرے گی اور عمران صاحب سے بھی گزارش ہے کہ رائٹرز کو اپنے رابطے میں رکھا کریں اور جس کی تحریر ملے گفتگو میں اسے آگاہ کردیا کریں۔ گو کہ یہ اسٹوری بڑی ہے لیکن یہ بھی سوچیں تاکہ میں بھی

تو عرصہ دراز کے بعد اس جریدہ میں واپس آیا ہوں اور ہاں یاد آیا ایک مختصری اسٹوری (حج اکبر) آپ کے پاس ہوگی۔ کافی عرصہ پہلے ارسال کی تھی شاید آپ سے گم ہوگئی تھی۔ اسے تلاش کریں کیونکہ میرے پاس اس کی فوٹو کاپی نہیں ورنہ دوبارہ لکھ کر بھیج دیتا اسے تلاش کریں اور عالیہ انعام! آپ نے تو مجھے کچھ زیادہ ہی یاد رکھا کیوں؟ اب تو خوش ہونا آ گیا ہوں میں۔ شبنمی ارشاد! آپ کیسی ہیں۔ غصے میں تو نہیں میرے یوں اچانک آنے پر۔ محترمہ شہناز بانو! جو کہانی درمیان میں رائٹر چھوڑ جاتا ہے وہ آپ نے مکمل کرنی ہوتی ہے یہ بھی آپ کا کمال ہے۔ اب بازی گر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ بھی خراب گاڑی کی طرح رک گئی ہے۔ گردش کو مکمل کرنے کے بعد بازی گر کو بھی مکمل کر دینا اور عبداللہ شاہد! وہ چار تحریروں کی بات نہیں کی تھی۔ مستقل لکھو تو بات بنے۔ میں ادھر آ گیا ہوں اب تیاری کر لو لکھنے کی۔ ناز سلوش ذشے! آپ کی کہانیاں تسلسل سے نئے افق میں پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ اب تسلسل سے لکھتی رہنا۔ امیر حمزہ چاند! تمہارے دوسرے شعری مجموعہ کی اشاعت کا انتظار ہے۔ لگتا ہے تم شاعر بن کر ہی دم لو گے۔ عبدالحکیم ساجد تم تو ہر وقت پاس رہتے ہو۔ تم سے کیا چھپنا؟ اب تو خوش ہو نا' نئے افق میں آ گیا ہوں۔ اللہ دتہ عابد! آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ اچانک ہی شادی کر لی ہے خیر تو ہے؟ اور کیسی جا رہی ہے اچانک کی شادی؟ احمد علی کیف! نئے افق سے تم نے لکھنے کا آغاز کیا۔ اسے کبھی فراموش نہ کرنا اس میں اپنی شاعری بھیجتے رہنا۔ طاہرہ جبیں تارا! آپ کی کہانیاں پڑھتا رہا ہوں۔ ماشاء اللہ آپ کی کہانیوں میں بہتری اور نکھار آتا جا رہا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ناظم بخاری شکر ہے کہ تم نئے افق میں واپس آ گئے۔ نئے افق تمہاری پہچان ہے۔ اب یہاں مستقل لکھو اور مایوس ہونا چھوڑ دو۔ شادی کی بہت بہت مبارک باد آپ کے بابا جانی کی وفات کا بے حد افسوس ہوا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے (آمین)۔ ارشاد قریشی' عبدالمالک کیف' ریاض بٹ' ریاض حسین قمر' محمد فہد' سیدہ کاشف بخاری' ابن مقبول جاوید احمد صدیقی' نوید اسلم آپ سب کا شکریہ جو مجھے یاد رکھا اور بابا فقیر محمد بخش لنگاہ! آپ نے تو مجھے کبھی فراموش نہ کیا یہ آپ کی شفقت اور بڑا پن ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے اور لمبی عمر عطا کرے آمین۔ محترم سلیمان عاطف آپ نے مجھے جدہ سے فون کیا کافی خوشی محسوس ہوئی۔ آپ نے مجھے ہمیشہ یاد رکھا اور محترم یعقوب جمیل کی وفات کا پڑھ کر دل افسردہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے آمین۔

قمر جہاں...... لطیف آباد۔ محترم جناب عمران بھائی' سلام مسنون۔ امید ہے کہ آپ اور آپ کے عملہ اور آپ کا تمام اہل خانہ بخیر ہوں گے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میں بھی الحمدللہ بخیر ہوں۔ مارچ 2012ء کا شمارہ موصول ہوا۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک نے دل و دماغ تو کیا روح کو بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ واقعی میں صدر ہو یا وزیراعظم دنیا و آخرت میں کوئی بھی اس منصف اعلیٰ کی گرفت سے نہ بچ سکے گا نہ ہی کسی کو استثنیٰ حاصل ہوگا۔ گفتگو میں میں اپنے ان تمام ساتھیوں' قارئین اور دوست احباب کی بہت زیادہ مشکور ہوں جنہوں نے مجھ سے میری خیریت دریافت کی اور میرے لیے دعا گو ہے۔ خاص طور پر ریاض حسین قمر اللہ آپ کو بیٹے کی شادی مبارک کرے اور بہت سی خوشیاں دکھائے۔ بہن شہناز بانو ریاض بٹ صاحب اور عالیہ انعام صاحبہ جنہوں نے مجھ سے میری طبیعت کے بارے میں دریافت کیا۔ بہن عالیہ انعام کا بہت زیادہ شکریہ ادا کروں گی جنہوں نے مجھے کراچی میں ڈاکٹر شاہ سے ملنے کا مشورہ دیا مگر میں بہت زیادہ مجبور ہوں کیونکہ ایک تو میرے پاس سرمایہ نہیں دوسرے میرے ساتھ کوئی ایسا شخص نہیں جو مجھے لے کر آئے جائے۔ لے دے کے صرف ایک لڑکی ہے جس کی کسی بھی وقت رخصتی متوقع ہے۔ وہ بھی سمندر پار چلی جائے گی۔ شوہر ہے تو وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ میری اللہ سے دعا ہے کہ وہ کسی کو بھی مجبور و معذور اور محتاج نہ کرے۔ اگر محتاج کرے بھی تو وہ صرف اپنا۔ عمران بھائی گزشتہ شمارے میں میری غزل چھاپنے کا بے حد شکریہ۔ امید ہے کہ دیگر چیزیں بھی چھاپ دیں گے۔ اس کے علاوہ اس مرتبہ میں اپنی ایک اور سچی کہانی بھیج رہی ہوں۔ امید ہے کہ قریبی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور ہونے کا موقع دیں گے۔ زیر نظر شمارے میں انجم فاروق ساحلی کی قاتل کی تلاش' فقیر محمد بخش لنگاہ کی پچھتاوا' ریاض بٹ زہر عشق' مسلسل سلسلوں میں بازی گر' گردش اور اے حمید کی خطروں کا کھلاڑی بہترین لگیں۔ خوش بو سخن میں محمد اسلم جاوید' میثم علی آغا اور جناب فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب کی غزلیں بہترین لگیں۔ رہی بات ملکی سیاست و حالات کی تو اللہ ہی اس ملک پر کرم کرے تو کرے۔ ورنہ ہمارے حکمرانوں' سیاستدانوں اور لیڈروں کی زیادہ تعداد نے اس ملک کو لوٹ کر کھانے اور کھوکھلا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آج کل مہران گیٹ اسکینڈل' میمو گیٹ اسکینڈل اور دیگر مسائل کی گونج صبح و شام سنائی دے رہی ہیں۔ اربوں اور کروڑوں کا کرپشن اوپر سے غریب کی مہنگائی کے بوجھ سے دہری ہوتی کمر آئے دن آٹا' گھی' تیل اور سبزیاں غریب کی پہنچ سے دور ہوتی جا رہی ہیں۔ گوشت اور مرغی تو دور کی بات ہے آخر کھائیں تو کیا کھائیں۔ دن رات لوگوں کی زبانوں پر ڈھیٹ اور بے ضمیر حکمرانوں کے لیے بددعائیں ہوتی ہیں۔ مگر انہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ کیونکہ کوؤں کے کوسنے سے کون سا ڈھور مر جاتے ہیں۔ اوپر سے روز بروز ڈیزل' پیٹرول اور سی این جی کی قیمتوں میں اضافہ جس کی وجہ سے کرایوں میں اضافہ۔ یہ سارے عذاب خود ہماری اپنی ہی بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں۔ جن میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔ لیکن مشہور کہاوت "خود کردہ را علاج نیست" کے مصداق صرف تماشا دیکھنے پر مجبور ہیں۔ ہم مسلمان کہلائے جاتے ہیں لیکن مسلمانوں جیسی کوئی بات ہمارے اندر نہیں۔ نہ صبح کی نماز و تلاوت نہ ہی بود و باش نہ تو لباس و زیبائش خاص کر خواتین تو جتنا ہو سکتا ہے خود کو کپڑوں کے بوجھ سے آزاد کر رہی ہیں۔ پہلے دوپٹے سر سے اترے تو کندھے پر آئے پھر ایک سائیڈ ہونے کے بعد سرے سے غائب ہی ہو گئے۔ آستینیں غائب ہوئیں۔ گلے کی گہرائی بڑھی تو اتنی کہ مقابل آرام سے اندر کا معائنہ کرلے۔ قمیض چھوٹی اور تنگ ہو کر قابل اعتراض حد تک آ گئیں۔ پھر شلواریں پتلی ہونے کے ساتھ اونچی اور پھر پاجامے کی ایک قسم کیپری کے نام سے متعارف ہوئی جس میں پنڈلیاں کھولی جانے لگیں۔ اب اتنی کہ گھٹنوں سے کچھ ہی نیچے رہ گئی۔ جبکہ اسلام کی رو سے کھلی پنڈلیاں اگر خواتین کی نظر آئیں تو وہ کھلا زنا ہے اور اس پر پڑنے والی مردوں کی نظر خود ان کو بھی زانی بنا دیتی ہے۔ ایسے مردوں اور عورتوں کی وہی سزا ہے جو زانی کی ہے۔ اسلام تو خواتین کو پردے داری کا درس دیتا ہے۔ ستر پوشی کا حکم ایسے ہی تو نہیں دیا گیا۔ اب تو یہ حال ہے کہ خواتین نے دوپٹے اتارے تو مردوں نے انہیں پٹکے کہہ کر اپنے گلے میں ڈال لیا اور خواتین نے اپنی پنڈلیاں کھولیں تو مردوں نے اپنے پائنچے نیچے کر لیے۔ اللہ ہی عقل و شعور دے تو دے ورنہ تو بس خدا ہی حافظ ہے۔ مردوں کو پنڈلیاں کھولنے کا حکم ہے۔ ورنہ وہ سزا کے قابل ہیں۔ اگر ہم روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کریں اور ترجمے پر غور کریں تو یہ نوبت ہی نہ آئے لیکن ہماری عقلوں پر تو غفلت اور بے حیائی کا پردہ پڑ گیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری بیٹیوں اور بہنوں کو عقل سلیم دے۔ ان میں قصوروار خود مائیں بھی ہیں جو لڑکیوں کو ابتدا سے کنٹرول نہیں

کرتیں۔ کیونکہ نرم شاخیں تو مڑ جاتی ہیں مگر مضبوط شاخ موڑی جائے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ حافظ۔ اللہ ہم سب کو ہمارے ملک اور ملک کے لوگوں کے علاوہ آپ کے ادارے ارکان اور سب کے اہل خانہ کو اپنی امان دے اور ایمان میں پختگی دے آمین

عبدالحکیم ساجد...... مجن آباد۔ محترم عمران احمد! السلام علیکم سدا خوش و خرم اور سلامت تا قیامت رہو آمین۔ امید ہے مع اسٹاف سب بخیریت ہوں گے۔ اپریل 2012ء کا شمارہ اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ ہمارے ہاتھوں تک پہنچ چکا ہے۔ سرورق انتہائی پراسرار سا لگ رہا تھا جو حیرت کے نئے در وا کر رہا تھا۔ فہرست کی سجاوٹ اور ترتیب دیکھ کر خوشی ہوئی اب لگتا ہے کہ نئے افق جلد ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اپنا مقام اور بڑھا لے گا۔ دستک کرپشن اور ڈیموکریسی کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ دیکھتے ہیں آگے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ گفتگو میں نظر پڑتے ہی صدمے کا ایک جھٹکا لگا کہ ہمارے پیارے اور دلوں کے قریب رہنے والے دیرینہ ساتھی یعقوب جمیل صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اللہ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر عطا فرمائے آمین۔ سب سے پہلے فہد میاں تھے جو اپنی فطرت کے مطابق اچھا تبصرہ کر رہے تھے۔ بھائی جان اتنے دن کہاں غائب تھے آپ کا میسج بھی کبھی کبھار آتا ہے۔ اگلی نشست پر صادق آباد سے عبدالمالک کیف تھے۔ جو اپنی مفلسی کے حالات ہمارے گوش گزار کر رہے تھے۔ کیف بھائی صبر کرو یہی امتحان کی گھڑیاں ہیں۔ طاہرہ جبیں تارا نے تبصرہ اچھا کیا اور شعر پسند آیا۔ عباسی بھائی کی یاد آوری کا شکریہ۔ انجم فاروق ساحلی آپ بہت دن بعد نظر آئے بہت مصروفیات ہیں کیا؟ نظم پسند کرنے کے لیے شکریہ۔ حسن ابدال سے ریاض بٹ تھے۔ جی میں بھی ان کا فین ہوں آپ مجھے بھی مت بھولیے گا اور جلد ہی صدیقی صاحب تشریف لے آئیں۔ محترم لنگاہ صاحب پچھلی دفعہ آپ کی کہانی پر تبصرہ نہ کر سکا مگر آپ کی کہانی بہت ہی نصیحت آموز تھی۔ سید عبداللہ شاہد جی ہمیشہ کی طرح لمبا تڑنگا نامہ لے کر حاضر ہوئے۔ جی آپ سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ محمد ارشاد قریشی صاحب سلام قبول کیجیے۔ باقی سب کے تبصرے اچھے تھے۔ اس دفعہ آپا شہناز بانو کہاں رہ گئیں۔ جو نہیں حاضر ہوئے ان کے گھر میں سب کو سلام مسنون۔ شبنمی ارشاد کی "سفلی علم" اور رضوانہ کوثر کی "افسانہ دوستی" اچھی رہی۔ باقی سب دوستوں جن میں سلیم اختر کی سائرن' عائشہ خان کی اعتبار شرط اور باقی بھی سب کہانیاں اچھی تھیں۔ ناول کی بات ہی مت کریں اتنا خوب لکھا کہ جواب نہیں۔ "امید سحر" میری امیدوں پر تو پورا اترا ہے باقی کا علم نہیں۔ ویسے بھی مجھے ایسی مہم جو اور خاص طور پر آرمی سے بہت دلی لگاؤ ہے۔ دوسری طرف شامیر نقش اور پہاڑ برف گلیشیئر کیا بات ہے۔ جی کیا نظارہ ہوگا۔ افسوس کہ اس دفعہ بازی گر نہیں تھی بہت مس کیا جی اس کی جگہ امید سحر نے پوری کر دی۔ گردش ایک اچھے موڑ پر جا رہی ہے۔ نئے نئے راز کھل رہے ہیں۔ باقی سلسلوں میں اچھی طبع آزمائی کی گئی۔ ذوق آگہی کے تمام شہ پارے خوب تھے۔ اشعار کی ترتیب کا جواب نہیں۔ خوش بو سخن میں عصمت اقبال عین' میثم علی آغا اور معصوم لڑکی نمبر لے گئے۔ باقی غزلیات بھی اچھی تھیں۔ اجازت چاہتا ہوں زندگی نے اجازت دی تو پھر ملیں گے۔

عصمت اقبال...... منگلا ڈیم۔ محترم عمران بھائی' سلامت رہیں۔ السلام علیکم۔ امید ہے آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ پچھلے ماہ کچھ مصروفیات کی وجہ سے خط نہ لکھ سکی اس مرتبہ شمارہ ٹائم پر مل گیا۔ منفرد ٹائٹل خوب صورت لگ رہا تھا۔ رسالے میں اسماء الحسنیٰ کا سلسلہ ایک خوب صورت اضافہ ہے دستک میں جناب مشتاق احمد صاحب نے کرپشن آف ڈیموکریسی کو موضوع بنایا۔ ملکی حالات پر کیا لکھا جائے اس پر بات کرنا تو دل جلانے والی بات ہے ویسے بھی گفتگو کے سارے احباب اس پر کھل کر اپنا نقطہ نظر بیان کرتے رہتے ہیں۔ فریب میں اسرار احمد صاحب نے لکھا ہے کہ عورت بے پناہ خوبیوں کے باوجود انتہائی کینہ پرور ہوتی ہے۔ کم از کم جس انداز سے یہ کہانی لکھی گئی ہے اس پر یہ کلمات سوٹ نہیں کرتے دوسری بات یہ کہ سب عورتیں کینہ پرور ہوتی ہیں اور نہ سارے مرد معصوم۔ سچی کہانیوں میں سفلی علم' سائرن اور بیٹی اچھی تھیں۔ افسانوں میں اعتبار شرط ہے اچھی تھی۔ گردش اور خطروں کا کھلاڑی خوب صورت سلسلے ہیں جنہیں ہر ماہ دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ بزم سخن کا سارا انتخاب خوب صورت تھا۔ ذوق آگہی میں جس طرح ذوق کی تسکین کی جاتی ہے وہ اسی طرح ہی ہے جیسے پودوں کے لیے آکسیجن۔ خوش بوئے سخن میں تمام شاعروں کا کلام خوب صورت تھا۔ عبدالمالک کیف صاحب کے حالات پڑھ کر دکھ ہوا۔ مشکلات تو بھائی ہر انسان کی زندگی میں مختلف صورتوں میں آتی رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو مالی مشکلات سے نکالے اور روزگار کا کوئی نیک وسیلہ پیدا کر دے۔ شہناز باجی دوبارہ ہماری طرف آنا ہو تو آنے سے پہلے ضرور بتائیے گا۔ امید ہے آپ کو منگلا کے ساتھ ساتھ منگلا کے لوگ بھی اچھے لگیں گے۔ فہد بھائی آپ نے خلوص سے یاد کیا شکریہ اور ہاں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے ریاض حسین قمر صاحب غزل پسند کرنے کا شکریہ۔ بس آپ کی دعائیں چاہئیں۔ عبداللہ شاہد صاحب آپ نے عزت افزائی کی اچھا لگا۔ لیکن بھائی میں اس قابل نہیں میری تحریروں سے کوئی سبق سیکھے تو لکھتے وقت احتیاط کا دامن تھام کے رکھتی ہوں۔ کہیں میری لکھی کسی بات پر کوئی مجھے سبق نہ سکھا دے۔ آخر میں محترم جناب فقیر محمد بخش صاحب' گفتگو میں لکھنے والے اور ادارے کے تمام احباب کو سلام۔

امیر حمزہ...... مجن آباد۔ محترم جناب عمران صاحب آداب۔ امید واثق ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے طویل غیر حاضری کے بعد شامل گفتگو ہوں۔ معروف لکھاری یعقوب جمیل صاحب کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ محفل گفتگو میں صدارتی سیٹ پر فہد صاحب براجمان تھے تبصرہ اچھا تھا۔ فہد صاحب آپ کا شکوہ درست ہے کیف صاحب سے دوستوں کی خیر خبر رکھنی چاہیے۔ لنگاہ برادران کو سلام۔ اے ڈی عابد کہاں ہو بھئی اتنی بے مروتی بھی اچھی نہیں کوئی رابطہ نہیں آؤ کبھی محفل میں۔ عبدالحکیم ساجد کیسے ہو؟ تبصرہ اچھا تھا۔ مشق سخن جاری رکھو۔ تحریر میں پختگی خود بخود آ جائے گی۔ بھائی عبداللہ شاہد کیسے مزاج ہیں؟ باقی سب دوستوں کے تبصرے اپنی مثال آپ تھے۔ بزم سخن کا انتخاب لاجواب تھا۔ خوش بو سخن میں عصمت اقبال عین' میثم علی آغا' محمد اسلم جاوید' ریاض حسین قمر کی غزلیں بہترین تھیں۔ کہانیوں میں سلسلہ وار کہانی گردش اچھی جا رہی ہے آپی شہناز مبارک باد کی مستحق ہیں امید ہے یونہی سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا۔ دوسری کہانیوں میں سفلی علم' فریب قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے متاثر کیا آخر میں ادارے کی ترقی کے لیے دعا گو۔

بشیر احمد بھٹی...... بہاول پور۔ جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم! اپریل 2012ء کا نئے افق نئی تابناکیوں سے مرصع مارکیٹ کی زینت بنا۔ میرا دو چشمہ نمبر دو ہے۔ نئے افق کی کتابت خوش نما ہوگئی ہے۔ بڑی تیز رفتاری سے میں بخوبی مطالعہ کر لیتا ہوں۔ پورا شمارہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر وہی مسئلہ

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

اگلے شمارے کا شدت سے انتظار۔ سب سے پہلے مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک کرپشن آف ڈیموکریسی پڑھی۔ انتخابی عمل ملک میں آزادانہ منصفانہ انتخاب کا ہونا واقعی ناگزیر ہے۔ عوام کو خود پتا نہیں ہوتا کہ وہ جس کا انتخاب کررہے ہیں وہ کتنا سعادت مند ہے۔ کرپشن نے ملک کو کھوکھلا کردیا ہے۔ محتسب افراد حاجی ثناءاللہ کے سپوت نہیں ہوتے جو آتا ہے اس کی تجوریاں رقوم سے بدقسمتی کا شکار ہوجاتی ہیں۔ مردہ ضمیر حکمرانوں کو روز محشر کا کوئی خوف نہیں۔ کمزور حافظے کے مالک اور نیم عقل لوگوں نے ملک کی باگ دوڑ سنبھال رکھی ہے۔ کسانوں اور محنت کش طبقے کا عرق نکالا جارہا ہے۔ حکمرانوں کا نعرہ۔ سب ٹھیک ہے پر دم توڑ دیتا ہے۔ اللہ ہی ہمارے پیارے ملک پاکستان کا حامی وناصر ہے۔ حالات دن بدن دگرگوں ہوتے جارہے ہیں۔ کاغذی ٹکڑے جس کی جیب میں ہیں وہ عیش کوش کی زندگی بسر کررہا ہے۔ جس کی جیب میں قائداعظم نہیں ہے وہ پریشانیوں میں مبتلا ہے۔ الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ جو کام نہیں کرتا وہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کررہا ہے۔ جو کام کررہے ہیں۔ ان کی دووقت کی روٹی مشکل ہے۔ اس بات کا کون احتساب کرے گا۔ میانہ روی کب پیدا ہوگی۔ دستک کے بعد گفتگو میں محترم یعقوب جمیل کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہوا۔ بیت المقدس تاریخی کہانی قیصران جوزی کی الفت سلطنت عثمانیہ پر لکھی گئی لاجواب تحریر ہے۔ اسرار احمد کی فریب کا انجام پڑھ کر سمجھ نہیں آئی۔ مغربی کہانی محافظ پڑھی۔ پھر امید سحر پڑھی۔ جس کے اگلے حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ افسانہ دوستی اعتبار شرط سائرن کے بعد گردش کی قسط نمبر 8 ولولہ انگیز رہی۔ آخری فیصلہ سنگی علم بیتی بزم سخن خوش بو سخن ذوق آگہی کے بعد آخری کہانی خطروں کا کھلاڑی اچھا تاثر چھوڑ گئے۔ تبصرے میں محمد فہد مظفر گڑھ عبدالمالک کیف صادق آباد طاہرہ جبیں تارا لاہور ناظم بخاری لودھراں محمد اسلم جاوید فیصل آباد مجاہد ناز عباسی ہنجر پور انجم فاروق لاہور ریاض بٹ حسن ابدال عبدالحکیم ساجد ہمن آباد ریاض حسین قمر منگلا ڈیم لنگاہ برادری پرانا خانیوال سید عبداللہ شاہد حیدرآباد محمد ارشاد قریشی اسلام آباد منیر احمد ساغر میاں چنوں ان کے تبصرے خوب تھے۔ اسماء الحسنیٰ خوب سلسلہ ہے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم! اپریل 2012ء کا پرچہ 20 مارچ کو مل گیا۔ پرچہ وقت پر مارکیٹ میں لانے کا بہت بہت شکریہ۔ سرورق حالات وواقعات کی بالکل صحیح عکاسی کرتا نظر آرہا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ عرض کرتا چلوں کہ محترم قلم کار یعقوب جمیل کی وفات کا پڑھ کر انتہائی دکھ ہوا۔ خدا بزرگ وبرتر سے دعا گو ہوں کہ باری تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ان کی موت کی وجہ سے اردو بنگالی اور گجراتی ادب میں جو خلا بنا ہے اسے پر کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ہمارے دلوں میں ان شاءاللہ وہ سدا زندہ رہیں گے۔ ان کی تحریریں ہم بار بار پڑھیں گے اور ان کو خراج تحسین پیش کرتے رہیں گے۔

روحوں کو چھو سکیں گے بھلا کب فنا کے ہاتھ
الفت کے چمن زار سدا زندہ رہیں گے

اب بڑھتے ہیں اپنی رنگا رنگ محفل کی طرف۔ محمد فہد بھائی آپ کی باتیں بالکل صحیح ہیں میرے دونوں بچے بھی بے روزگار ہیں۔ اس ملک میں صرف سفارش اور رشوت چلتی ہے۔ میرٹ کی دھجیاں سرعام اڑائی جارہی ہے مجھے یاد کرنے کا بےحد شکریہ۔ میں آپ کے لیے دعا گو ہوں۔ عبدالمالک کیف بھائی آپ کے لیے بھی یہ بندہ ناچیز دعا ہی کرسکتا ہے۔ یہاں تو انصاف کے لیے زنجیر ہلانے والے قتل ہوجاتے ہیں۔ محمد اسلم جاوید میری کہانی ''زہر عشق'' پسند کرنے کا بےحد شکریہ۔ بشیر احمد بھٹی صاحب میرا تبصرہ اور کہانی آپ کے معیار پر پوری اتری جس کے لیے میں ممنون ہوں مجاہد ناز عباسی انجم فاروق ساحلی آپ کا بھی شکریہ کہانی کو پزیرائی دینے کا۔ ریاض حسین قمر آپ خود بھی بہت اچھے ہیں۔ ہم تو محبتیں اور خلوص بانٹنے والے ہیں۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ محمد شفاعت محمد ثقلین وغیرہ آپ کی حاضری اس بار ذرا مختصر ہے لیکن خوب ہے۔ سید عبداللہ شاہد میرا مان بڑھانے کا بہت شکریہ۔ واقعی میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ یہ تو نئے افق والوں کی عنایت ہے کہ وہ میری محنت اور کاوش کو جلا بخشتے ہیں۔ خدا آپ کو خوشیاں اور کامیابیاں عطا فرمائے آمین۔ ثم آمین۔ محمد ارشاد قریشی میری تحریر کردہ کہانی زہر عشق پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ ہمارے حکمران بالکل بےحس اور پتھر ہوچکے ہیں۔ نہ ان کے کانوں پر جوں رینگتی ہے اور نہ وہ ٹس سے مس ہوتے ہیں۔ جب الیکشن کا وقت آتا ہے تو وہ ہمارے غم کے لیے مرے جاتے ہیں اور جب جیت جاتے ہیں تو طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ منیر احمد ساغر آپ کو بھی زہر عشق اچھی لگی۔ یہ تو آپ لوگوں کا حسن نظر ہے۔ جو میرے اندر لکھنے کی جوت جلائے ہوئے ہے۔ آپ کے لیے بھی دل سے دعائیں نکلتی ہیں میں عمر کے اس حصے میں ہوں جب کوئی نہ کوئی بیماری انسان کو گھیرے رکھتی ہے پھر بھی میں نے ہمت جوان رکھی ہوئی ہے کہانیوں کی طرف بڑھنے سے پہلے ذرا بات ہوجائے باقی سلسلوں کی۔ بزم سخن میں عبدالمالک کیف ذہن مقبول جاوید احمد صدیقی فقیر محمد بخش لنگاہ رابعہ حسن کے اشعار پسند آئے باقی لوگوں کے اشعار بھی اچھے ہیں۔ ذوق آگہی میں عالیہ انعام محمد عثمان علی اور واجد علی کا انتخاب خوب صورت اور موثر ہے۔ بیت المقدس ہمیں تاریخ کے اوراق سے روشناس کروارہی ہے۔ فریب (اسرار احمد) محافظ (راحیلہ تاج) اچھی کہانیاں ہیں۔ امید سحر کے متعلق تبصرہ آئندہ۔ شہناز بہن گردش کو آپ بڑی مہارت سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ واقعات پر آپ کے قلم کی گرفت مضبوط ہے۔ ویل ڈن سچ بیانیوں میں ابھی تک تو شین علی خان کی آخری فیصلہ اور شبنمی ارشاد کی سنگی علم ہی پڑھ سکا ہوں آخری فیصلہ حقیقت کے قریب ترین ہے عرفان نے جو فیصلہ کیا وہ ایک اچھا فیصلہ تھا شبنمی بہن آپ کی کہانی سنگی علم پڑھ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے آپ کے لکھنے کا اپنا انداز ہے۔ بہت خوب۔

مجاہد ناز عباسی...... ہنجر پور۔ محترم جناب عمران احمد صاحب! السلام علیکم امید کرتا ہوں آپ بخیر وعافیت سے ہوں گے۔ اور دعا گو ہوں کہ خدا کرے آپ کے ساتھ یہ محبتوں اور چاہتوں بھرا سفر ہمیشہ چلتا رہے۔ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی شمارہ ٹائم پر ملا اور اس دفعہ ٹائٹل بہت عجیب تھا یقین مانو مجھے ذرا بھی سمجھ نہیں آئی کہ تصویر میں کیا ہے۔ بس صرف ایک گھوڑا نظر آیا وہ بھی دھندلا دھندلا سا (یا پھر شاید بھری جوانی میں میری نظر کمزور ہوگئی ہے) محترم یعقوب جمیل صاحب کی وفات پر بہت دکھ ہوا۔ یعقوب جمیل صاحب ایک عظیم ناول نگار تھے۔ محترم یعقوب جمیل خداوند کریم کی مرضی سے اس دنیا میں تو نہیں لیکن ان کی یادیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک محترم یعقوب جمیل کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور ان کے لواحقین کو صبر وتحمل کی توفیق عطا

فرمائے آمین۔ میں دعا گو ہوں کہ اس دنیا میں جتنے بھی لوگ بیمار ہیں اللہ پاک انہیں صحت یاب کرے صحت بہت پیاری چیز ہے اگر آپ کی صحت اچھی ہے تو آپ دنیا کے خوش نصیب انسان ہیں۔ دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بھلے آپ کے پاس کروڑوں روپے ہوں اور صحت نہ ہو تو ایسی دولت کسی کام کی نہیں ہے۔ اللہ پاک نے دنیا میں ہی جنت رکھی ہے۔ ہم دنیا میں رہ کر دنیا کے نظارے دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں روزانہ اللہ پاک کا لاکھ بار شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں اتنی لاتعداد نعمتوں سے نوازا۔ دل کو خوشیاں روزانہ ملتی ہیں لیکن ہمیں خوشیاں نظر نہیں آتیں۔ اس لیے ہمیں اپنی صحت کی فکر کرنی چاہیے۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے ہمیں موجودہ حکومت کی چال بازیوں کے بارے میں بتایا۔ مشتاق صاحب چاہے سپریم کورٹ کیوں نہ ہدایت دے کہ انتخابی فہرستوں کو درست کیا جائے لیکن یہ کرپٹ سیاستدان پھر بھی اپنی مکاری سے باز نہیں آئیں گے۔ ان لوگوں نے اب پہلے سے ہی کوئی نہ کوئی مشن بنالیا ہوگا کہ آئندہ انتخابات میں ہم کیسے جعلی ووٹ ڈالیں یہ منصوبہ تو پہلے سے بنالیا ہوگا۔ گفتگو میں محمد فہد کے نام صدارتی کرسی تھی ویلکم فہد بھائی عبدالمالک کیف صاحب آپ کا تبصرہ پڑھ کر تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بھائی آپ ہمت نہ ہاریں اللہ سب بہتر کرے گا۔ بھائی یہ دنیا والے بہت ظالم ہیں آج کے دور میں دکھوں سے بھری پیشانی پر کوئی ہاتھ نہیں رکھتا لوگ برسات کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن ہمارا برسات میں بدن ٹوٹتا ہے۔ یہاں کوئی ہاتھ نہیں بڑھاتا رہنمائی کے لیے پتھر سے شیشہ ضرور ٹوٹ جاتا ہے لیکن دل سے پتھر نہیں ٹوٹ سکتا۔ کیف بھائی آپ مایوس نہ ہوں ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں آپ کو بہت جلد ایک اچھی جوب مل جائے گی۔ طاہرہ جبیں تارا آپ کا آنکھوں کا مسئلہ ٹھیک ہوگیا نا۔ (دیکھو میں نے دعا کی تھی اس لیے ٹھیک ہوگئی)۔ ناظم بخاری صاحب بھائی مجھے بےحد افسوس ہوا کہ آپ کی تحریر ناگہانی آفت میگزین میں سلیکٹ ہوگئی تھی پر میگزین بند ہوگیا لیکن بھائی آپ فکر نہ کریں آپ کی کہانی نئے افق کی زینت ضرور بنے گی۔ ریاض بٹ صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے شکریہ بھائی آپ نے میری بات کا برا نہیں منایا۔ ویسے بھائی کہتے تو آپ بھی ٹھیک ہیں کہ خان صاحب فصلی بٹیروں کو اپنے ارد گرد جمع کررہا ہے لیکن بھائی ہوسکتا ہے کہ اس دفعہ وہ فصلی بٹیرے خان صاحب کے ساتھ رہ کر سدھر جائیں اور ہاں جو لوگ برسوں سے عمران خان کے ساتھ ہیں وہ تو ہمیشہ ان کے ساتھ رہیں گے اور وہ لوگ لالچی نہیں ہیں۔ انہیں سیٹوں سے کوئی دلچسپی نہیں وہ بس یہی چاہتے ہیں کہ پاکستان ایک سچا اور اسلامی ملک بن جائے اور ہم سب بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک سے ڈرون حملوں اور خودکش حملوں کا خاتمہ ہو۔ مہنگائی اور بیروزگاری کا نام ونشان مٹ جائے۔ عبدالحکیم ساجد صاحب وعلیکم السلام بھائی کیسے ہیں آپ؟ ریاض حسین قمر صاحب فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ سید عبداللہ شاہد صاحب کا تبصرہ پڑھ کر دل کو بہت راحت ملی شاہد صاحب آپ کے لکھنے کا انداز مجھے بہت پسند ہے۔ بھائی میری بہت بڑی حسرت ہے کہ میں آپ سے بات کروں لیکن میرے پاس آپ کا نمبر نہیں ہے۔ خیر اگر نصیب میں ہوا تو آپ سے ضرور بات کروں گا۔ محترم جناب محمد ارشاد قریشی صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے بھائی آپ کو اپنا وعدہ تو یاد ہے نا؟ منیر احمد ساغر محمد اسلم جاوید بشیر احمد بھٹی صاحب کو بھی محفل گفتگو میں پاکر بہت اچھا لگا۔ اسماء الحسنیٰ کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اس میں تو ہمیں بہت اچھی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ اقراء میں جناب طاہر قریشی صاحب نے ہمیں بہت ہی پیاری تعلیم سے نوازا۔ بزم سخن کا سارا انتخاب ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔ بہت شکریہ روبین احمد میرے شعر کو نئے افق کی زینت بنانے پر۔ خوش بو سخن میں محمد اسلم جاوید عصمت اقبال عین میثم علی آغا اور ریحانہ سعیدہ کی غزلیں بہت پسند آئیں۔ ذوق آگہی میں عالیہ انعام الٰہی اور سید واجد علی نے بہت اچھا لکھا۔ مستقل سلسلوں میں گردش ٹاپ پر ہے کہانیوں میں صرف ایک کہانی پڑھی۔ ''سائرن'' جو بہت اچھی تھی سلیم بھائی مبارک ہو۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... پرانا خانیوال۔ السلام علیکم! محترمی ومکرمی برادرم یعقوب جمیل صاحب وفات پاگئے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے بخشش کے لیے سورۃ فاتحہ کی دعا پیش ہے۔ اور لواحقین کے لیے صبر کرنے کی استدعا ہے۔ یہ ادبی دنیا کے لیے بہت بڑے صدمہ کی بات ہے۔ اپریل کا شمارہ اپنے مقررہ وقت پر ملا۔ مصور صاحب نے سرورق کو بہت خوب صورتی سے سجا کر پیش کیا۔ شکریہ ماڈل اور اشتہارات کے سلسلہ میں ماہنامہ نے کسی قسم کی کوئی ترقی نہ کی۔ دعا ہے کہ محنت سے کام لے کر ترقی حاصل کریں۔ لسٹ مضامین نے سابقہ ماہ کی طرح اس دفعہ بھی خوب صورتی کے رنگ کو برقرار رکھا۔ سچ بیانیوں سلسلہ وار تاریخی کہانی گفتگو اقراء بزم سخن خوش بو سخن ذوق آگہی اسماء الحسنیٰ ترجمہ شدہ اور افسانوں سمیت ہر مصنف نے اپنے اپنے رنگ و موتی کو پرو کر لائن بہ لائن سجا کر پیش کیا اور مدیر اعلیٰ ومدیر صاحبان نے خوب ٹھوک بجا کر ان سب موتیوں کو ماہنامہ نئے افق میں پیش کیا۔ ہماری دعا ہے کہ سب مصنفین اپنے اپنے لفظوں کے موتی ہر ماہ اسی طرح پرو کر پیش کرتے رہیں اور ہم سب کو ان کا انتظار ہو کیا خیال ہے برادر ذرا جواب ضرور دینا۔ دستک میں کرپشن آف ڈیموکریسی میں جعل سازی دھونس دھڑلے سے الیکشن ووٹ کا استعمال پر جو سبق آموز دستک دی ہے۔ اگر سبق سمجھ کر ایمانداری سے عمل ہو تو چاروں طرف گلاب وموتیے کی خوشبو پھیل جائے اور انصاف کا بول بالا ہو۔ آپ سب کا کیا خیال ہے۔ مبارک باد استاد اعظم۔ برادر عزیزی عمران احمد صاحب کی آواز تلاوت و ترجمہ کا سماں (یعنی مشکوٰۃ) حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیارا سا رنگ حضرت ابن عباسؓ سے روایت خیانت پر بیان نے چاروں طرف دینی وایمانی لہروں کی خوش بو بکھیر دی۔ واہ واہ سبحان اللہ۔ روحانی مسائل کے حل کی اشاعت کا اعلان خیر ہو آپ کی۔ انتظار کریں گے۔ عزیزی یعقوب جمیل صاحب کے بارے میں پہلے لکھ دیا گیا ہے جتنا بھی لکھا جائے کم ہوگا۔ محمد فہد جتوئی مظفر گڑھ نے صدارتی کرسی حاصل کی مبارک باد قبول فرمائیں۔ بہت خوب صورت انداز میں کافی وقت کے بعد حاضر ہوئے ہو برخوردار اور مراسلہ گفتگو میں خوب رنگ جمایا ہوا ہے کہ دل خوش کردیا۔ دعائے صحت کا تحفہ ارسال کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ فقیر کی دعائیں آپ کے نام ہیں۔ طاہرہ جبیں تارا صاحبہ صاحبزادی آپ کی گفتگو میں فقیر کی سچ بیانی کی پسند کا بہت شکریہ آپ بھی قابل قدر ہیں اور بہت کچھ خوب صورت انداز میں لکھ چکی ہیں اور لکھ رہی ہیں۔ دعا گو آپ کے لیے۔ ناظم بخاری صاحب آپ کے بابا جانی کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہوا ہے اللہ پاک آپ کو صبر اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کی شادی خانہ آبادی پر دعائیں اور مبارک باد۔ موبائل فون پر دوستی کرکے آپ بھول جانے کے عادی ہیں پہلے یاد رکھنا سیکھیں پھر بات ہوگی۔ فقیر کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ طاہرہ جبیں تارا آپ کا شعر بہت پسند آیا شکریہ شعر سنانے کا اور بھی لکھا کرو اشعار کی بزم میں۔ مجاہد ناز عباسی

www.Paksociety.com

صاحب خوب صورت تحریر اور انداز بیان ہے آپ کا اور میری تحریر پچھتاوا آپ کو پسند آئی بہت بہت شکریہ۔ ریاض بٹ صاحب سلام محبت عرض ہے۔ فریادی کی فریاد شعر کے انداز میں خوب رہی پسند آیا۔ بھائی ہم کیا ہماری اوقات کیا آپ بہت اچھا لکھتے ہیں لکھ رہے ہیں انتظار کرواتے ہیں شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میری تحریر پچھتاوا آپ کو پسند آئی۔ عبدالحکیم ساجد صاحب دعائیں آپ کے نام اچھی گفتگو رہی آپ کی آپ نے یاد کیا اور فقیر حاضر ہوا۔ ریاض حسین قمر صاحب سدا کامیاب رہو آپ کو فقیر کی کمی محسوس ہوئی پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ شکریہ آپ کا کہ میری تحریر پچھتاوا پسند آئی۔ باقی فقیر لنگاہ کی دعائیں آپ کے نام ہیں۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ، محمد شفاعت حسنین صابر اور محمد ثقلین صابر کی محبت قارئین کے نام محبت نامے کو شامل کیا گیا شکریہ پسند یا نہ پسند کا فیصلہ قارئین، بہن بھائی کریں گے۔ سید عبداللہ شاہد صاحب سدا خوش رہو، اچھا لکھ رہے ہو اور کامیابیاں حاصل کرو۔ میری پہلی تحریر منحوس تھی اور کافی صدمات میرے مقدر میں آتے رہے اور آ رہے ہیں، جس کی وجہ سے قسمت آزمائی نہ کی گئی اور یہ میری دوسری تحریر پچھتاوا ہے جسے آپ نے دل سے پسند کیا شکریہ اگر منظور خداوند پاک ہے تو آپ ضرور خوف خدا اور بدلے کی آگ بھی پڑھیں گے۔ دعا گو رہوں گا۔ باقی سب بہن بھائیوں عزیزوں نے بہت اچھا لکھا پسند آیا دعا سلام قبول کریں اور جو عزیز گفتگو میں حاضر ہوئے خصوصاً شہناز بانو صاحبہ، عالیہ انعام الٰہی، شمنی ارشاد صاحبہ، نازسلوش ذشے صاحبہ، عصمت اقبال عین صاحبہ، قمر جہاں صاحبہ، مقبول احمد جاوید صاحب، مجاہد خان صاحب، دلشاد حسین صاحب و دیگر کو میری طرف سے اور فیملی آف لنگاہ کی طرف سے سلام محبت اور دعائیں۔ اسماء الحسنیٰ دینی سبق بطرف ادارہ ہے، جو سید ھا دل میں اتر جاتا ہے اگلے سبق کا انتظار رہے گا۔ اقرا طاہر احمد قریشی صاحب اس ماہ کے سبق میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت ابو ہریرہؓ (مسلم و بخاری) سے روایات فرمان حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دل کو روشنی بخشی۔ اگلے سبق کا انتظار رہے گا۔ تاریخی داستان سلسلہ وار بیت المقدس تاریخ سے آشنائی کا باعث اور دل سے پڑھی جانے والی تحریر رہی۔ میری طرف سے الماس ایم اے صاحب کو مبارک باد و سلام دعا عرض ہے۔ بزم سخن میں روبین احمد صاحب و قارئین نے رنگ جمایا۔ عبدالمالک کیف مبارک باد صدارتی نمبر حاصل کرنے پر فقیر لنگاہ اینڈ فیملی ممبران کو شامل کرنے کا شکریہ۔ خوش بو سخن عمر اسرار صاحب قارئین نے رنگ محفل جمایا۔ محمد اسلم جاوید صاحب مبارک باد کے مستحق صدارتی نمبر حاصل کرنے پر فقیر لنگاہ اینڈ فیملی کو غیر حاضری ملی پھر بھی شکریہ۔ ذوق آگہی میں عفان احمد صاحب و قارئین نے رنگ جمایا۔ صدارتی کرسی نظام الدین صاحب نے حاصل کی۔ مبارک باد فقیر لنگاہ گروپ آف نئے افق فیملی کو غیر حاضری کا تحفہ پھر بھی شکریہ۔ تراش خراش کم تھے مگر دل کو خوش کر دینے والے پڑھنے کو ملے شکریہ عمران صاحب۔ عزیزی عمران احمد صاحب جو مافیا' انعامی بانڈ پرچی مافیا' کرکٹ مافیا' جو کہ ہر طرف پھیل چکی ہیں اسی طرح ان میں شامل ہے جعلی پیر مافیا۔ اخبار ہوئی دی ہوا ان عاملوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھنے کو مل رہا ہے۔ جس سے کئی گھرانے نقصان اٹھا چکے ہیں۔ اموات بھی ہو چکی ہیں۔ مگر پھر بھی یہ پھل پھول رہے ہیں۔ ان پر کوئی بھی گرفت نہیں پا سکا۔ اسی تناظر میں محترمہ شمنی ارشاد صاحبہ نے سفلی علم کے عنوان سے سچ بیانی لکھی اور مطالعہ کروائی سبق آموز تحریر ہے۔ بلکہ دل سے پڑھی جانے والی تحریر ہے۔ پر مصنفہ مبارک باد قبول کریں۔ پیاری بہن شہناز بانو صاحبہ کی سلسلہ وار گردش قسط نمبر 8 سطر بہ سطر ایکشن حالات کی سنگینی سیاسی انداز تیزی و میلان کی برقراری محبت و نفرت کے رنگ اگلی قسط کا انتظار دعائے صحت و تندرستی اور مبارک باد آگے سے آگے بڑھنے پر محترمہ۔ ناول مگر انتظار کی ڈور میں بندھا ہوا بلکہ قاری کو باندھ دینے والا۔ امید پر دنیا اور دنیا کے سب کام چل رہے ہیں۔ یعقوب بھٹی صاحب کا خوب صورت رنگ امید سحر عشق اور فرض پر محو سفر دیوانوں کی داستان جو کسی بھی رنگ میں ہارنا نہیں جانتے انتظار ہو گا بھٹی صاحب عمران صاحب مبارک باد قبول کریں۔ بازی گر کی اس ماہ غیر حاضری دل سے محسوس کی گئی آئندہ اسے اشاعت میں ضرور شامل ہونا چاہیے باقی مصنف کے لیے دعائیں اور سلام محبت۔ والسلام

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی پھولوں کی طرح ہمیشہ مسکراتے رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا مطلوب ہوں۔ چند دن ہوئے شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں بک اسٹال پر اپنے محبوب پرچے نئے افق سے ملاقات ہو گئی اور میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ ایسا خوب صورت پرچہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کریں۔ ماہ اپریل کا سرورق بہت ہی خوب صورت تھا یہ ایک معیاری پرچہ ہے آپ کی انتھک محنت پرچے کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ اس بار پرچہ کافی لیٹ ہو گیا تھا آخر بات کیا تھی۔ خطوط دیکھ کر کے پرچے کی کامیابی کا یقین ہو جاتا ہے۔ خط اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں آپ ہزاروں میل دور ہونے کے باعث میرے دل کی دھڑکنوں میں بسے رہتے ہیں۔ تبصرہ کرنا بھی ایک بہت مشکل فن ہے۔ پرچے کا ہر عنوان اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں۔ مثلاً اقرا' دستک' گفتگو' بزم سخن' خوش بو سخن' ذوق آگہی' اسماء الحسنیٰ وغیرہ اس بار ہر کہانی خوب سے خوب تھی۔ سلسلہ وار اور غیر ملکی کہانیاں' ناقابل فراموش واقعات بہیٰ' محافظ فریب سے میں بے حد متاثر ہوا۔ میری طرف سے تمام قلم کاروں اور قارئین کی خدمت میں آداب عرض ہو۔ مہنگائی کے دور میں ایسا دلفریب پرچہ نکالنا آپ ہی کا کام ہے۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں بشرطاً آپ کا تعاون ساتھ رہے کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں آج کے اس شدید معاشی بحران کی وجہ سے ہر انسان پریشانی کا شکار ہے۔ مہنگائی آہستہ آہستہ بدل کیا ہے مگر حالات نہیں بدلے میں خدا سے دعا گو ہوں کہ وہ ہر انسان کی مشکل آسان فرمائے۔ تحریر سے قبل ذہن میں بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ جو ذہن سے نکل جاتی ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں آپ کے گلشن میں سدا رنگ برنگے پھول کھلتے رہیں ہمیشہ آپ کی زندگی میں خوشیوں کا راج رہے اور کوئی قابل ذکر بات نہیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہو گی اسی کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ اللہ حافظ

محمد ارشاد قریشی.... اسلام آباد۔ بھائی عمران احمد قریشی صاحب السلام علیکم! سب سے پہلے تو محترم یعقوب جمیل صاحب کے انتقال پر بہت دکھ ہوا۔ ہم سب ایک بہترین لکھاری سے محروم ہو گئے۔ دعا گو ہوں رب کریم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ اسماء الحسنیٰ اور اقرا دو ایسے سلسلے ہیں جن کو پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ میرے پروردگار کے ناموں کی کیا شان ہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب کو وہ الفاظ اور طریقہ عطا کر دے جسے ادا کر کے ہم مانگیں اور وہ عطا کر دے آمین۔ محافظ راحیلہ تاج۔ افسانہ دوستی رضوانہ کوثر۔ اعتبار شرط عائشہ خان۔ سائرن محمد سلیم اختر۔ آخری فیصلہ نوشین علی خان۔ سفلی علم

شمنی ارشاد۔ گردش شہناز بانو۔ بنی فاخرہ سلطانہ بہت اچھی رہیں۔ باقی کہانیاں بھی خوب ہیں۔ محمد فہد جتوئی بھائی آپ کا شکوہ بجا ہے مگر میں خود بہت پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اللہ پاک نے بہت کرم کیا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مجھے نئی زندگی دی۔ ان شاء اللہ اب آپ سے رابطہ رہے گا۔ ایسی باتیں نہیں کرتے اللہ آپ کو زندگی دے۔ عبدالمالک کیف' مجاہد ناز عباسی اور احمد علی کو تو میرے SMS مل رہے ہوں گے۔ ان شاء اللہ سب دوستوں سے فون پر بھی رابطہ کروں گا۔ بہت احسان مند ہوں جناب فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب کا جنہوں نے میرے لیے دعاؤں کے ڈھیر لگا دیے۔ ان شاء اللہ خانیوال جا کر شکریہ ادا کروں گا۔ واہ چاند سیدآ کاش بخاری' ابن مقبول جاوید احمد صدیقی بھائی آپ سب محفل میں واپس آ ؤ۔ سیدآ کاش بخاری بھائی کچھ اپنی آمد کے بارے میں ہی لکھ دو۔ نازسلوش ذشے شہناز بانو' شمنی ارشاد تینوں بہنوں کو بہت بہت سلام قبول ہو۔ سید عبداللہ شاہد' مجاہد ناز عباسی' محمد فہد جتوئی' عبدالمالک کیف' ریاض حسین قمر' ناظم بخاری کو بھی سلام قبول ہو۔ عصمت اقبال عین' ریحانہ سعیدہ' عالیہ انعام الٰہی' قمر جہاں' ریاض حسین قمر' عبدالرحمان ساغر کی غزلیں پسند آئیں۔ بہن شہناز بانو کی تجویز کی دوبارہ حمایت کرتا ہوں۔ اس دعا کے ساتھ اپنے خط کو ختم کرتا ہوں کہ اے مالک یہ جو تو نے پاکستان عطا کیا اس میں امن بھی عطا فرما ہم اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ مالک تو ہمیں معاف فرما دے اس ارض پاک کے دشمنوں کو ہدایت دے آمین

عالیہ انعام الٰہی..... کراچی۔ محترم عمران بھائی! السلام علیکم۔ اللہ تعالیٰ سے امید قوی ہے کہ وہ ہمت اور عزت کی فراوانی سے نوازے گا اور خوب سے خوب تر کی جانب راغب رکھے گا۔ نئے افق میں ہر دفعہ کچھ نیا ہوتے ہوئے دیکھنا ہمارے لیے باعث طمانیت ثابت ہوتا ہے۔ سرورق کے حوالے سے جو آپ نے نئی روش اختیار کی ہے وہ لاجواب ہے۔ اس ماہ کا سرورق یہ خیال اجاگر کرتا ہوا محسوس ہوا کہ جیسے بدی کے عفریت کا بلند ہوتا ہوا وجود ایک سفید گھڑ سوار جو خیر کی علامت تصور کیا جا سکتا ہے آپس میں برسر پیکار ہیں۔ انتہائی دیدہ زیب رنگوں کے استعمال سے مزین یہ ٹائٹل ذہنوں میں ہلچل سی مچا گیا۔ مشتاق انکل کی دستک ہمیشہ کی طرح پر مغز رہی۔ اقتدار کے بدمست ٹولوں نے انتخابات کے مقدس عمل کو اپنی ہوس' غرور اور زعم کے ہتھکنڈوں سے بے حال کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر ایک وحیدہ شاہ کا کردار منظر عام پر آ کر اپنے مذکورہ اعمال کی سزا پا سکا ہے تو یہ ہماری دم توڑتی ہوئی امیدوں کے لیے آب حیات ہے۔ کہ یوں لگتا ہے کہ عدلیہ کا کردار فعال ہونے لگا ہے اگر اب بھی ایسا نہ ہوتا تو ہمارے معاشرے سے سچائی' انصاف اور خودداری جیسے خوب صورت رویے اپنی موت آپ مر چکے ہوتے۔ بلکہ ہمارے مردہ ہوتے معاشرے میں باقی رہی سہی سانسیں بھی گھٹ جاتیں۔ گفتگو کی محفل میں ایک انتہائی غمگین کر دینے والی خبر موجود تھی۔ ہمارے پیارے محترم یعقوب جمیل ہمیں اداس راہ داری میں چھوڑ کر ہم سے دور چلے گئے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ بہت سے لوگوں کو بنا دیکھے بنا جانے آپ اگر کسی حوالے سے اپنی زندگی کا حصہ بنا لیتے ہیں تو پھر ان کی جدائی زیادہ دکھ اور الم کا باعث بنتی ہے۔ یعقوب جمیل سے ہمارا قلم کے ذریعے ایک ایسا ان دیکھا تعلق اور رابطہ تھا کہ جسے عام لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اب رابطے کی یہ ڈور ٹوٹی ہے تو اسے رضائے الٰہی جان کر خود کو صبر کی تلقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ مگر ہم کافی دیر خود کو ایک انجان سے خلا میں بھٹکتا ہوا محسوس کر رہے ہیں۔ جہاں ہماری تسلی کا سامان ہمیشہ زندہ رہنے والی ان کی تحریریں اور کاوشیں ہیں گی۔ اللہ انہیں اپنی رحمت کے سائے میں رکھے آمین۔ محفل میں حاضر محبتوں کی خوش بو بکھیرتے ہر ساتھی کی باتوں نے کافی لطف اندوز کیا ناظم بھائی کی آمد اور ایک اچھی اور بری خبر سے آگاہ کیا۔ ناظم بھائی اللہ آپ کے والد کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ جانے والے بس ہمارے لیے سوائے صبر کرنے کے اور کچھ باقی چھوڑ کر نہیں جاتے اور جب سب سے پیارے رشتے جدا ہوتے ہیں تو صبر بھی بڑی مشکل سے آتا ہے۔ اللہ آپ کی مشکل آسان فرمائے بھائی کی آمد کی مبارک باد قبول کریں۔ اللہ نے یقیناً اس ایک لڑکی کی صورت میں آپ کے مستقبل کی خوب صورتی کی راہ نکالی ہے۔ اسے کسی بھی غلط فہمی کے حوالے نہ ہونے دیجیے گا۔ نعمت کسی نصیب والے کو ہی ملتی ہے۔ بخش انکل کی دعائیں سرمایہ بن کر ساتھ رہتی ہیں۔ شاہد بھائی کی تسلی ہو گئی دل کو اطمینان حاصل ہوا بھائی کے قلم کی روانی بڑی بھلی اور خوب صورت رہی۔ طاہرہ چندا میری باتوں پر ناراض نہ ہوا کرو۔ غور سے پڑھو گی تو جان جاؤ گی کہ میں تمہاری برائی نہیں کرتی بس تم سے کچھ زیادہ اچھے کی توقع رکھتی ہوں۔ ویسے افسانے مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ اسماء الحسنیٰ کا سلسلہ اتنا شاندار اور بابرکت ہے کہ جو ہم جیسوں کے لیے متبرک تحفہ ثابت ہو رہا ہے۔ دین کی سمجھ دینا اور لینا دونوں ہی باعث اجر و ثواب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں کے حوالے سے ہمارے لیے علم کا یہ خزانہ بہت خوب صورت معلوم دے رہا ہے۔ اقرا تو ویسے ہی دلوں کو منور کرنے اور راہ ہدایت دکھانے کا وسیلہ بنا ہوا ہے۔ فریب اسرار احمد کی انتقام در انتقام کے سلسلے کی کہانی تھی۔ معمولی باتوں پر دلوں میں بغض پیدا کر کے ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی انسانی جبلت ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ محافظ انتہائی شاندار کہانی تھی۔ گناہوں سے توبہ کر کے ایک پاکیزہ زندگی گزارنا مشکل سہی مگر ناممکن ہرگز بھی نہیں۔ ایک بچے کو گود میں اٹھا کر ڈاکہ ڈالنے کے لیے جانے کی منظر کشی انتہائی متاثر کن رہی یہ تحریر بے حد شگفتہ اور حسین تھی۔ امید سحر یعقوب بھٹی کا ناول جو اپنے اندر رومانس کا بہتا ہوا جھرنا لیے ہوئے تھا۔ ساتھ ہی چٹانوں جیسے مضبوط عزائم کی روداد بھی تھی وطن کے لیے دل جیسے نازک آبگینے میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا حب الوطنی کا جوش و جذبہ دنیا کی ہر رعنائی سے بڑھ کر حسین معلوم ہوتا ہے۔ محبت کے جذبے کو دل کے کسی گوشے میں احتیاط سے سینت کر رکھنا اور کسک کی آنچ پر اس کی دھیرے دھیرے آبیاری کرنے والوں پر تو دل ویسے ہی آفرین بھیجتا رہتا ہے۔ بات تو ابھی شروع ہے باقی آئندہ چل کر پتا چلے گا کہ عشق مجازی اور وطن کی محبت سرشاری کے جذبوں پر مبنی یہ کہانی ہمیں اور کیا کیا رنگ دکھائے گی۔ افسانہ دوستی اور اعتبار شرط دونوں اچھے افسانے تھے جن میں دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ ورنہ افسانے مجھے کچھ متاثر نہیں کرتے مگر بات اگر دلچسپی اور ہلکے پھلکے انداز میں کہی جائے تو اچھی لگتی ہے۔ مگر ایک لڑکی چاہے کتنی ہی ٹام بوائے کیوں نہ بن جائے آخر لڑکا کیسے لگنے لگتی ہے مگر پھر سوچا یہ تو افسانہ تھا جہاں فسانہ بنانا جائز ہوتا ہے۔ سائرن ایک بہترین سچی کہانی ثابت ہوئی۔ بھٹکے ہوئے شخص میں واقعی کبھی نہ کبھی سائرن ضرور بجتا ہے کہ وہ راستی کی جانب لوٹ آئے۔ جیسے اسکول میں ہاف ٹائم میں گھنٹی بجتی ہے اور شرارت سے کھیلتے کودتے بچے دوڑ کر نظم و ضبط کے ساتھ کلاس میں بیٹھ کر پڑھائی شروع کر دیتے ہیں۔ اللہ ہر کسی کو راہ ہدایت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ آخری فیصلہ میں پسند کرنے کو کچھ بھی نہ تھا ایک انتہائی بے ہودہ طرز فکر ایک جاہلانہ طرز زندگی جو اکثر ہمیں صورتیں بدل بدل کر اسی معاشرے میں رقصاں دکھائی

دیتی ہے۔ موضوع تو بیا چھا تھا مگر پڑھتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگا۔ سفلی علم شبنی کی معروف چابک دستی کا آئینہ تھی۔ مہارت اور اثر انگیزی بے شک ان کے قلم کا وتیرہ ہے۔ موضوع بھی چن کر ایسا لاتی ہیں کہ لگتا ہے کہ سچ سے بھی زیادہ کچھ سچ ہے اور اس دفعہ کا موضوع تو ہمیں کچھ اپنا ہی لگا۔ حاسدوں کے ہاتھوں گندے علوم کی بدولت بڑے نقصان اٹھائے ہیں۔ اور وہ حاسد بھی ایسے جو اپنوں سے بڑھ کر اپنے رہے ہیں۔ بٹی ایک بجھ میں نہ آنے والے تشدد کا حصہ تھی۔ جس نے ہولا کر رکھ دیا نہ تو تشدد کی وجہ کچھ سمجھ آئی نہ انجام کا کچھ پتا چلا بس مار پیٹ پڑھنے کو ملی آخر کون سی بھڑاس نکالنے کا تہیہ کر کے قلم اٹھایا تھا ہم کو پریشان کر کے رکھ دیا۔ نئے افق بڑا مہارت کا نمونہ بنتا جا رہا ہے ہر کسی کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ لینے والا۔ اللہ اور ترقی عطا فرمائے آمین۔ دعاؤں میں یاد رکھیں اجازت دیں۔ خدا حافظ

ریاض حسین قمر..... جہلم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب سلام مسنون! امید ہے کہ آپ مع اپنے عملہ کے خیریت سے ہوں گے۔ اپریل کا نئے افق میرے سامنے ہے۔ اس بار بھی ٹائٹل کی انفرادیت آپ نے بحال رکھی شکریہ قبول فرمایئے۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے اس دفعہ ایک ایسے مسئلہ پر بحث فرمائی ہے جو ہماری قومی زندگی کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ کاش ارباب اختیار اس کی نزاکت کو سمجھیں۔ گفتگو کے آغاز میں ایک حدیث پاک بیان کرنے کا سلسلہ بہت پیارا ہے۔ ساتھ ہی جناب یعقوب جمیل صاحب کی وفات حسرت آیات کا پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔ خدائے لم یزل انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔ اس بار مظفر گڑھ کے محمد فہد صاحب کرسی صدارت پر متمکن ہوئے۔ انہوں نے نئے افق فیملی کے چیدہ چیدہ ممبروں کو پرخلوص ڈھیروں دعائیں عطا فرمائیں۔ رب العزت ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرمائے آمین۔ عبدالمالک کیف صاحب اللہ کریم آپ کی پریشانیوں کو دور فرمائے اور آپ کو حلال ذریعہ معاش عطا فرمائے آمین۔ محترمہ طاہرہ جبیں تارا صاحبہ کا تبصرہ پسند آیا۔ ناظم بخاری صاحب آپ محفل میں تشریف لائے جی آیاں نوں آپ نے دوبارہ لکھنا پڑھنا شروع کر دیا۔ خداوند کریم آپ کو اپنے ارادوں پر استقامت بخشے آمین۔ بشیر احمد بھٹی صاحب آپ نے میرا تبصرہ پسند فرمایا شکریہ مجاہد ناز عباسی صاحب میں آپ جیسے مخلص دوستوں کی دعاؤں سے بالکل خیریت سے ہوں میرا کلام پسند فرمانے پر شکریہ قبول فرمایئے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب محفل میں تشریف لائے خوش آمدید۔ ریاض بٹ صاحب آپ نے پرچے پر میرے تبصرے کو پسند فرمایا شکر گزار ہوں۔ اس بار آپ کا تبصرہ بھی بھرپور ہے۔ عبدالحکیم ساجد بھائی خیر مبارک یہ سب آپ لوگوں کی اپنائیت ہے۔ جس نے ہم سب کو پرخلوص رشتوں کی حسین رسی سے باندھ رکھا ہے۔ غزل پسند فرمانے کا شکریہ۔ فقیر محمد بخش صابر لنگاہ اینڈ فیملی آپ نے مجھے کرسی صدارت پر دلی مبارک دی میں اس بات پر کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ یقیناً محترم محمد بخش صابر لنگاہ صاحب میرے لیے بہت احترام کے قابل ہیں وہ ہمارے بزرگ ہیں اور بزرگوں کی قدر کرنے والے لوگ کبھی خسارے میں نہیں رہتے۔ خدا آپ سب کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے آمین۔ محمد ارشاد قریشی صاحب آپ نے میرے بیٹے کی شادی اور بہو کی آمد پر جس خلوص سے مبارک باد دی ہے اس کے شکریے کے لیے میرے پاس مناسب الفاظ نہیں اتنی بڑی اپنائیت کا شکریہ۔ خدا آپ کو شفائے کلی عطا فرمائے آمین۔ محترم عبداللہ شاہد کا تبصرہ حسب سابق بڑا جاندار تھا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ شاہد بھائی آپ نے میرے اور میری فیملی کے لیے نیک جذبات کا اظہار فرمایا اور پرخلوص دعاؤں سے نوازا وہ میرے لیے باعث فخر اور سرمایہ افتخار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی فیملی کو سدا خوش و خرم رکھے اور آپ پر اپنی عنایات کی بارش فرمائے آمین۔ منیر احمد ساغر اور محمد اسلم جاوید صاحب کے تبصرے پسند آئے۔ اس بار بھی کئی ساتھی محفل سے غائب تھے۔ جن میں محترمہ شہناز بانو صاحبہ سرفہرست تھیں۔ پلیز تشریف لاتی رہا کریں گردش کے حوالے سے ہمیں آپ کی کمی کا اتنا احساس نہیں ہوتا۔ مگر ہوتا ضرور ہے۔ نئے سلسلے اسماء الحسنیٰ میں پروردگار عالم کے صفاتی نام اللہ کے فیوض و برکات کے بارے میں مفصل معلومات ملیں۔ اقرا میں محترم طاہر قریشی صاحب نے غرور و تکبر کے نقصانات کے بارے میں مختلف احادیث کی روشنی میں اجاگر کیا ہے۔ اس شمارے کا سب موبولنظم و نثر انتخاب کا بہترین نمونہ ہے۔ ابھی یہ خط مکمل کیا ہی تھا کہ ایک دھماکہ ہوا ایک بار پھر پیٹرول بم گرا دیا گیا تھا۔ پیٹرولیم مصنوعات میں ہوشربا اضافہ کر کے مہنگائی کے ایک بہت بڑے سیلاب کا راستہ صاف کر دیا گیا۔ موجودہ بے حس ٹولہ غربت مکاؤ کے بجائے غریب مکاؤ کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ان کی بے حسی صرف عوام کے لیے ہے اپنی ذات کے لیے سب ہی بڑے حساس ہیں۔ ان کی شان میں ایک لفظ تو کہہ کر دیکھیں یہ لوگ زبان کاٹنے کو دوڑیں گے۔ کیا ہمارے آباؤ اجداد نے حصول پاکستان کے لیے اس لیے قربانیاں دی تھیں اس لیے اپنی جوان معصوم بچیوں کی عصمتوں کو داؤ پر لگایا تھا اس لیے اپنے شیر خوار بچوں کو صلیب کر پان پر چڑھایا تھا کہ اس وطن عزیز پر ایک ٹولہ قابض ہو کر ہمیں بھوک سے مرنے پر مجبور کر دے گا۔ ہم سے زندگی کی ساری خوشیاں چھین لے گا۔ جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا اور گنا بھی اپنی جگہ ایک لعنت ہے۔ مثلاً ایک حلقہ میں دو ووٹروں کی تعداد سو ہے اور وہاں تین امیدوار کھڑے ہیں دو امیدواروں کو تینتیس تینتیس ووٹ ملتے ہیں۔ اور ایک کو چونتیس ووٹ ملتے ہیں تو وہ جیت جائے گا۔ اب عملاً اس شخص کو چھیاسٹھ ووٹروں نے رد کیا اور چونتیس نے منتخب کیا۔ اب وہ شخص جس کو چھیاسٹھ ووٹروں نے مسترد کیا وہ حکومت کرے گا۔ اگر اس کا نام جمہوریت ہے تو اس جمہوریت پر کروڑ بار لعنت۔ خدا ہمیں عقل اور فہم عطا فرمائے آمین

سید عبداللہ شاہد..... حیدرآباد۔ عمران احمد قریشی صاحب السلام علیکم و رحمۃ! میں خدائے مطلق سے امید کرتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور اپنی تمام جہتوں ہمتوں اور ریاضتوں سے میرے نئے افق کی خوش منظری زرخیزی اور ترقی و خوشحالی کے لیے سرگرم عمل ہوں گے۔ علاوہ ازیں اسٹاف میں شامل دوست احباب برادر عفان احمد محترم طاہر قریشی دیرینہ دوست اقبال بھٹی صاحب محترمہ دبین احمد صاحبہ جناب اسرار احمد اور دیگر رفقا کی خدمت میں سلام اور نیک جذبات پیش کرتا ہوں اور ایمان و یقین کی سلامتی کی دعا کرتا ہوں۔ اس بار پرچہ بخیر سے اور بلواسطہ ہاتھ میں آیا۔ قدرے افسردگی کا احساس ہوا۔ عمران بھائی! میں عاجزانہ استفسار کر رہا ہوں کہ پاکستان میں گزشتہ چونسٹھ برسوں میں ہم نے جو اس کی وحدتوں پر بہیمانہ اور سفاکانہ شب خون کا تسلسل برقرار رکھا اس کی اذیتوں کا شعور کیوں نہیں ہوتا؟ اللہ عزوجل ہماری جان اور اولادوں پر رحم کرے۔ معصیت کے جنون میں زر کاروبار کی مجبوریوں میں اور حکومتی ایوانوں میں اپنی خدمت گاریوں کو نبھانے کی غرض سے ہم عدل و انصاف کی آس کو بھی حرف بے جا کہہ کر مٹا ڈالتے ہیں۔ میں اس خیال سے ڈرتا ہوں کہ پاکستان کی حقیقت کو

ذلیل و رسوا [illegible] پاکستان کے حقوق پر اور اس کے وسائل پر [illegible] ہیں۔ بہرحال اپریل کا تازہ شمارہ حسب عادت وقفے وقفے سے مطالعہ کیا۔ سرورق [illegible] کیا تھا۔ اس بار عالی مرتبت بابا مشتاق احمد قریشی کی دستک "کرپشن آف ڈیموکریسی" پڑھ کر خوشی و تشویش [illegible] معاشروں میں انتخابی عمل کا شفاف ہونا ناگزیر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ملک میں [illegible] کیوں ختم نہیں ہو پا رہا؟ خدائے پاک ہمیں ہدایت عطا فرمائے آمین۔ اسماء الحسنیٰ میں [illegible] پڑھ کر دل میں خوف اور خشیت کا احساس ہوا۔ اور اپنے مسلمان ہونے پر فخر محسوس ہوا کہ میرا معبود لاشریک ہے [illegible] رب کے لیے جچتا ہے۔ اقرا کے صفحات میں محترم طاہر قریشی صاحب نے تین احادیث بیان فرمائیں جو ایمان و یقین کو [illegible] کہانیاں پڑھیں۔ اس بار محض دو تراجم تھے جس سے تشنہ کامی کا احساس باقی رہا۔ اور جناب عزیز حلقہ دل اقبال بھٹی [illegible] ہو گئے تھے اور چھٹی کر گئے تھے۔ بھٹی صاحب یہ دیا اچھا نہیں ہے۔ غرض اس مرتبہ راحیلہ تاج کے محافظ کے ساتھ [illegible] رہ گردانتا لیکن جناب مصنف کے جولانی قلم کو کون روک پایا ہے۔ راحیلہ تاج کی محافظ جرم و سزا پر ذوق و شوق کو بڑھاوا دیتی ایک خاص طرز فکر کی حامل اسٹوری تھی۔ جرائم کی دنیا سے تائب ہونے والا ڈیمن کا اپنے شیطان سے مکالمہ بہت خوب تھا۔ اس بار بھی رنگا رنگ کہانیوں میں عمران بھائی انہیلی چال چلتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ ناول تو ہمیں مرغوب ہوتا ہے اس لیے امید سحر دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ یعقوب بھٹی کا بارہواں کھلاڑی ایک ناقابل فراموش تحریر تھی۔ انہوں نے امید سحر لکھ کر پرمسرت جذبوں سے لبریز کر دیا ہے۔ باقی خواتین کے دو افسانے دیکھ کر ہونق زدہ رہ گیا۔ جناب من ایک خاتون کا ایک افسانہ کافی ہوتا ہے آپ اچھی آزمائش لیتے ہیں عمران بھائی۔ رضوانہ کوثر کا افسانہ دوستی اپنے واضح اور ستھرے پلاٹ کی وجہ سے پہلے نمبر کا حق دار تھا۔ اعتبار شرط (عائشہ خان) میں ثرالے کی سرد مہری فضول محسوس ہوتی رہی۔ اس مرتبہ بازی گر (حسام بٹ) کو آپ نے ریسٹ دے دیا۔ سرخم تسلیم بھائی۔ یکجا کہانیوں میں چار کہانیاں شامل اشاعت دکھائی دیں۔ سائرن (محمد سلیم اختر) عرصے بعد اچھی تحریر لائے۔ موضوع اگرچہ خلاف موسم یعنی ماہ رمضان کے گرد گھومتا تھا تاہم اصلاح احوال مقصود ہو تو ایسا کرنا برمحل ہی سمجھنا چاہیے۔ آخری فیصلہ (نوشین علی خان) اور بنی (فاخرہ سلطانہ) دونوں کہانیاں مختلف مزاج کی حامل تحریریں تھیں۔ پڑھ کر مزا آیا آخر میں خلاف توقع شبنی ارشاد کی ایک زبردست اسٹوری سفلی علم پڑھ کر گلے شکوے دور ہو گئے۔ شبنی جی پچھلی دفعہ تمہاری کہانی کی تلاش و جستجو میں تشنہ کام رہ گیا تھا کہ نئے افق کے مطالعے کے باوجود کمی کا احساس بے کل کرتا رہا کیا کہوں کیا لکھوں تمہاری تحریر کے عمدہ اسلوب، سلاست اور روانی یوں دل میں گھر کر جاتی ہے کہ پڑھتا چلا جاتا ہوں۔ رکنے کے باوجود نہیں رک پاتا۔ میں غائبانہ تمہاری کہانیوں کی ہمہ جہتی اور قلم کی گھما گھمی کا معترف ہوں۔ اس بار آپ نے احادیث کے تناظر میں شیریں بی بی کے حسد و جلاپے کو جس کمال خوبی سے کہانی کے روپ میں ڈھال کر پیش کیا ہے اس کو پڑھ کر دل اش اش کر اٹھا۔ سفلی علم جیسے مشکل موضوع پر طبع آزمائی کرنا آسان کام نہیں ہے۔ بنگالی عامل بابا کو تم نے کامیابی سے اور بہت مناسب لفظوں سے کری ایٹ کیا اور خاص باریکی اور تمام جزئیات کے ساتھ یوں لکھا کہ کہانی کا مزا دوبالا ہو گیا۔ اس احمق عورت نے بنی کی چاہت میں دو خاندانوں کے سکھ چین کو برباد کر دیا اور دوسروں کے لیے نشان عبرت بن گئی۔ بائی دے وے شبنی! اس کہانی کو لکھنے سے پہلے کیا تم نے سفلی علم کے بارے میں باہر جا کر باقاعدہ تجسس و تفتیش کی تھی؟ جواب ضرور دینا بھئی! بجیا شہناز بانو اس مرتبہ گردش کی تازہ قسط میں سرمئی کی کہانی سے ماہین کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ لیکن کچھ مختلف ہوگا تو دلچسپی اور تجسس میں اضافہ ہوگا اور پڑھنے میں بھی مزا آئے گا کیا خیال ہے بجیا؟ خطروں کا کھلاڑی میں اے حمید صاحب درندہ صفت ہندو دیومالا بھارت ماتا کے ہم اور کتھک رقص کی بھیانک پرتوں کو کھول رہے ہیں کہ ہندوستانی ناچ گانوں پر جان دینے والوں کی آنکھیں کھل جانا چاہیے۔ اب مختصر طور پر گفتگو کے دوست و احباب سے ہیلو ہائے ہو جائے۔ اس مرتبہ قدرے رونق نظر آ رہی ہے۔ لیکن بعض اہم شرکائے محفل کی عدم موجودگی کے باعث موڈ خراب ہو رہا ہے۔ محترمہ عالیہ انعام الٰہی دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔ ریحانہ سعیدہ اور ناز سلوش نے بھی اس دفعہ چھٹیاں منائیں۔ کامران شاہ کاکی پھر سے دعا دے گئے ہیں۔ تلون مزاجی کی حد ہو گئی دوستو! بہرغرض خطوط کا مطالعہ کیا۔ تمہید کے دوران محترم یعقوب جمیل کی رحلت کا پڑھ کر خاصا دکھ محسوس ہوا۔ خدائے مطلق مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اور لواحقین کو صبر و استقامت دے آمین۔ فہد میاں کو مسند اول پر مبارک باد قبول ہو۔ تمہارا شکوہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق ہے۔ میری متواتر حاضری کی گواہی گفتگو کے ساتھی خود دیں گے۔ عبدالمالک کیف کے روزگار کے لیے دعا کرتا ہوں طاہرہ جبین تارا نے لوبی فساد کا بیج بونے میں پہل کر دی ہے۔ اس چیلنج کو عالیہ جی کس طرح ٹریٹ کرتی ہے۔ سوالیہ نشان قلم زد کرتا ہوں اور درست فیصلہ کیا اور عالمی ادبی جنون میں ذلیل و خوار ہونے سے بچ گئے۔ اب روزگار سے اپنے وجود کی قدر و منزلت کا احساس بہت قیمتی ہوتا ہے میرے دوست اب گھر گرہستی شاد و آباد رہو آمین۔ محمد اسلم جاوید کے چند جملے افسردگی بڑھا رہے ہیں۔ ارے یار ہمت مرداں مدد خدا رہی ہے۔ کیوں بھئی انجم فاروق ساحلی تمہاری تاریخ سے متاثر ہوا ہوں۔ اس لیے تم پر محو فراش ہے۔ احسن مند رہوں گا تمہارا۔ اس کا جواب پا کے۔ ریاض بٹ، عبدالحکیم ساجد، ناظم بخاری محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ یقین جانیے بہت خوش ہوئی۔ تم نے بروقت اچھا ہو گیا ہے۔ بیگم کی پرخلوص قربت سے بگڑتی صحت اچھی ہو گئی ہے۔ ان کی نازبرداریوں کی خوشیوں کے درمیان زیادہ اچھے انداز میں لکھو گے۔ میری دعا ہے کہ تم پھولو پھلو اور بشیر احمد بھٹی نے اس تبصرے کو پسند کیا شکریہ۔ مجاہد ناز عباسی میاں تمہاری غزل دکھائی نہیں دی۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب محمد ارشاد قریشی یاد رکھنے کا شکریہ۔ دعا گو

الاسماء الحسنیٰ

حسام بٹ

یوں تو اللہ تبارک تعالیٰ کے اَن گنت صفاتی نام ہیں جن میں سے بیش تر کا علم صرف اسی عَلِیْمُ الْخَبِیْر کو ہے۔ میں کوئی عالم فاضل یا مفتی نہیں ہوں لہٰذا کسی علمی بحث کو چھیڑنا یا تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینا میری علمی ہمت اور بساط سے باہر ہے اور یہاں پر یہ میرا مقصود اور موضوع بھی نہیں۔ میں دین کی واجبی سی سوجھ بوجھ رکھنے والا ایک عام سا دنیادار انسان ہوں۔ البتہ اس بات پر مجھے فخر ہے کہ اس ذاتِ باری نے مجھے جتنا بھی علم و ہنر عطا کیا ہے اس کا درست استعمال جانتا ہوں اس کے باوجود بھی اگر اس کارِ خیر کے دوران مجھ سے کہیں کوئی بھول چُوک یا بے ادبی ہو جائے تو وہ رؤف الرحیم میری چھوٹی بڑی ہر خطا کو معاف فرمائے جس کے اسماء الحسنیٰ پر قلم اٹھانے کی میں نے جرأت کی ہے۔

قارئین کی آسانی اور سہولت کے پیشِ نظر میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مستند روایت کو بنیاد بنا کر ماہ نامہ ''نئے افق'' کے لیے اس تعمیری و اصلاحی اور دنیا و آخرت کے معاملات کے لیے یکساں مفید سلسلے کا آغاز کرتا ہوں۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تسعہ و تسعین اسماما ئتہ الا واحدا من احصاھا دخل الجنۃ۔

ترجمہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں۔ جس نے ان ناموں کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی وہ جنت میں جائے گا۔

میں بھی ''نئے افق'' کے ان صفحات پر قادرِ مطلق کے انہی ننانوے یعنی ایک کم سو اسماء الحسنیٰ کا تذکرہ کروں گا۔ اپنی جائز اور نیک حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کو اس کے صفاتی ناموں سے پکارنا اور اس ذات پاک کی رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہونا عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور ہر عبادت کے بعد دعا کرنا ایک لازمی عمل ہے۔ حدیث کے مطابق ''دعا'' ہر نوعیت کی عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تفصیل اور تشریح سے قبل میں دعا کے معاملے پر روشنی ڈالنا نہایت ہی اہم اور ضروری خیال کرتا ہوں۔ ان لطیف روحانی تقاضوں کو پورا کیے بغیر دعا کی قبولیت کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی پودے کو پانی کی جگہ تیزاب پلائیں اور اس سے پھر بھی خوش ذائقہ پھل یا خوش نما پھول کی توقع رکھیں۔ اگر درج ذیل راہ نما اصولوں کی حرمت کا پاس کرتے ہوئے دعا کی جائے تو اسے روح الامین کے پَر لگ جاتے ہیں۔

● ہر دعا کے ساتھ اول آخر حسبِ توفیق درود شریف پڑھنا نہایت ہی کارآمد اور ضروری ہے۔ اس عمل سے آپ کی دعا کے ساتھ اللہ کے محبوب کی تائید بھی شامل ہو جاتی ہے۔

● کسی بھی دعا سے پہلے نیکی اور بھلائی کا کوئی کام کرنا چاہیے۔ اگر کسی بڑی نیکی کا موقع میسر نہ ہو تو انسانوں کی گزرگاہ سے کوئی پتھر یا کانٹا ہی ہٹا دیں یا مسکرا کر کسی کو سلام ہی کر ڈالیں۔

● ناممکن اور ناجائز کاموں کے لیے دعا کرنا جائز نہیں۔ وہ ذاتِ کریم مثبت صفات کا مالک ہے۔ اس سے ہمیشہ بھلائی، خیر اور تعمیری مقاصد کے لیے رجوع کرنا چاہیے۔

● اگر حصول مقصد میں دیر ہو رہی ہو تو بد دل یا مایوس ہرگز نہ ہوں بلکہ پوری دل جمعی سے دعا کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اس مالک الملک کی رحمت سے مایوس ہونا گناہِ عظیم ہے۔

● اگر کسی دعا گو شخص کی نیت صاف، دل شفاف،

کھانا پینا اور لباس رزقِ حلال کا رہین منت ہو تو رحمتِ خداوندی اس کی دعا مکمل ہونے سے پہلے ہی جوش میں آ جاتی ہے۔

وَہَّابُ

معانی: بے غرض، بخشش کرنے والا، بلا معاوضہ عطا کرنے والا، بے حساب دینے والا

تاثیر: اسمِ جمالی

اعداد: 14

مفرد عدد: 5

ورد: وَہَّاب

فیوض و برکات:۔

☆ اس اسم مبارک کی برکت اور فیض سے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت عطا ہوئی۔

☆ امام حامد لی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اسم مبارک کو پانچ ہزار مرتبہ پڑھا تو یہ اسم مقدس نورانی شکل میں ان کے پاس آیا۔

فضائل و وظائف:۔

☆ اگر کوئی شخص بہ کثرت وَھَّاب پڑھے یا فجر کی نماز کے بعد ایک ہزار مرتبہ وَہَّاب کا ورد کرے تو......

ا:۔ اس کی مفلسی اور تنگ دستی دور ہوگی۔

۲:۔ وہ دنیا میں کسی کا محتاج نہیں رہے گا۔

۳:۔ اس کی تمام ضروریات غیب سے پوری ہوں گی۔

☆ اگر کوئی شخص بلا ناغہ اکتالیس دن تک آدھی رات کے بعد (خصوصاً دو اور چار بجے کے درمیان) اٹھ کر وضو کرے اور گھر کے صحن یا مسجد کے صحن یا کسی بھی ہموار مقام پر دو رکعت نمازِ نفل ادا کرنے کے بعد، سجدہ کی حالت میں جا کر سو مرتبہ **یا وھاب** پڑھے تو......

ا:۔ وہ بے غرض اور غنی ہو جائے گا۔

۲:۔ غیب سے اس کی روزی کے اسباب پیدا ہوں گے۔

۳:۔ اس کے رزق اور روزگار میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔

☆ اگر کوئی شخص عشا کی نماز کے بعد بلا ناغہ اکتالیس دن تک چودہ سو مرتبہ یا وھاب پڑھے اور یہ دعا کرے

یا وھاب ھب لی من نعمتہ الدنیا والآخرۃ

تو......

ا:۔ وہ دنیا و آخرت کی دولت سے مالا مال ہو جائے گا۔

۲:۔ اس کے دل میں نرمی اور ہاتھ میں فراخی پیدا ہو جائے گی۔

۳:۔ اس کے اندر حاجت روائی کی صفت جنم لے گی۔

☆ میرا معبود ربّ المسلمین ہی نہیں بلکہ ربّ العالمین ہے لہٰذا غیر مسلم حتیٰ کہ اس کے وجود سے انکاری افراد بھی اسماء الحسنیٰ کے فیوض و برکات سے کما حقہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

☆ غیر مسلم افراد متذکرہ بالا اسم مقدس کو اپنے جائز اور نیک مقاصد، کے حصول کے لیے طلوعِ آفتاب سے پہلے والے ایک گھنٹے یا غروبِ آفتاب کے بعد والے ایک گھنٹے میں کسی بھی وقت اپنی سہولت کے مطابق بیان کردہ تعداد میں پڑھ سکتے ہیں۔

☆ منکرِ خدا جب جی چاہے اور جتنی بھی توفیق ہو، اس اسم مبارک کو پڑھ سکتے ہیں۔ ان شاء اللہ ان کی ہر مثبت اور تعمیری تمنا پوری ہوگی کیونکہ میرا پروردگار ان کا بھی خالق، مالک اور رزّاق ہے۔

www.paksociety.com

اقرا

ترتیب: طاہر قریشی

شرم وحیا:۔

شرم وحیا ایک ایسا اہم فطری اور بنیادی وصف ہے جس کو انسان کی سیرت سازی میں بہت زیادہ دخل ہے' یہی وہ وصف اور خلق ہے جو آدمی کو بہت سے برے کاموں اور بری باتوں سے روکتا اور فواحش ومنکرات سے اس کو بچاتا ہے اور اچھے اور شریفانہ کاموں کے لیے آمادہ کرتا ہے' الغرض شرم وحیا' انسان کی بہت سی خوبیوں کی جڑ بنیاد اور فواحش ومنکرات سے اس کی محافظ ہے' اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم وتربیت میں اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

اس سلسلہ کے آپ کے چند ارشادات ذیل میں پڑھیے' اور اس وصف کو اپنے اندر پیدا کرنے اور ترقی دینے کی کوشش کیجیے۔

(۲۲۳)

(ترجمہ) زید بن طلحہ سے روایت ہے' وہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' کہ:۔ ہر دین کا کوئی امتیازی وصف ہوتا ہے اور دین اسلام کا امتیازی وصف حیا ہے۔

(موطا امام مالک' سنن ابن ماجہ وشعب الایمان للبیہقی)

(تشریح) مطلب یہ ہے کہ ہر دین اور ہر شریعت میں اخلاق انسانی کے کسی خاص پہلو پر نسبتاً زیادہ زور دیا جاتا ہے' اور انسانی زندگی میں اسی کو نمایاں اور غالب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے' جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم اور شریعت میں رحم دلی اور عفو ودرگزر پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ (یہاں تک کہ مسیحی تعلیمات کا مطالعہ کرنے والے کو صاف محسوس ہوتا ہے کہ رحم دلی اور عفو ودرگزر ہی گویا ان کی شریعت کا مرکزی نقطہ اور ان کی تعلیم کی روح ہے) اسی طرح اسلام یعنی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت اور تعلیم میں حیا پر خاص زور دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن وحدیث کی اصطلاح میں حیا کا مفہوم بہت وسیع ہے' ہمارے عرف اور محاورہ میں تو حیا کا تقاضا اتنا ہی سمجھا جاتا ہے کہ آدمی فواحش سے بچے یعنی شرمناک باتیں اور شرمناک کام کرنے سے پرہیز کرے لیکن قرآن وحدیث کے استعمالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حیا طبیعت انسانی کی اس کیفیت کا نام ہے کہ ہر نامناسب بات اور ناپسندیدہ کام سے اس کو انقباض اور اس کے ارتکاب سے اذیت ہو' پھر قرآن وحدیث ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیا کا تعلق صرف اپنے ابنائے جنس ہی سے نہیں ہے بلکہ حیا کا سب سے زیادہ مستحق وہ خالق ومالک ہے جس نے بندہ کو وجود بخشا اور جس کی پروردگاری سے وہ ہر آن حصہ پا رہا ہے اور جس کی نگاہ سے اس کا کوئی عمل اور کوئی حال چھپا نہیں ہے' اس کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ شرم وحیا کرنے والے انسانوں کو سب سے زیادہ شرم وحیا اپنے ماں باپ کی اور اپنے بڑوں اور محسنوں کی

ہوتی ہے' اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سب بڑوں سے بڑا اور سب محسنوں کا محسن ہے' لہٰذا بندہ کو سب سے زیادہ شرم وحیا اسی کی ہونی چاہیے' اور اس حیا کا تقاضا یہ ہوگا کہ جو کام اور جو بات بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف ہو' آدمی کی طبیعت اس سے خود انقباض اور اذیت محسوس کرے' اور اس سے باز رہے' اور جب بندہ کا یہ حال ہوجائے' تو اس کی زندگی جیسی پاک اور اس کی سیرت جیسی پسندیدہ اور اللہ کی مرضی کے مطابق ہوگی ظاہر ہے۔

(اس حدیث کو امام مالکؒ نے موطا میں زید بن طلحہ تابعی سے مرسلاً روایت کیا ہے (یعنی ان صحابی کا ذکر نہیں کیا جن سے یہ حدیث زید بن طلحہ کو پہنچی تھی لیکن ابن ماجہ اور بیہقی نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو صحابیوں حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔)

(۲۲۴)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر انصار میں سے ایک شخص پر ہوا' اور وہ اس وقت اپنے بھائی کو حیا کے بارے میں کچھ نصیحت وملامت کر رہا تھا' تو آپ نے اس سے فرمایا کہ:۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو' کیونکہ حیا تو ایمان کا جز یا ایمان کا پھل ہے۔

(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انصار میں سے کوئی صاحب تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے شرم وحیا کا وصف خاص طور سے عطا فرمایا تھا جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے معاملات میں نرم ہوں گے' سخت گیری کے ساتھ لوگوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ بھی نہ کرتے ہوں گے اور بہت سے موقعوں پر اسی شرم وحیا کی وجہ سے کھل کر باتیں بھی نہ کر پاتے ہوں گے' جیسا کہ اہل حیا کا عموماً حال ہوتا ہے اور ان کے کوئی بھائی تھے جو ان کی اس حالت اور سرزنش کو پسند نہیں کرتے تھے' ایک دن یہ بھائی ان صاحب حیا بھائی کو اس پر ملامت اور سرزنش کر رہے تھے کہ تم اس قدر شرم وحیا کیوں کرتے ہو' اسی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان دونوں بھائیوں پر گزر ہوا' اور آپ نے ان کی باتیں سن کر ملامت ونصیحت کرنے والے بھائی سے ارشاد فرمایا کہ اپنے ان بھائی کو ان کے حال پر چھوڑ دو' ان کا یہ حال تو بڑا مبارک حال ہے' شرم وحیا تو ایمان کی ایک شاخ یا ایمان کا پھل ہے' اگر اس کی وجہ سے بالفرض دنیا کے مفادات کچھ فوت بھی ہوتے ہوں تو آخرت کے درجے بے انتہا بڑھتے ہیں۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)



www.paksociety.com

سیوک

خورشید پیر زادہ سیوک

جب زندگی کے راستے کٹھن ہوجائیں ' منزل نگاہوں سے اوجھل ہوجائے جب ہُوائیں مخالف ہوجائیں ' دل کا خون آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلے اپنے پرائے بن جائیں تو انسان جیتے جی مرجاتا ہے۔ ہر سانس اسے دشمن محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ خود دنیا کے لق و دق صحرا میں تنہا بھٹکنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا اس کی سوچیں اس سطح پر آگئی تھیں کہ وہ کسی بھی لمحے موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کرسکتی تھی مگر پھر اچانک حالات پلٹا کھا گئے کچھ نادیدہ ہستیاں اس کی دوست بن گئیں اور پھر کانٹوں بھرے راستے پھولوں کی سیج بنتے چلے گئے۔

ماورائی موضوع پر ایک خوب صورت ناول جس کی ہر سطر آپ کو چونک جانے پر مجبور کردے گی

گھر کے تمام لوگ ایئر کنڈیشن کمروں میں آرام کررہے تھے۔ باہر قیامت خیز لو چل رہی تھی' جھلسا دینے والی لو۔ یہ مئی کے مہینے کے آخری ہفتے کی کڑکتی دوپہر تھی۔

اس نے اداسی سے کھڑکی کھولی' لو کا تھپیڑا جیسے اس کا انتظار ہی کررہا تھا۔ لو کا تھپیڑا زناٹے دار تھپڑ کی طرح اس کے گلابی گالوں سے ٹکرایا۔ گالوں کی لالی اور بڑھ گئی۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کردی۔

"ہے بھگوان! کیسی لو چل رہی ہے"۔ اس نے سوچا اور واپس اپنے بستر کی طرف چل پڑی۔ سامنے دیوار پر ٹنگے گھڑیال کی سوئیاں دو بجا رہی تھیں۔ اُسے ٹھیک چار بجے کچن کی طرف چل پڑنا تھا...... کیونکہ شام کی چائے ٹھیک پانچ بجے لگتی تھی۔ اس طرح اس کے پاس آرام کرنے کے لیے ابھی دو گھنٹے اور تھے۔ آرام کرنے کا یہ موقع بھی اس قیامت خیز گرمی اور لو کی وجہ سے ہی مل پایا تھا۔ ورنہ گھر کے دوسرے لوگ اگر اپنے کمروں سے باہر ہوتے تو اسے کسی نہ کسی کام میں لگائے ہی رہتے تھے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ کام لینے میں اس گھر کے لوگوں کو شاید ایک عجیب سی خوشی ملتی تھی۔

اس وقت بھی کوئی کام اس کے سپرد کیا جاسکتا تھا' کچھ اور نہیں تو چاچی جی کے پاؤں ہی دبانے ہوتے۔ لیکن اس وقت اگر چاچی جی اس سے پاؤں دبواتیں تو اس بہانے اسے بھی ایئر کنڈیشن کی ٹھنڈک نصیب ہوجاتی اور یہ بات کسی کو قبول نہیں تھی۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور اس کی نگاہ آئینے پر جا پڑی۔ لو کے تھپیڑوں کی تپش ابھی بھی اس کے گلابی گالوں پر پھیلی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئینے کی طرف بڑھی اور سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس کے بھرپور جوبن کی جولانیاں آئینے میں سمٹ آئی تھیں۔ مگر اس کے دماغ میں اس کے ساتھ پیش آنے والا سلوک ہی گردش کررہا تھا جو اس گھر کے مکینوں کا وطیرہ تھا...... رات دن کی جھڑکیاں' بات بے بات طنز کے تیر' ہر قدم پر توہین' طرح طرح کے الزامات' دن رات کی گھٹن...... اس کی اب تک کی اٹھارہ برس کی زندگی میں بھری پڑی تھی لیکن اس کی خوب صورتی شاید ان باتوں کو جھیلتے ہوئے اور بھی نکھرتی جارہی تھی۔ قدرت کی طرف سے اسے نہ صرف میدے کی طرح سفید رنگت عطا ہوئی تھی بلکہ اس کے نین نقش بھی لاکھوں میں ایک تھے۔ گلابی اور بھیگے بھیگے سے اس کے ہونٹ کسی سادھو سنت کی

ریاضت کو بھی غارت کرسکتے تھے۔ صراحی دار گردن اور اس سے نیچے کے نشیب و فراز اور چال تو اس غضب کی تھی کہ سڑیل بڈھوں میں بھی زندگی کی نئی لہر دوڑا دے۔

"ایسی بھی کیا بے حیا زندگی' ایک پل کو چین نہیں تھا۔" لیکن حسن اور جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ بھگوان نے اس کی ساری کمیوں کے بدلے میں تو یہ شکن حسن دے کر مانو اس کی ہر کمی کو پورا کردیا تھا لیکن کس کام کا یہ روپ اور یہ جوانی جو ہر وقت طنز اور طعنوں کا شکار ہوتی رہے۔ چاچی جی کے بس میں نہیں تھا' نہیں تو وہ اسے زہر دے کر مارنے میں بھی دیر نہ کرتیں۔ وہ اس کے روپ اور جوانی پر بھی بہت گندے گندے الفاظ استعمال کرتی تھیں۔ ان باتوں سے پریشان ہوکر آشا نے صابن سے منہ تک دھونا چھوڑ دیا تھا۔ اب یہ اس کے بس میں تو تھا نہیں کہ اپنے روپ اپنی جوانی' اپنی خوب صورتی کو خود اپنے ہاتھوں سے بگاڑ کر رکھ لیتی۔ شکل بگاڑ بھی لیتی تب بھی اس کے بدن کا ایک ایک عضو چیخ چیخ کر اس کے حسن و جمال کا اعلان کررہا تھا۔ نا جانے کتنی دیر تک وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر اپنے بے پناہ حسن کا خراج وصول کرتی رہی پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس آکے اپنے بستر پر گر پڑی۔ بارہ سال کی عمر تھی جب اس کے ماں باپ ایک کار ایکسیڈنٹ کا شکار ہوکر اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ وہ اس وقت اسکول میں تھی جب اسے یہ منحوس خبر دی گئی' اس حادثے نے ان کے دماغ پر شدید اثر ڈالا اور وہ بے ہوش ہوکر دنیا و مافیہا سے بے پروا ہوگئی' ڈاکٹروں کی کوششیں اسے پورے چار دن بعد ہوشمندی کی دنیا میں واپس لانے میں کامیاب ہوئیں۔ دادی جی اپنے بیٹے کی اس اکلوتی نشانی کو سینے سے لگا کر اپنے ساتھ لے آئیں لیکن چاچی جی کو اس اکلوتی نشانی سے ہمیشہ چڑ ہی رہی تھی اور یہ چڑ اب شدید نفرت کا روپ دھارن کرتی جارہی تھی۔ دادی جی کے ہوتے ہوئے تو چاچی جی کچھ بھی نہ کرپائیں لیکن دادی کی آنکھیں بند ہوتے ہی آشا پر جیسے مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

دادی جی کو چھوڑ کر اس گھر کا ہر فرد اس سے شدید نفرت کرتا تھا۔ چاچا جی تو "نوکر بیوی کا" قسم کے آدمی تھے۔ اپنے بھائی کی اس اکلوتی نشانی پر انہیں اگر کبھی رحم آیا بھی تو اپنی بیوی کی آنکھوں میں دھکتی آگ کو دیکھ کر اس احساس کو تھپکا کر سلا دیا کرتے تھے۔ اس گھر میں چاچی جی کی بہن سلیکھا موسی بھی ساتھ ہی رہتی تھیں۔ بیوہ اور بے اولاد تھیں' لیکن قدرت نے ان کے ساتھ یہ سلوک شاید ان کے کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے کیا تھا' چھل کپٹ کی ماہر' نہایت گرم مزاج' بدتمیز' جھگڑالو' خود غرض' بے مروت اور جلادی طبیعت پائی تھی انہوں نے۔ بات بے بات ان کی ناک بھویں چڑھی رہتی تھی اور آشا تقریباً روزانہ ہی ان کی ان خوبیوں کا شکار بنتی رہتی تھی بلکہ چاچی جی سے زیادہ سلیکھا موسی کا ڈر آشا کو دہلائے رکھتا تھا۔

رہ گئیں سیما اور نکیتا! تو بچپن کی حد تک تو وہ دونوں ٹھیک ٹھاک رہیں لیکن جوانی آتے ہی آشا کے رنگ روپ کے آگے خود کو بجھا ہوا دیا دیکھ کر ان کے دلوں میں دن بہ دن نفرت بڑھتی ہی جارہی تھی۔ آشا کا عام استعمال شدہ کپڑوں اور بغیر میک اپ کے چمکتا ہوا چہرہ ان کے جگمگ کرتے کپڑوں اور ہزار میک اپ کے باوجود حسین تر نظر آتا تھا۔ بہت سے فنکشنز اور پارٹیز میں اپنے سادہ حسن کی بدولت آشا سب کی نگاہوں کا مرکز بن جاتی تھی۔ اس وجہ سے گھر اور باہر ہونے والی تمام پارٹیوں میں آشا کی شرکت ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ بہرحال کون سا ایسا توہین آمیز

سلوک تھا جو بے چاری آشا کے ساتھ روا نہ رکھا جا رہا تھا' کون سا ایسا ظلم تھا جو اس پر ڈھایا نہیں گیا تھا اور آشا اس تمام ظلم اور زیادتی کو اپنا مقدر سمجھ کر صبر سے جھیلتے ہوئے بے رونق زندگی گزار رہی تھی۔ اس بے چاری کو تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ آخر اس کا مستقبل کیا ہے؟

بستر پر بیٹھی ہوئی وہ نجانے کتنی دیر تک انہی سوچوں میں ڈوبی رہی۔ دیوار پر لگے گھڑیال نے تین بجنے کی منادی دی تو وہ اپنی سوچوں کے بھنور سے چونک کر باہر نکلی۔ "ابھی تو ایک گھنٹہ باقی ہے۔" وہ سوچنے لگی کہ اگر لیٹ گئی تو شاید نیند آ جائے اور یہ نیند اس کے لیے کیا عذاب لا سکتی تھی یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اگر ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تھی تو گھر والے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے تھے۔

کمرے میں اکیلی بیٹھے بیٹھے اس کا دل گھبرانے لگا۔ باہر بلا کی لو چل رہی تھی ورنہ پائیں باغ میں چلی جاتی۔ "ہونہہ۔ لو کیا کر لے گی۔ اچھا ہے بیمار ہو جاؤں' کچھ دن تو سکون مل جائے گا۔ مر بھی جاؤں تو کیا ہے۔ کون سی قیمتی زندگی ہے جو کسی کو دکھ ہو گا۔" اس نے سوچا اور سوچ کے دھارے پر چلتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ باہر قدم رکھتے ہی اسے گرمی کی شدت کا احساس ہوا۔ لیکن اب کمرے میں مزید ٹھہرنا بھی اس کے لیے عذاب سے کم نہیں تھا۔ وہ گرمی کی پروا کیے بغیر کوریڈور سے ہوتی ہوئی صدر دروازے پر آ گئی۔ صدر دروازے کے باہر چلچلاتی دھوپ کا راج تھا' ایسی دھوپ کہ چیل انڈے چھوڑ دے۔ صدر دروازے سے گزر کر وہ باہر آ گئی۔ ہوا میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی جس کی تپش سے گھاس اور پودے پیلے پڑ گئے تھے۔ لیکن برگد کا پرانا درخت اپنی تمام تر ہریالی کے ساتھ جھوم رہا تھا جس کی چھاؤں میں مالی کی خالی چارپائی پڑی ہوئی تھی' شاید مالی بھی اس گرمی سے ہار کر اپنے کوارٹر میں جا چھپا تھا۔ بھی ملازموں کے کوارٹروں کے دروازے بند تھے اور کچھ ملازم جو ڈیوٹی پر تھے وہ کوٹھی کے پچھلے حصے میں تھے۔ باقی سب گرمی سے پناہ مانگتے ہوئے کوارٹروں میں دبکے ہوئے تھے۔ وہ تیز قدموں سے برگد کی طرف بڑھی' جس نے دھوپ کی تپش اور لو کے تھپیڑوں کو اپنی ٹھنڈی چھاؤں سے پیچھے دھکیل کر آرام کرنے والے کے لیے ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا کا انتظام کیا ہوا تھا۔ "کتنا دیاوان ہے یہ برگد۔ خود دھوپ سہہ کر دوسروں کو چھاؤں دیتا ہے۔" اس نے سوچا اور اس کے دل سے نکلی ٹھنڈی آہ باہر آتے آتے گرم سانس میں بدل گئی تھی۔

وہ مالی کی کھاٹ پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ برگد کے پتے ہوا سے مل کر مدھر سنگیت سنا رہے تھے' وہ اس سنگیت میں کھو گئی اور تھوڑی دیر میں وہ اپنے سارے دکھ بھول گئی۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ بس ایک ویرانی تھی۔ ایک سناٹا تھا جو اس کے مقدر کا حصہ بن چکا تھا۔ اسے یہ برگد اپنا سب سے بڑا ہمدرد لگنے لگا تھا کیونکہ وہ اسے نہ صرف ٹھنڈی چھاؤں دے رہا تھا بلکہ مدھر سنگیت بھی سنا رہا تھا۔

اس کی نظر ایک چمکدار چیز پر پڑی۔ دماغ میں نہ جانے کتنی سوچیں ابھر رہی تھیں۔ وہ ایک دم بے دھیانی میں اس چمکدار چیز کو دیکھے جا رہی تھی۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے پل گزر گئے۔

اچانک اسے کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی اور وہ خیالوں سے چونک پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور ایک پرچھائیں سی اس کے اوپر سے پار ہو گئی لیکن پیچھے تو اسے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس نے سر کو دائیں بائیں گھما کر دیکھا لیکن اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔

"پیروں کی چاپ کس کی تھی؟ ہو سکتا ہے کوئی گلہری سوکھے پتوں پر بھاگی ہو اور پیڑ پر چڑھ گئی ہو۔" اس نے سوچا اور یہ سوچ کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔ ظاہر ایسے گرم ماحول میں کوئی بھی اس جیسا سنکی نہیں ہو سکتا جو گھر سے باہر آئے۔

"لیکن وہ پرچھائیں...... ہونہہ......! کیا اب میں وہمی بھی ہوتی جا رہی ہوں۔ پرچھائیں خود میری ہی ہو گی' جو میرے مڑنے پر نظر آئی ہو گی۔" اس نے خود کو دلیل دے کر مطمئن کرنا چاہا۔ اپنے من سے یہ سب باتیں نکال کر اسے پھر وہ چمکدار چیز یاد آئی۔ اس بار وہ دھیان دے کر کھوجنے لگی۔ وہ ایک سفید سی چمکدار چیز تھی۔ وہ برگد کی جڑ کے پاس آ کر رکی۔ اس نے دیکھا کہ وہ چمکدار سفید چیز ایک چھوٹا دودھیا سا چمکدار پتھر تھا جسے اس نے اٹھا لیا۔

یہ دل نما تراشا ہوا پتھر تھا جس کے کچھ حصے پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دوپٹے سے اسے صاف کیا۔ "کتنا خوبصورت پتھر ہے۔ نہ جانے کہاں سے آیا ہے' قیمتی بھی معلوم ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی کے زیور سے ٹوٹ کر گرا ہو لیکن اس پیڑ کے نیچے...... اور پھر اس کی تراش خراش بھی ایسی نہیں ہے کہ کسی گہنے سے نکلا ہوا لگے۔ اس کے علاوہ بہت پرانا بھی لگ رہا ہے۔"

وہ پتھر کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھنے لگی۔ جو واقعی بہت خوشنما اور دلفریب لگ رہا تھا۔ اسے وہ پتھر بہت اچھا لگنے لگا۔ "اسے میں اپنے پاس ہی رکھوں گی' اگر کسی اور کا ہوا تو اسے واپس کر دوں گی۔" اس سوچ کے ساتھ اس نے پتھر کو مٹھی میں دبایا اور واپس آ کر کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

بیٹھنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک پتھر کو گھورتی رہی۔ "بالکل دل کی شکل کا ہے۔ نا جانے کون سے قیمتی پتھر سے کاٹا گیا ہے۔ کہیں پلاسٹک کا تو نہیں...... لیکن پلاسٹک اتنا بھاری تو نہیں ہوتا۔ کچھ بھی ہو یہ تو اب میرا ہے۔" یہ سوچتے ہوئے اس نے پتھر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسی کے ساتھ اس کو ایک مردانہ آواز سنائی دی "شکریہ" ایک بار پھر وہ اچھل پڑی۔ اس بار اس کے کانوں نے دھوکہ نہیں کھایا تھا۔ ضرور کوئی آواز تھی جس نے شکریہ کے بول کہے تھے۔ وہ بدحواس ہو کر کھڑی ہو گئی۔ "کون ہے؟"

اسے پھر وہ چلنے کی آواز اور پرچھائیں یاد آ گئی۔ اس نے بوکھلائے انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ لیکن چلچلاتی دھوپ اور لو کے علاوہ وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس کی نگاہ پیڑ کی طرف اٹھ گئی کہ شاید کوئی پیڑ پر چھپا ہو اور اسے پریشان کر رہا ہو لیکن پیڑ کے پتے سنسان تھے۔ اوپر تک پیڑ کی ٹہنیاں دکھائی دے رہی تھیں اور کوئی نہیں تھا۔

اسے ڈر محسوس ہونے لگا۔ وہ کھاٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پتھر اب بھی اس کی مٹھی میں بند تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے صدر دروازے کی طرف بڑھی اور دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ عجیب بات تھی۔ اسے اپنے کانوں پر پورا بھروسہ تھا اور اس نے ایک دم صاف ڈھنگ سے "شکریہ" کے بول سنے تھے۔

اس واقعے سے وہ کافی دیر تک پریشان رہی۔ تب اس کی نظر گھڑی پر پڑی۔ چار بجنے میں صرف دس منٹ بچے تھے۔ وہ سب باتوں کو بھول کر خود کو باورچی خانے میں جانے کے لیے تیار کرنے لگی۔ مٹھی میں بند پتھر کو بستر کے ساتھ بنی دراز میں رکھ کر وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں نے اس کے چہرے اور گالوں کی تمتماہٹ کو بہت آرام دیا۔

وہ کافی دیر تک چہرے اور آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتی رہی اور انہیں نرمی بخشتی رہی اور پھر تازہ دم ہو کر باہر نکل آئی۔ چار بج چکے تھے۔ کمرے سے نکل کر وہ کچن میں پہنچ گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے

تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے واقعات کو بھلا دیا۔ اب اسے اپنی ذمہ داریاں نبھانی تھیں۔ اس نے اپنے دماغ میں گھر کے حاکموں کی جانب سے آج شام کی چائے ساتھ کی جانے والی فرمائشوں کو دوہرایا۔ سب کی فرمائشوں کو پورا کرنا اس کا فرض تھا۔ اس لیے وہ جلدی جلدی تیاریاں کرنے لگی۔

اور ٹھیک پانچ بجے وہ ایک خوب صورت ٹرالی میں مختلف انواع کی چیزیں سجا کر سلیکھا موسی کے بڑے کمرے میں پہنچ گئی۔ باہر کا موسم ابھی تک گرم تھا' اس لیے باہر لان میں چائے پینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر ایسی گرمیوں میں پانچ بجے تک دوپہر ہی رہتی ہے۔

برف کی طرح ٹھنڈے کمرے میں سب لوگ صوفوں پر بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی ایک پل کے لیے قہقہے رک گئے اور پھر چل پڑے جیسے اسے احساس دلایا جا رہا ہو کہ اس کے یہاں آنے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا ہے اور وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن اس نے ان سب کے اس رویے پر کوئی دھیان نہیں دیا اور اپنا کام انجام دینے لگی' کیونکہ یہ تو ان سب کی روزانہ کی عادت تھی۔ وہ ٹرالی میں سے ناشتے کا سامان لے کر سینٹر ٹیبل پر سجانے لگی۔ کچن کی گرمی سے اس کا چہرہ ایک بار پھر تمتما کر سرخ ہو چکا تھا۔ سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بھی اس کی خوبصورتی جھلک رہی تھی اور اس ادا میں بھی ایک الگ ہی ادا تھی۔

"آشا! اس گرمی میں بھی تجھے میک اپ کرنے سے فرصت نہیں ہے۔" نکیتا نے اسے گھورتے ہوئے جھاڑا۔

"میک اپ!" اس نے حیرت سے نکیتا کی طرف دیکھا۔ اس نے تو زندگی میں کبھی میک اپ کیا ہی نہیں تھا۔

"ہونہہ! انگوٹھی کا رنگ ہی ایسا ہے۔ کمال کی بات ہے۔ تم لوگ سونے کا نوالہ کھاتی ہو تب بھی ایسا روپ نہ نکال سکیں' ہونہہ!" سلیکھا موسی کی باتوں میں بھی زہر ٹپک رہا تھا۔ بھگوان کے کام بھی کمال کے ہیں۔" اس بار بھگوان بھی ان کے جھپیٹے میں آ گئے لیکن انہیں پتا نہیں چلا کہ ان کی کہی باتوں سے انجانے میں آشا کی ہی تعریفیں تھیں جو ان کی دونوں بھانجیوں کے دل پر برچھیوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ دونوں بھانجیاں برا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگیں۔

وہ کمرے سے باہر آ گئی کیونکہ ابھی بہت سارے کام تھے جو صرف اسے ہی نمٹانے تھے۔ ادھر سورج اب تک آگ برسا رہا تھا لیکن وہ کام میں مصروف ہو کر گرمی سے بے خبر ہو چکی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بیٹھے رہنے سے گرمی اور سردی دونوں کا احساس کچھ زیادہ ہی رہتا ہے بہ نسبت کام میں مصروف رہنے کے۔

شام ہوئی' رات آ گئی۔ وہ تو سب کچھ بھول چکی تھی۔ برگد کی جڑ کے پاس سے ملنے والا پتھر...... شکریہ کے الفاظ...... کوئی بات اسے یاد نہ تھی۔ گیارہ بجے سب کے اپنے اپنے بستروں میں گھس جانے کے بعد اسے فرصت ملی۔

فرصت ملتے ہی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے گہری گہری سانسیں لی۔ دن بھر تپ جانے کے بعد اب کمرہ کچھ ٹھنڈا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

آئینہ سامنے تھا۔ اس نے غرور اور خوشی کے ملے جلے تاثر کے ساتھ اسے دیکھا۔ یہ آئینہ ہی تو اس دنیا میں اس کا واحد دوست' سہیلی' اس کا ہمدم اور ہمراز تھا۔ کبھی کبھی تو آواز کے ساتھ اور کبھی خاموش زبان میں وہ اس آئینے سے باتیں بھی کر لیتی تھی۔ یہ آئینہ ہی تو تھا جو اس کی تعریف بھی کرتا تھا اور اس کی اہمیت کو بھی واضح کرتا تھا۔ تب وہ سوچنے لگی۔ "کچھ بھی ہے' وہ ان سب سے اچھی' ان سے کہیں زیادہ خوب صورت لگتی ہے۔ شاید ان کے چہروں پر ان کے دلوں کی کالک جھلک آتی ہو۔"

عام طور پر اس کے لیے سادہ اور معمولی کپڑے ہی بنتے تھے۔ لیکن اس کی آنجہانی پیاری ماں کے کچھ جوڑے اب بھی اس کے پاس موجود تھے۔ قیمتی جوڑے جنہیں کبھی کبھی وہ اپنے کمرے میں ہی پہن لیتی تھی۔ آج بھی نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ کوئی اچھا سا جوڑا پہنے اور یہ چاہ اتنی بڑھی کہ وہ خود کو روک نہ سکی۔ اس نے الماری کھول کر ایک بہت ہی خوب صورت قیمتی کامدار جوڑا نکالا اور باتھ روم میں جا کر پہننے لگی' کامدار جوڑے میں وہ پرستان کی کسی پری سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے باہر آ کر آئینے میں اپنے سراپے پر نظر دوڑائی اور کچھ پل یک ٹک خود کو دیکھتی رہی اور پھر خود ہی لاج سے اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔

"کاش! اس روپ کو کوئی دیکھنے والا ہوتا جو اس کے حسن' اس کی خوب صورتی کو سراہتا...... کاش...... کاش......!" اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔

اچانک اس کے کانوں میں آواز سنائی دی۔

"خوب صورت...... بہت خوب صورت...... نظر نہ لگ جائے۔"

وہ تو اچھل ہی پڑی۔ جلدی سے دروازے کی طرف نظر دوڑائی' مگر دروازہ تو اندر سے بند تھا۔ اب وہ پلنگ کی طرف گھومی پھر تو اس نے کمرے کا کونا کونا دیکھ ڈالا لیکن کہیں کوئی نہیں تھا۔

"میرے کان کیوں بجنے لگے ہیں۔" اس کے حسین چہرے پر تھوڑی پریشانی اور تھوڑے ڈر کا احساس چھانے لگا تھا۔ "اس وقت شکریہ کی آواز...... اور اب...... اب......" اچانک ہی اس کے ذہن نے انکشاف کیا کہ دونوں آوازیں ایک ہی لب و لہجے اور شیریں انداز کی تھیں...... مدھر محبت بھری...... اس کے ذہن میں سوچوں کا طوفان سا چل رہا تھا۔ کون ہے؟ آخر کون ہو سکتا ہے؟ ہے بھگوان! وہ اسے اپنے دماغ کا خلل ماننے کو تیار نہ تھی...... آخر وہ اتنی واضح آواز سننے کے بعد اسے کیسے جھٹلا سکتی تھی۔ وہ کسی بھی طرح سے اپنے دل کو تسلی دینے کے تیار نہ تھی۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھنا اور شرمانا بھول چکی تھی۔ اب وہ آئینے کے پاس سے ہٹ گئی۔

راتیں اس کی اپنی ہوتی تھیں اور رات میں کسی طرف سے کسی بلاوے کا کوئی امکان نہیں ہوتا تھا۔ وہ انہی کپڑوں میں بستر پر آ کر لیٹ گئی اور تکیے پر سر رکھ کر اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر پڑ گئی۔ اکیلے پن میں ابھرنے والی سوچوں سے چھٹکارا پانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیٹے لیٹے اسے اس چمکدار پتھر کا خیال آیا۔ اس نے پلنگ سے لگی ریک کی دراز کھولی اور پتھر کو باہر نکال لیا۔

"کتنا پیارا پتھر ہے۔" وہ سوچنے لگی۔ وہ اسے اور چمکانے کے لیے اپنے کپڑوں پر رگڑنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پتھر مزید جھلملانے لگا۔

لیکن اس کے ساتھ کچھ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اوپر بنے روشندان سے کوئی پرندہ گھس آیا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے ایک...... دو...... تین...... چار...... کتنے ہی گھس آئے۔ وہ گم سم سی انہیں دیکھتی رہی۔ یہ چمگادڑیں تھیں۔ ان میں سے تین فرش پر اتر آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کا قد بڑا ہونے لگا اور ایک قد آور

انسان سے برابر روپ دھارن کرلیا۔

آشا کی آنکھیں تو ڈر کے مارے جھپکنا ہی بھول گئی تھیں۔ وہ ان چمگادڑوں کو انسانی روپ میں بدلتا دیکھتی رہی۔ عجیب بھیانک سی شکل تھی ان کی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن آواز جیسے اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوچکے تھے حالانکہ اب موسم کافی خوشگوار ہوچکا تھا لیکن اس کا چہرہ اور بدن پسینے میں تر ہو رہا تھا۔

''ہے بھگوان......! ہے بھگوان ......!'' ڈر کے مارے وہ دل ہی دل میں ایشور کو یاد کرنے لگی۔

''ہم سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آشا!'' آواز میں مٹھائی سے زیادہ مٹھاس اور روئی سے زیادہ نرمی تھی۔ ''ہم تمہارے غلام ہیں۔ تمہارا بھلا چاہنے والے ہیں۔ ہم کسی صورت بھی تمہیں کوئی نقصان پہچانے نہیں آئے۔ نا ہی تمہیں کسی مصیبت میں ڈالیں گے۔ تمہارے ایک اشارے پر ہم بڑے سے بڑا کام کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ ہم سے مت ڈرو۔ کاش! ہم کسی اچھی شکل میں تمہارے سامنے آسکتے کہ تمہیں ہم سے کوئی خوف محسوس نہ ہوتا۔''

''کیا یہ کوئی تصور...... کوئی بھیانک سپنا ہے؟'' آشا نے سوچا اور اپنی آنکھوں کو ملنے لگی لیکن یہ کوئی سپنا نہیں تھا۔ آدمیوں سے ملتے جلتے چہروں والی وہ تینوں بھیانک چمگادڑیں اپنی پوری حقیقت کے ساتھ اس کے سامنے تھیں۔ وہ ڈراؤنے ضرور تھے مگر بڑی ہی میٹھی اور نرم آواز میں بول رہے تھے۔

''تت...... تم کون ہو؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا۔

''تمہارے غلام...... ہمیں حکم دو کہ ہم کیا کریں...... ہم تمہارے لیے ہر کام کرسکتے ہیں۔''

''میں کیا حکم دوں...... مگر تم میرے غلام کیسے بن گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہمیں یہ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ وقت آنے پر تمہیں سب کچھ پتا چل جائے گا۔''

''وہ وقت کب آئے گا؟''

''بہت جلد...... بہت ہی جلد...... تم کوئی فکر مت کرو۔ تمہارے برے دن بیت گئے۔ اب کوئی تمہیں آنکھ نہیں دکھا سکے گا۔ ہم تینوں کو تمہاری خدمت پر مامور کردیا گیا ہے۔''

آشا اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ وہ تینوں نہایت ادب کے ساتھ اس کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے۔

''اگر کوئی کام نہیں ہے تو ہمیں جانے کی اجازت دیجیے۔ کیا ہم جاسکتے ہیں؟''

''ہاں ہاں تم جاؤ...... بھگوان کے لیے جاؤ۔''

''ہم حاضر ہوتے رہیں گے۔ اگر آپ ہم سے اسی طرح ڈرتی رہیں تو آپ کو تکلیف ہوگی۔ آپ اپنے من سے یہ ڈر نکال دیں اور ہاں...... ہمارے جانے کے بعد آپ کو نیند نہیں آئے گی۔ ضرور آپ ہمارے بارے میں سوچتی رہیں گی۔ اس لیے آپ یہ شربت پی لیجیے۔ آپ کو پرسکون نیند آجائے گی۔''

ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور آشا نے اس کے ہاتھ میں ایک خمدار گلاس دیکھا جس میں ہلکے گلابی رنگ کا کوئی مشروب تھا۔

آشا ویسے ہی ڈری ہوئی تھی۔ گلاس ایک دم اس کے نزدیک آگیا۔ دودھ جیسے گاڑھے شربت سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ نا جانے وہ کیا تھا لیکن وہ تینوں اس کے سامنے کھڑے تھے اس لیے اس نے ہڑبڑا کر شربت کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر منہ سے لگا لیا پھر تو اس نے گلاس اسی وقت منہ سے ہٹایا

جب تک کہ اس نے ایک ایک بوند شربت اپنے حلق میں نہ ٹپکا لیا۔ بلاشبہ اس نے اتنا مزیدار اتنا ذائقے دار شربت زندگی میں کبھی چکھا بھی نہیں تھا پھر اگلے ہی پل اسے اپنا بدن پھولوں کی مانند ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ ایسا لگنے لگا جیسے اس کے بدن کی ساری تھکان کسی نے نچوڑ کر نکال دی ہو اور خود بخود نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کا ایک گول دائرہ اس کے پلنگ کے ٹھیک سامنے دیوار پر موجود تھا۔ دھوپ کی کرنوں کا یہ دائرہ ٹھیک پونے آٹھ بجے اس جگہ موجود ہوتا تھا۔ اس نے گھبراہٹ میں جلدی سے گھڑیال کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ گھڑیال بھی پونے آٹھ بجے کی منادی دے رہا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے گھر کے سب افراد ناشتے کی میز پر موجود ہوتے تھے اور انہیں آٹھ بجے ناشتہ دینا اس کی ذمہ داری ہوتی تھی یعنی صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''آج ضرور میری شامت آگئی ہے۔'' اس نے کپکپاتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔

''آٹھ بجے ناشتہ نہیں ملے گا تو وہ مجھے ہی کھا جائیں گے۔'' وہ بجلی کی طرح پلنگ سے کودی۔ اس کے بدن پر وہی کپڑے تھے جو شوق میں چور ہو کر اس نے رات میں پہن لیے تھے۔ ''اب بھگتو۔'' آشا خود سے مخاطب ہوئی۔ اس وقت یہ کپڑے بھی وبال بن گئے تھے اس کے لیے۔

''انہیں اتارنے میں بھی تو دو تین منٹ ضائع ہوجائیں گے لیکن اگر انہوں نے اسے ان کپڑوں میں دیکھ لیا تو اور مصیبت آجائے گی۔'' اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

alislampk.com
ملک کا منفرد دینی و اصلاحی رسالہ
ماہنامہ
الاسلام
کراچی
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیر ادارت
قیمت: 20 روپے
دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد
خوابوں کی تعبیر: حافظ عبدالقیوم نعمانی
دنیائے اسلام کے تمام مسالک سے متعلق علمائے کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل
وہ سب کچھ جو آپ جاننا اور پڑھنا چاہتے ہیں
پتا: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی
فون: 35260771/2 فیکس: 35260773
alislamkhi@gmail.com

"ہے بھگوان......! میرے اچھے بھگوان......! میری کٹھنائی دور کردے۔" اس نے آنسوؤں بھرے لہجے میں اپنے بھگوان سے دعا کی اور کپڑے بدلنے لگی' کپڑے بدل کراس نے منہ پر پانی کے الٹے سیدھے چھینٹے مارے' بالوں کو بھی نہیں سنوارا اور چوروں کی طرح چھپتی چھپاتی کچن کی طرف بڑھنے لگی کہ کہیں کوئی اسے راستے میں دیکھ نہ لے۔ سلیکھا موسی کی غصے سے بھری آواز اس کے خیالوں میں گونج رہی تھی کہ "گھوڑی کی طرح سو رہی ہے۔ جوانی پھٹی پڑ رہی ہے۔ کیسی مست نیند ہے۔ سو رہی ہوگی نرجلی......" ہانپتے کانپتے وہ کچن میں گھسی۔ اسے کوئی بہانہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا اور جھوٹ بولنے کی تو اسے عادت ہی نہیں تھی۔

کچن کے دروازے سے گھستے ہی اس کے قدم جہاں کے تہاں جم کے رہ گئے۔ ہاتھ پاؤں اور بھی پھول گئے یہ دیکھ کر کہ......نہ جانے ناشتہ کس نے تیار کیا تھا۔ چائے کا پانی کیتلی میں کھول رہا تھا۔ ہر چیز نہایت ڈھنگ سے سجی ہوئی تھی۔

"کیا گھر والوں نے اسے سوتا دیکھ کر خود ناشتہ تیار کیا ہے؟" اگر ایسی بات تھی تو مصیبت دوگنی ہونا لازمی تھی۔ اس نے بھاری قدموں کو اٹھایا اور چائے کا پانی چولہے سے اتار کر اسے دوسری کیتلی میں ڈال کر پتی ڈالی اور ڈھک دی پھر سبھی چیزوں کو طریقے سے ٹرالی میں سجا کر باہر نکلنے کو تیار ہوئی۔

دل میں خوف کی ایک لہر آرہی تھی اور ایک جا رہی تھی۔ اسے ہر پل یہی لگ رہا تھا کہ مانو اب کوئی آیا اور اس کے سر پر بم پھوڑا لیکن کوئی نہیں آیا۔

ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے مند مند چلتے ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے وہ کچن سے نکل آئی اور ڈائننگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے پھانسی کی سزا پایا ہوا مجرم پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہا ہو۔ حسب معمول سب ہی ڈائننگ روم میں موجود تھے۔ وہ دوسروں سے نظریں چراتی ہوئی میز کے پاس آ گئی۔ سب کو ایسے چپ لگی ہوئی تھی جیسے کوئی بہت ہی بھیانک حادثہ پیش آ گیا ہو۔ وہ میز پر ناشتہ لگاتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ سوکھے چہرے پر گلابی ہونٹ کچھ زیادہ ہی سوکھ رہے تھے۔ بار بار وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر ان کی خشکی دور اور تھوک نگل کر سوکھے حلق کو تر کرتی رہی مگر ہونٹ اور حلق مزید خشک ہوتا محسوس کر رہی تھی۔

پھر اس پر حیرت کا پہاڑ سا ٹوٹ پڑا کیونکہ سبھی نے بنا کوئی لفظ بولے خاموشی سے ناشتے سے انصاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت امڈی پڑ رہی تھی۔ تھوڑی سی نگاہ اوپر کر کے اس نے ایک ایک کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"کیا یہ سب پاگل ہوگئے ہیں یا پھر ناٹک کر رہے ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اب تک انہوں نے اس سے ناشتے کے بارے میں پوچھا کیوں نہیں...... برا بھلا کیوں نہیں کہا؟"

لیکن ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی وہ برہمی کا ایک ذرّہ برابر احساس بھی ڈھونڈنے میں ناکام رہی۔

"ہے بھگوان......! یہ کیا ماجرا ہے...... کیا ان میں سے کسی نے آج ناشتہ نہیں بنایا؟"

تبھی سلیکھا موسی نے چائے کا کپ آگے بڑھایا......

"چل چائے ڈال۔" اور اس نے فوراً کسی چست بیرے کی طرح آگے بڑھ کر موسی کے کپ میں چائے بنائی اور پیچھے ہٹ گئی۔

"پھر بھول گئی...... آنکھ کی اندھی...... ہائے

بھگوان......روز کہتی ہوں کہ میری چائے میں تھوڑا سا نمک ڈال دیا کر۔ مگر مہارانی کو یاد ہی کہاں رہتا ہے......" آخر موسی کو اسے جھاڑنے کا موقع مل ہی گیا۔

اس نے اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے جلدی سے نمکدانی سے تھوڑا نمک نکال لیا۔ مگر موسی اتنے آرام سے مطمئن ہونے والی کہاں تھیں۔ انہیں تو مانو ایک سنہری موقع مل گیا تھا جس سے فائدہ اٹھانا ان کا فرض بنتا تھا پھر ان کے منہ سے گولے برسنے لگے۔ "چل رکھ نگوڑی منحوس! اب تو میں خود بھی لے سکتی ہوں۔ پہلے کیا تیرے ہاتھ ٹوٹے ہوئے تھے آں۔"

وہ کرسی سے تھوڑا اٹھیں اور نمکدانی پکڑ کر واپس کرسی پر بیٹھنے لگیں......جانے کیسے......کیا ہوا کہ کرسی تھوڑا پیچھے کھسک چکی تھی اور اپنے بھاری ڈیل ڈول کے ساتھ سلیکھا موسی فرش پر چاروں خانے چت ہوچکی تھیں۔ گرتے وقت انہوں نے غیر ارادی طور پر میز کا کنارہ تھامنے کی کوشش کی...... کنارہ تو ہاتھ نہیں لگا...... ہاتھ میں آیا گرما گرم چائے کا کپ......اور گرتے گرتے وہ نیچے اور گرم چائے کا کپ ان کے اوپر۔

"آہ مر گئی......" اور بھی الٹے سیدھے الفاظ ان کے منہ سے نکلنے لگے۔

سلیکھا موسی نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ اب ان کے منہ سے سمجھ میں آنے والے الفاظ بھی نہیں نکل رہے تھے۔ گرم گرم چائے ان کے منہ اور چھاتی پر گری تھی۔ وہ ایسے چلا رہی تھیں جیسے کوئی قصائی ان کے گلے پر چھری پھیر رہا ہو۔ سب لوگ اٹھ کر ان کی طرف دوڑے۔

"یہ نرجلی جو نہ کرادے وہ کم ہے۔" یہ چاچی کے الفاظ تھے حالانکہ ابھی بیچاری آشا پہ برسنے اور اسے ڈانٹنے کا کوئی موقع نہیں تھا سلیکھا موسی کا حال دیکھنا تھا۔ چاچا جی ڈاکٹر کو فون کرنے دوڑے۔ باقی لوگ کسی نہ کسی طرح موسی کو اٹھا کر ان کے کمرے کی طرف لے جانے لگے۔

وہ کیا کرتی۔ خاموش خاموش سی' کھوئی کھوئی سی ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی رہی۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سلیکھا موسی نے خود ہی نمکدانی اٹھانے کی کوشش کی تھی اور کرسی پیچھے کھسک گئی تھی اور وہ اس پر دھیان دینا بھول گئیں۔ آشا کو ان کے گرنے اور جل جانے کا بہت افسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اسے موسی کی بے تکی چیخوں پر ہنسی بھی آرہی تھی۔

☆ کچھ لوگوں کی خوشیاں پیڑ پر بیٹھے پرندوں کی مانند ہوتی ہیں۔ نہیں معلوم پرندہ کب اڑ جائے اور پیڑ کو داغ جدائی دے جائے۔

☆ خوشیاں بھی ساون کے بادلوں کی طرح ملتی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اور کہاں ملیں۔

☆ محبت نہ ملے تو انسان جی لیتا ہے لیکن جسے وہ محبت سمجھتا ہے اگر وہی شخص آپ کا مان نہ رکھے تو انسان ایسے ٹوٹتا ہے کہ پھر ریزے نہیں ملتے۔

☆ کسی کی تمنا اور آرزو کے نیچے اپنی ہتھیلیاں رکھنا آسان کام نہیں ہے۔ مگر جب یہ ہونے لگے تو اس سے اچھا کام کوئی نہیں کیونکہ دعاؤں اور وفاؤں کا پورا خزانہ ہاتھ لگتا ہے۔

☆ اگر اچھا دوست روٹھ جائے تو اس سے اس طرح ملئے جس طرح دوستی کے آغاز میں ملا کرتے تھے۔

☆ بددعا کبھی زبان سے نہیں دی جاتی بلکہ دکھا دل خود ایک بددعا کی گزرگاہ بن جاتا ہے۔

(عاصمہ گیلانی' ملک وال)

www.Paksociety.com

"غصہ آدمی سے ایسی ہی غلطیاں کرواتا ہے۔" اس کے منہ سے نکلا۔

اور اسی وقت اسے اپنے کان کے نزدیک ایک بھنبھناہٹ سی سنائی دی۔ "آپ کو تنگ کرنے والوں کو آپ کے غلام شمانہیں کریں گے۔ جو بھی آپ کے ساتھ برا سلوک کرے گا۔ ہم اس کا برا حشر کر دیں گے۔" وہ ڈر کے مارے اچھل پڑی۔

اس آواز کو سننے میں کسی دھوکے کا امکان نہیں تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ کوئی اس کے کان کے ایک دم پاس سے بہت دھیمی مگر واضح لہجے میں بولا ہے تھا جسے اس نے صاف صاف سنا تھا۔ آواز بھی وہی تھی جو اس نے رات کو اپنے غلام کے منہ سے سنی تھی۔ گھبرا کر اس نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔

وہ بالکل بچی اور معصوم ضرور تھی مگر گنوار یا کم عقل ہرگز نہیں تھی۔ مسلسل پیش آنے والی ان باتوں کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اور سب باتیں ایک ہی طرح کی تھیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ کوئی پراسرار شکتی لگا تار میری مدد کر رہی ہے۔" اس نے من ہی من میں نتیجہ نکال لیا۔

"لیکن یہ پراسرار سیوک ہیں کون؟" لگتا ہے جیسے کسی غیر مرئی قوت کی نظر کرم اس پر پڑ گئی ہے۔ برگد کے پیڑ کے پاس سے ملنے والا وہ من موہنا پتھر، وہ شکریہ کے بول، پھر رات کو دیکھی بھیانک شکلیں۔ ان کا دیا ہوا شربت اور پھر صبح میں بنا بنایا ناشتہ۔ یہ سب کیا ہے...... اس کا دل کانپ رہا تھا مگر اس کے ساتھ اس کے دل میں ایک انجانی سی خوشی کا احساس بھی تھا...... پتا نہیں یہ غیبی طاقتیں اس سے کیا چاہتی ہیں۔ کہیں اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔

کتنی ہی دیر تک وہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی رہی۔ اچانک چاچی جی کمرے میں آئیں......

"اب یہاں کھڑے کھڑے سوگ کیوں منا رہی ہے...... جاؤ خوشی میں ناچو...... گاؤ...... عیش کرو...... تمہارے دل کی خواہش جو پوری ہو گئی......"

ابھی ان کی باتیں پوری بھی نہیں ہوئی تھیں کہ آشا نے دیکھا کہ چاچی جی نے اچھلنا شروع کر دیا...... جیسے بے ڈھنگے پن سے وہ رقص بھی کر رہی تھیں اور "ارے ارے" گا بھی رہی تھیں۔

انہیں اس حالت میں اچھلتے دیکھ کہ اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"اری کم بخت...... جنم جلی...... دیکھ...... دیکھ تو سہی میرے کپڑوں میں کیا گھس آیا ہے......؟" اور آشا ان کی طرف دوڑی۔ وہ ان کے کپڑوں کو ٹٹولنے لگی تبھی کپڑوں سے ایک چھپکلی دھپ کر کے گری اور فرش پر دوڑنے لگی۔ چاچی جی کی چیخیں بھی سلیکھا موسی سے کم نہیں تھیں۔ وہ چھپکلی سے بہت ڈرتی تھیں۔ اور یہ خیال ہی ان کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا کہ ایک چھپکلی ان کے بدن پر رینگتی رہی ہے۔ ان کے چیخنے کی آوازیں اس کمرے تک پہنچ گئیں جہاں سلیکھا موسی کی خدمت ہو رہی تھی۔ موسی کو چھوڑ کر سب لوگ بھاگتے ہوئے ڈائننگ روم میں پہنچے۔ چاچی جی ابھی تک "اوئی اوئی" کر کے اچھل رہی تھیں۔

"کیا ہوا بھاگوان...... کیا ہوا؟" چاچا جی نے گھبرا کر پوچھا۔ چاچی جی پسینے میں لت پت ہو رہی تھیں۔ ہانپتے ہوئے بولیں۔

"بچ گئی...... آج تو بس بچ ہی گئی...... کچھ پتا ہے...... چھپکلی چڑھ گئی تھی کمر پر...... پھر کمر سے اوپر پیٹھ پر بھی...... بھگوان! اس بچی کو خوش رکھے۔ اپنی جان پر کھیل کر اس نے چھپکلی کو نکال بھگایا۔ نہیں تو آج نہ جانے کیا ہو جاتا۔"

چاچی جی ہانپتے ہوئے بیتی ہوئی گھٹنا کا احوال سنا رہی تھیں۔ آشا کو پتا نہیں کیوں زور سے ہنسی آ رہی تھی، جسے دوپٹے سے منہ ڈھک کر چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ویسے آشا کے اس بہادرانہ فعل سے اس کے متعلق چاچی جی کے خیالات میں بدلاؤ آ گیا تھا۔ چاچی جی کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ کوئی ان کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈالے۔

یہ سب احوال سن کر چاچا جی نے اطمینان کی سانس لی۔ کوئی بڑا حادثہ نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے چاچی جی کو سنبھالا اور انہیں سہارا دے کر سلیکھا موسی کے کمرے میں لے گئے جہاں موسی ادھ مری حالت میں پڑی تھیں۔

آشا کی طرف اب تک کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ اکیلی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"اگر چھپکلی والا واقعہ اتفاقی نہیں ہے تو پھر یہ یقیناً اس کے سیوک کی شرارت ہے۔" اس نے سوچا۔

اسے پورا یقین ہو چلا تھا کہ چاچی جی کے کپڑوں کے اندر چھپکلی خود بخود نہیں پہنچی تھی کیونکہ خود کو اس کا سیوک کہنے والا اسے بتا چکا تھا کہ اسے دکھ دینے یا ستانے والوں کو وہ پریشان کریں گے۔ اب چونکہ چاچی جی خواہ مخواہ ہی اس پر راشن لے دوڑی تھیں اس لیے ہو سکتا ہے سیوک نے انہیں ایک ہلکی سے سزا دی ہو۔

اس نے اپنے سر کو جھٹک کر سوچوں کے بھنور سے باہر آنے کی کوشش کی۔ یہ خیال ہی اسے عجیب لگ رہا تھا کہ بھیانک شکلوں والے خود کو اس کا سیوک بتا رہے ہیں۔

اس نے ناشتے کی میز کی طرف دیکھا۔ سلیکھا موسی پر آئی مصیبت نے سب کا ناشتہ بھی خراب کر دیا تھا۔ نا جانے گھر کے لوگ اب یہ ناشتہ کریں گے بھی یا نہیں۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ سیما اور نکیتا اندر آئیں۔ ایک دم خاموش...... گمبھیرتا لیے ہوئے۔ انہوں نے آشا کی طرف دیکھا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے نکیتا بولی۔

"تم تو جانتی ہو سلیکھا موسی تھوڑا سنکی ہیں۔ تھوڑا سا نمک ڈال دیتیں تو یہ مسئلہ ہی نہ ہوتا۔ ہمارا بریک فاسٹ بھی خراب کر دیا۔ اب پڑی پڑی ہائے ہائے کرتی ہوئی سب کو بور کر رہی ہیں۔"

"بس بھول گئی تھی...... لیکن اتنی دیر بھی تو نہیں ہوئی تھی...... ایک سیکنڈ میں نمک ڈالا جا سکتا تھا۔" آشا نے کہا۔

"تم نے بریک فاسٹ کر لیا؟" نہ جانے کیسے سیما کو اس کا خیال آ گیا۔

"ابھی نہیں، کر لوں گی۔" وہ دھیرے سے بولی کیونکہ وہ ہمیشہ کچن میں ہی ناشتہ کرتی تھی۔ آج تک کسی نے اسے اس لائق سمجھا ہی نہیں تھا کہ اسے اپنے ساتھ ناشتہ کرایا جائے۔

"آؤ...... ہمارے ساتھ ہی بریک فاسٹ لے لو......" سیما نے کہا لیکن وہ اپنی حیثیت میں رہنا چاہتی تھی۔ سیما کے دوبارہ کہنے پر بھی وہ ان کے ساتھ نہیں بیٹھی لیکن ان کے رویئے میں بدلاؤ اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

دونوں نے ناشتہ کر لیا تب وہ برتن سمیٹ کر ٹرالی میں رکھنے لگی اور پھر کچن کی طرف چل پڑی۔

یہاں پہنچ کر وہ حیرت سے جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئی (اچھلی نہیں) رات کے جھوٹے برتن جو ناشتے کے بعد اسے دھونے ہوتے تھے دھلے دھلائے چمچماتے ہوئے دیوار پر لگے شیلف میں سجا کر رکھے ہوئے تھے۔ کچن کے اور بھی جتنے کام تھے۔ وہ حیرت سے ان سارے کاموں کو دیکھتی رہی۔ اب تو وہم

www.Paksociety.com

ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ ڈر بھی محسوس کر رہی تھی اور تھوڑی خوشی بھی ہو رہی تھی۔ نہ جانے یہ سب کیا ہے۔ کیوں ہے؟

دوپہر کا کھانا بنانے کا ضروری سامان نوکر لے کر آتے تھے۔ وہ ابھی لائے نہیں تھے اس لیے فی الحال اسے ابھی کوئی خاص کام نہیں تھا۔ اس لیے وہ ناشتے کے جھوٹے برتنوں کو صاف کرنے لگی لیکن اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کسی غیبی طاقت نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی منمنائی سی آواز سنائی دی۔

''یہ سب کام اب آپ کے کرنے کے نہیں ہیں۔ ہم سیوک کب کام آئیں گے۔ مہربانی کر کے ہمیں شرمندہ نہ کریں۔''

وہ پھر خوفزدہ ہوگئی۔ اس کے ہاتھ نادیدہ ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہو چکے تھے۔ اس نے ڈرے ڈرے انداز میں بیسن کی طرف نگاہ کی۔ ارے..... اب وہاں ایک بھی برتن نہیں تھا۔ پلک جھپکنے کی مدت میں سارے برتن دھل کر اپنی اپنی جگہوں پر سیٹ ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''ہے بھگوان! یہ کیا ماجرا ہے؟'' اس کے منہ سے بڑبڑانے کی سی آواز نکلی۔ کچھ دیر وہ غائب دماغی کی حالت میں بیٹھی رہی پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کر کچن سے باہر آ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اب اتنا وقت وہ کہاں جا کر گزارے۔ اس کی تو روز کے کاموں کی ایک روٹین ہی بنی ہوئی تھی لیکن اب ان نئے حالات میں اس کی روٹین ساری کی ساری گڑبڑ ہو کر رہ گئی تھی۔ آج سے پہلے وہ ساڑھے نو بجے تک برتن دھو کر فارغ ہوتی تھی۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا تیار کرنے کا وقت ہو جاتا تھا اور وہ اس میں مصروف ہو جاتی تھی لیکن اب اس کے پاس کرنے کو کوئی کام ہی نہیں رہ گیا تھا۔ دوپہر کا کھانا تیار کرنے میں ابھی کافی وقت تھا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ انسانیت کے ناتے اسے بھی سلیکھا موسی کو دیکھنے جانا چاہئے۔ گرم چائے نے انہیں اچھا خاصا جھلسا جو دیا تھا اور وہ ابھی تک انہیں دیکھنے نہیں گئی تھی۔ یہ سوچتے ہی اس کے قدم موسی کے کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ گھر کے باقی افراد بھی ابھی تک اسی کمرے میں تھے' یہاں تک کہ اس حادثے کی وجہ سے چاچا جی بھی اب تک دفتر نہیں گئے تھے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر گھس آئی۔ ڈاکٹر نے سلیکھا موسی کے پورے چہرے پر کوئی کریم لگا دی تھی جس سے ان کا چہرہ چکنا اور چمکدار ہو رہا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں۔ انہوں نے نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کراہتی ہوئی بولیں۔

''اب جلے پر نمک چھڑکنے آئی ہے..... آہ..... اب کیوں اپنی منحوس شکل دکھا رہی ہے کرم جلی..... یہ سب تیری ہی وجہ سے ہوا ہے۔''

''موسی مجھے افسوس ہے۔'' اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ خود ہی کچھ جوش میں آ گئی تھیں سلیکھا جی!'' چاچا جی تو دل سے ہمیشہ اس کے طرفدار تھے۔ بس عملی طور پر یا ظاہری طور پر اس کا اظہار نہیں کر پاتے تھے۔ ''نمک آرام سے بھی ڈالا جا سکتا تھا..... اور پھر میں آپ سے ہمیشہ کہتا رہتا ہوں کہ چائے میں نمک نہ لیا کریں۔ صحت کے لیے مضر ہے۔'' چاچا جی نے کہا۔

''ہاں ہاں..... میں ہی بری ہوں' میں ہی غلطی پر ہوں' سب سمجھتی ہوں میں' آپ کا خون ہے نا جوش تو مارے گا ہی۔ اوہ..... ہاں وہ تمہاری بھتیجی ہے نا..... میں کون ہوں..... کوئی نہیں..... آپ کی پتنی کی بہن..... آپ کے ٹکڑوں پر پلنے والی..... ہائے!''

سلیکھا موسی ٹسوے بہاتے ہوئے بول پڑیں۔

''اب آپ بے مطلب ہی بات کا بتنگڑ بنا رہی ہیں۔'' چاچا جی جو مگر مچھ والے آنسوؤں سے سدا متاثر ہو جاتے تھے' گھبرا کر بولے۔

''اتنا ہی بوجھ بن چکی ہیں دیدی آپ پر..... اتنا ہی ناپسند ہے ان کا یہاں رہنا..... تو نکال دیجیے ہاتھ پکڑ کر انہیں..... آپ کے اور آپ کی لاڈلی بھتیجی کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جائے گی..... اس کو تو آپ کچھ نہیں کہہ سکتے نا۔'' چاچی جی کلکلا کر بولیں۔ ''جب سب کو پتا ہے کہ یہ چائے میں نمک ڈال کر پیتی ہیں تو ان کی اس بات کو یاد کیوں نہیں رکھا جاتا۔'' چاچی جی سے بہن کے آنسو برداشت نہیں ہو سکے اور وہ ان کی حمایت میں پھوٹ پڑیں۔

''اوپر والے سے ڈرو بھاگوان..... میں نے کچھ کہا بھی تو ہو انہیں۔'' چاچا جی دوطرفہ حملے سے پریشان ہوا ٹھے۔

''کلیجے میں چھید کر دیتے ہو اور کچھ کہا بھی نہیں..... واہ!'' موسی کے من کا پھپھولا کم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔

''ارے میں اس کلموہی کی وجہ سے نہیں جلی کیا۔'' ابھی موسی کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ جانے کہاں سے ایک چڑیا اڑتی ہوئی آ کر پیتل کے بنے لمبے گلدان پر بیٹھ گئی جو سلیکھا موسی کے سرہانے کے ٹھیک اوپر تھا۔ چڑیا پھر سے اڑی اور بھاری گلدان کی تان موسی کے سر پر آ کر ٹوٹی۔

''ارے ارے..... ہائے ہائے..... مر گئی' مر گئی۔ ارے ہاں..... مر گئی..... مر گئی۔'' سلیکھا موسی دھاڑیں اور سب لوگ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ موسی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ہے لا..... وہ لا..... کا شور ایک بار پھر مچا ہوا تھا۔

''نکل جا منحوس یہاں سے..... کیا میری بہن کی جان لے کر ہی دم لے گی.....؟'' چاچی جی اپنے جوش میں آشا کی طرف بڑھیں۔ ان کا ارادہ شاید اسے دھکے دے کر باہر نکالنے کا تھا..... پر یہ کیا..... ایک زوردار دھم کی آواز کے ساتھ ہی وہ پیر چھونے کے انداز میں آشا کے قدموں کے پاس گری دکھائی دے رہی تھیں۔ نہ جانے ان کے پاؤں کس چیز سے الجھ گئے تھے۔ چاچی جی کی کلائیوں کی ساری چوڑیاں ٹوٹ چکی تھیں ان کے ہاتھوں کو زخمی کر چکی تھیں۔

''ہائے ممی.....'' سیما اور نکیتا سلیکھا موسی کو چھوڑ کر ماں کی طرف دوڑیں جبکہ چاچا جی سوچ میں کھوئے جہاں کے تہاں کھڑے رہے۔ آشا نے ان کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں کیوں آج ان کے چہرے کے تاثرات کچھ الگ طرح کے دکھائی دے رہے تھے۔

''اب بھی وقت ہے..... تم لوگ سنبھلو' کچھ غور کرو ان گھناؤں پر جو لگاتار یہاں گھٹ رہی ہیں۔ نردوش اور معصوم کا رکھوالا بھگوان ہوتا ہے۔ تم دونوں بہنوں نے دو دو بار آشا کو دکھ دینے کا سوچا اور دونوں کو دو بار نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر اب بھی آپ لوگ نہیں سدھریں تو اس کے انجام کی ذمہ داری تم دونوں بہنوں پر ہوگی۔'' چاچا جی نے سخت لہجے میں انہیں تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ اسی وقت ایک نوکر اندر آ کر بولا۔

''صاحب ایک آدمی باہر آیا ہوا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ ڈرائیور کی نوکری کا اشتہار پڑھ کر آیا ہے نوکری کے لیے۔''

''آؤ آشا!'' چاچا جی نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑے باہر کی طرف بڑھے۔

''ارے میری بہن بے ہوش ہو گئی ہے' ڈاکٹر کو بلاؤ۔'' چاچی جی اپنا درد بھول کر سلیکھا موسی کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔ سلیکھا موسی کے

سر سے بہتا خون اب ماتھے اور گالوں تک بہہ آیا تھا۔

"ڈاکٹر ہمارا نوکر نہیں کہ بار بار ہمارے گھر دوڑتا رہے۔ نوکر کو بھیج کر دوسرے ڈاکٹر کو بلوا لیجیے۔" چاچا جی نے کہا اور آشا کا ہاتھ پکڑ کر باہر آ گئے۔

آشا کو چاچا جی میں آئی اس تبدیلی پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے تو بھتیجی کے بارے میں صرف سوچ کر ہی رہ جاتے تھے۔ گھر میں ایکدم بھیگی بلی بنے رہتے تھے۔ مگر اس وقت انہوں نے جیسے کہ شیر کا روپ دھارن کر لیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ چاچا جی بھاری لہجے میں بولے۔

"آشا بیٹی! میری آنکھیں بند نہیں ہیں۔ میں تمہارے ساتھ ان لوگوں کا رویہ دیکھ رہا ہوں۔ کئی بار میں مجبور ہو جاتا ہوں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ پہلے تھوڑا اس آدمی سے نمٹ لوں جو ڈرائیور کی نوکری کے لیے آیا ہے۔" انہوں نے نوکر کو بلا کر ڈرائیور کو ڈرائنگ روم میں لانے کا کہا۔

ایکدم دودھ جیسا گورا رنگ، سنہرے بال، گہری نیلی آنکھیں اور اکھڑے بدن والا نوجوان بالکل عام سے کپڑے کی پینٹ شرٹ میں تھا۔ چہرے سے شرافت ٹپک رہی تھی۔ اندر آ کر اس نے نمستے کیا اور نگاہیں نیچی کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چاچا جی نے اسے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا اور سر کو ہولے سے جھٹک کر بولے۔

"بیٹھ جاؤ۔"

وہ پاس رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پڑھے لکھے ہو۔" چاچا جی نے انٹرویو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"کام چلاؤ ہوں صاحب۔ کچھ لکھ پڑھ لیتا ہوں۔"

"ڈرائیونگ لائسنس ہے؟"

"جی ہاں۔" اس نے جیب سے ڈرائیونگ لائسنس نکال کر میز پر رکھ دیا، چاچا جی اسے اٹھا کر دیکھنے لگے۔

"تم کتنی تنخواہ کی امید رکھ رہے ہو رودی کمار؟" اسے چپ دیکھ کر چاچا جی بولے۔ "دو تین باتیں میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں یہیں رہنا ہوگا...... ایمانداری شرط ہے...... اور تم اپنے کام سے کام رکھو گے۔"

"مجھے منظور ہے سر!"

"ہم چار ہزار روپے تنخواہ دے سکتے ہیں جبکہ کھانا پینا اور رہائش ہمارے ذمہ ہے۔ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"میں اکیلا ہوں سر!"

"کیا تمہیں ہماری سب شرطیں منظور ہیں؟"

"بڑی خوشی سے سر! جب کھانا پینا، کپڑا لتا، رہنے کی جگہ آپ دے ہی دیں گے تو مجھے زیادہ پیسوں کی کیا ضرورت ہے۔ چار ہزار بھی میری ضرورت سے زیادہ ہیں۔" اس نے کہا اور چاچا جی گردن ہلانے لگے۔

"ٹھیک ہے رودی! تم چاہو تو آج سے ہی کام پر آ سکتے ہو۔" چاچا جی نے کہا اور اس بار گردن ہلانے کی باری رودی کی تھی۔ اس نے ایک بار بھی آشا کی طرف نہیں دیکھا تھا...... لیکن آشا...... اس کے دل کی دنیا میں تو شاید بھونچال سا آ گیا تھا۔

اس نوجوان کے چہرے میں نہ جانے کیا بات تھی۔ آشا نے ایسا پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا جیسا اس کو ابھی لگ رہا تھا۔ اس کی اب تک کی زندگی بالکل سیدھے سادے انداز میں گزری تھی۔ اس میں نہ کوئی خاص جذبہ ابھرا تھا نہ کچھ احساس۔ اس نے خود کو اس

گھر کی دیواروں تک سمیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ زیادہ تر وقت تو کچن یا دوسرے لوگوں کی خدمت کرنے میں گزر جاتا تھا۔ اپنے کمرے میں تو وہ اس وقت جاتی تھی جب سارے لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے ہوتے تھے۔ فرصت کے لمحات تو بس گرمی کی دوپہروں میں ہی مل پاتے تھے۔ اس نے اپنی نیندوں میں آج تک کسی حسین خواب کو جگہ نہیں دی تھی۔

آج رودی کو دیکھ کر اس کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے احساس جنم لے رہے تھے جن کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

چاچا جی نے ایک نوکر کو بلا کر کہا کہ رودی کو ڈرائیور والا کوارٹر دکھا دو اور اس کی ضروریات کا سامان اسے پہنچا دو۔

اس کے جانے کے بعد چاچا جی آشا سے بات کرنا چاہتے تھے تبھی چاچی جی آندھی کی طرح ڈرائنگ روم میں وارد ہوئیں اور آشا کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"تم جاؤ مجھے کچھ بات کرنی ہے۔"

اس نے چاچا جی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔ ویسے بھی وہ خود وہاں سے ہٹنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس وقت تنہائی میں رہنا چاہ رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر سوچوں کے بھنور میں تھی۔ نہ جانے کیا ہو رہا ہے...... نہ جانے کس طرح کے دن گزر رہے ہیں...... اور رودی...... وہ ڈرائیور تو کہیں سے نہیں لگ رہا تھا...... اتنا دمکتا چہرہ کسی ڈرائیور کا ہوا ہے بھلا...... اس کا دل اسے ڈرائیور مان ہی نہیں رہا تھا۔

"اوہ! میں کیوں اس کے بارے میں اتنا سوچ رہی ہوں۔" سر جھٹک کر وہ ان چنچل اور نٹ کھٹ سوچوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ سیدھی کچن میں پہنچ گئی۔ ایک بار پھر وہ اچھل پڑی۔

چولہوں پر برتن چڑھے ہوئے تھے۔ کھانا لگ بھگ تیار لگ رہا تھا حالانکہ ابھی صرف گیارہ ہی بجے تھے۔ اس نے سبھی ہانڈیوں کو کھول کر دیکھا بڑی اچھی خوشبو آ رہی تھی۔

ابھی وہ جن پریشانیوں کا شکار تھی اس کی وجہ سے وہ ناشتہ کرنا بھی بھول گئی تھی۔ خوشبودار اور ذائقہ دار کھانوں کو دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی۔ وہ گھر کے بچے کھچے ناشتے کی طرف بڑھی یہ تو اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے ڈھکی ہوئی پلیٹیں کھولیں اور پھر ٹھٹک گئی۔

پلیٹوں میں رکھا ناشتہ بالکل تازہ اور گرم تھا جبکہ اب تک اسے خراب ہو جانا چاہیے تھا۔ وہی غیبی غلام...... وہی عجیب و غریب غلام......

"ہاں......!" ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس نے ناشتہ کرنا شروع کیا اور پھر حیران رہ گئی۔ اتنا لذیذ ناشتہ اس نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

"ہے بھگوان......! اتنی مہربانی...... اتنا مان...... میں کیسے سمیٹوں؟" وہ سوچنے لگی۔ ایک بار پھر رودی چور دروازے سے اس کے ذہن میں در آیا۔ وہ ان خیالات کو جھٹکنے لگی۔ اس گھر میں برپا ہونے والی محفلوں میں وہ کتنے ہی خوبصورت نوجوانوں کو دیکھ چکی تھی مگر کبھی ایسا نہیں ہوا جواب ہو رہا تھا۔ خود سیما کا رشتہ جس سے طے ہو رہا تھا وہ بھی بہت خوب صورت اور سجیلا جوان تھا حالانکہ ایسے مہمانوں کے آنے پر اسے سامنے آنے سے روک دیا جاتا تھا۔ انہیں ڈر لگا رہتا تھا کہ آشا کی خوب صورتی کو دیکھتے ہوئے کہیں سیما کا رشتہ مسترد نہ کر دیا جائے جبکہ آشا تو دل سے سیما کو اپنی بہن مانتی تھی۔ اسے شوق تھا کہ وہ سیما کے ہونے والے شوہر کو ایک بار دیکھے۔ اس شوق کی وجہ سے اس نے چھپ کر سیما کے منگیتر کو دیکھ لیا تھا۔ اسے

www.Paksociety.com

وہ بہت اچھا لگا تھا مگر صرف سیما کے ہونے والے شوہر کے طور پر، اس کے علاوہ اس کے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں تھا مگر یہ ڈرائیور روی......! اس کی نیلی آنکھیں کتنی سندر ہیں۔ ایک الگ ہی کشش ہے ان میں۔ ایک مقناطیسی کشش۔ بے چارہ نہ جانے کن حالات کا شکار ہے۔ پتا نہیں ناشتہ بھی کیا ہوگا یا نہیں۔

اس طرح کی بے لگام سوچوں سے وہ خود ہی شرما گئی اور اس کے گال سندوری ہوگئے۔ اس نے اپنی سوچوں کو دوسری جانب موڑنے کی کوشش کی۔ کتنی کوشش کررہی تھی کہ روی کے بارے میں نہ سوچے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ایک بار پھر سب اپنے اپنے کمروں میں جا گھسے تھے۔ آج گھر کی فضا میں ایک تناؤ سا تھا۔ چاچا جی بھی آفس نہیں گئے تھے۔ لگتا تھا چاچی جی سے ان کی اچھی خاصی کھٹ پٹ ہوئی ہے۔ کھانا بھی سبھی نے اپنے اپنے کمروں میں ہی کھایا تھا پھر سب کے دروازے بند ہوگئے اور وہ بھی اپنے کمرے میں جا گھسی۔ دیر سے ناشتہ کرنے کی وجہ سے اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ وہی گرم دوپہر...... اور دوپہر کے خیال سے اسے وہ پتھر یاد آ گیا۔ پتھر اسی جگہ موجود تھا جہاں وہ اسے چھوڑ گئی تھی۔

اس نے بڑی چاہت سے پتھر کو اٹھایا اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ کتنا پیارا پتھر ہے...... وہ اس کا کیا کرے...... کیوں نہ لاکٹ میں جڑ دالے اور ہر وقت پہنے رہے لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اگر وہ اسے پہنتی تو گھر والے اس کی بوٹیاں نوچ ڈالتے۔ چلو پھر اپنے کمرے میں ہی ماں کے جوڑے کے ساتھ پہن لوں گی پر یہ لاکٹ بنے گا کیسے...... کس سے بنوائے گی...... کون بنوا کر دے گا...... اس کا ہے کون...... کون...... کوئی بھی تو نہیں ہے...... آہ......

لاکٹ کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ کبھی مسکراتی کبھی اداس ہوجاتی۔ اسی ادھیڑ بن میں وقت گزرتا رہا اور وہ بستر پر لیٹی رہی۔ اس کی سوچیں تھیں اور وہ تھی۔ تنہائی میں یہ بے سر پیر کی سوچیں ہی اس کی ساتھی تھیں۔ یہ سوچیں اسے کبھی رلاتی تو کبھی ہنساتی بھی تھیں۔

تبھی اس کا دل برگد کے پیڑ کے پاس جانے کو مچلنے لگا۔ کل کا واقعہ فلم کی طرح اس کے دماغ میں چل رہا تھا۔ پتا نہیں آج بھی کوئی انہونی ہوجائے۔ اب اسے ان پراسرار باتوں سے کوئی پریشانی نہیں ہورہی تھی۔ تمام واقعات اتنی سرعت سے پیش آئے تھے کہ وہ ایک ہی دن میں ان باتوں کی عادی ہوگئی تھی۔

وہ بستر سے اٹھی۔ وہ برگد کے پیڑ کے پاس جانے کے لیے تیار تھی۔ ایک ہلکا سا ڈر بھی محسوس کررہی تھی اور دل بھی چاہ رہا تھا۔ اسے اپنے سیوک یاد آ گئے۔ کتنے بھیانک لگتے تھے۔ پر انہوں نے اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ انہوں نے تو ہر قدم پر اس کی مدد ہی کی تھی۔

ہر کٹھن وقت پر وہ نہ صرف اس کی مدد کررہے تھے بلکہ اسے دکھ پہنچانے والوں کا دماغ بھی درست کر رہے تھے۔

پھر اسے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو اس کے ہمدرد ہیں۔ اس سوچ نے اسے ہمت دلائی اور وہ دروازہ کھول کر اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔

باہر وہی چلچلاتی دھوپ تھی۔ چہرے پر گرم ہوا اور تپش محسوس ہوئی، چہرہ جیسے جھلس رہا تھا۔ تبھی اسے اپنے اوپر کسی چیز کی پرچھائیں دکھائی دی جیسے کوئی بادل کا ٹکڑا انہیں سایہ دیتا ہے۔

ایک پل کے لیے اس نے اپنی نظر اوپر آسمان کی طرف اٹھائی...... اف...... آسمان پر بادلوں کا تو کہیں

نام و نشان تک نہیں تھا۔ پھر بھی کھلے آسمان کے نیچے وہ سائے میں تھی۔ اوپر تو کوئی چیز نہیں تھی۔

''اوہ...... وہی غیبی غلام......'' اس نے سوچا۔ ''وہ میرا کتنا دھیان رکھتے ہیں۔''

اور وہ دل ہی دل میں ان کے احسانوں کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

اب وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ سایہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے لیے اب اس کے دل میں کوئی ڈر یا پریشانی نہیں تھی۔

کبھی تیز کبھی دھیمے قدم اٹھا کر اس نے آزمایا لیکن سایہ ہر وقت ساتھ ہی رہا۔

پھر وہ سکون سے اس سایہ کے نیچے چلتی ہوئی برگد تک پہنچ گئی۔ مالی کی کھاٹ ویسے ہی پڑی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

تب اس کی نگاہ برگد کے دوسری طرف گئی۔ پیڑ کی جڑ کے پاس منہ دوسری طرف کیے کوئی بیٹھا تھا۔

''مالی بابا......!'' اس نے آواز دی اور بیٹھا ہوا آدمی مڑا...... اسے دیکھا اور جلدی سے اس کے سامنے آ گیا۔

آشا کا دل زور سے دھڑکنے لگا...... بلکہ اور تیزی سے دھڑکنے لگا...... وہ روی تھا۔

''آپ؟'' گھبراہٹ میں اسے اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

''میرا نام روی ہے چھوٹی مالکن۔'' اس نے ادب سے کہا۔ اس کی نیلی آنکھوں سے محبت کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

''چھوٹی مالکن۔'' وہ بے آواز بڑبڑائی۔ من ہی من ہنسی بھی آئی۔ ''پر اسے کیا پتا۔ کون بڑی اور کون چھوٹی ہیں۔''

اپنی لوگوں سے بات کرنے کی اسے شاید ہی کبھی ضرورت پڑی تھی۔ گھر کے سبھی نوکر بہت پرانے تھے جنہیں وہ بچپن سے جانتی تھی۔ روی کو بالکل سامنے پا کر اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چھلک آئیں۔ اسی ہڑبڑاہٹ میں وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''آپ کو بے چینی ہورہی ہے...... میں چلا جاؤں؟'' اس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے روی نے کہا۔

آشا کا حلق سوکھ رہا تھا۔ منہ سے کوئی الفاظ نہیں پھوٹ پا رہے تھے۔ عجیب بے چینی سے کبھی دائیں کبھی بائیں دیکھ رہی تھی۔ اس حالت میں وہ ایکدم دل میں اتر جانے کے لائق لگ رہی تھی۔

''کوارٹر کی چھت تپ رہی تھی اس لیے پیڑ کے نیچے چلا آیا۔'' اپنی یہاں موجودگی کے بارے میں وہ صفائی دے رہا تھا۔

''میں جارہا ہوں...... آپ اطمینان سے بیٹھیے۔'' آشا کو پھر بھی کچھ نہ بولتے دیکھ کر اس نے کوارٹر کی طرف جانے کے لیے قدم بڑھائے اور وہ جلدی سے بول پڑی۔

''رکو...... مت جاؤ...... بیٹھو...... کوئی حرج نہیں......'' نہ جانے کیسے وہ بول گئی۔ روی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''شکریہ۔'' وہ مسکراتے ہوئے وہیں نیچے بیٹھ گیا۔

اور وہ...... وہ تو پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھنے لگی۔ یہ ''شکریہ'' اس شکریہ سے تھوڑا بھی الگ نہیں لگا تھا جو ایک دن پہلے کی انجانی آواز میں سنائی دیا تھا لیکن پھر اس نے سر جھٹک دیا۔

''عجیب شکی ہوتی جارہی ہوں میں بھی۔'' اسے اپنی بے تکی سوچوں پر غصہ بھی آرہا تھا۔ نہ جانے وہ اتنی بے وقوف کیوں ہوتی جارہی ہے۔

''میرا نام آشا ہے۔''

www.Paksociety.com

”بڑا ہی سندر نام ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”تم نے کھانا کھایا......“ کچھ اور نہ سوجھا تو پٹ سے یہی سوال داغ دیا۔

”مجھے معلوم نہیں یہاں کھانا کون دیتا ہے۔“

”ارے......اوہ......اس کا مطلب ہے کہ تم ابھی تک بھوکے ہو؟“

سدا کی کومل دل والی اتنی سی بات سے تڑپ اٹھی۔

”میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے جیا لمبے سے بیروزگار ہوں۔ دوپہر میں شاید ہی کبھی کھا پاتا ہوں۔ عادت سی ہوگئی ہے۔“

اس نے کہا اور آشا کے دل میں ہمدردی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس کی دکھ بھری کہانی نے اسے ایک دم سے دکھی کر دیا تھا۔ اسے اس کا دکھ بھی اپنا سا لگا۔

”آؤ......آؤ...... میں بہت شرمندہ ہوں...... میرے ساتھ آؤ۔“

”آپ کہاں تکلیف کریں گی چھوٹی مالکن!“

”پھر مالکن......! میں آشا ہوں اور بس......آؤ۔“ اس نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہمدردی کی لہر میں آشا موجودہ صورت حال کو بھول گئی تھی۔ وہ ایک اجنبی نوجوان سے بلا جھجک بات کر رہی تھی اور اسے کھانا کھلانے ساتھ لے جا رہی تھی۔

اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ بھوکا ہے اور آشا کی ہمدردیاں پانے کے لیے یہی کافی تھا۔

اسے ساتھ لے کر کچن میں آئی اور پھر اسے کھانا نکال کے دیا۔ کچن میں کوئی ایسی ڈھنگ کی جگہ نہیں سوجھی جہاں اسے بٹھا سکتی۔ اس لیے کھانا ٹرالی میں رکھ کر ٹرالی کو دھکیلتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

وہ پہلا غیر مرد تھا جسے وہ بے دھڑک اپنے کمرے میں لے آئی۔ کھانا میز پر سجا کر اس نے روی کی طرف دیکھا۔

”آپ نے بھی کھانا نہیں کھایا ہے آشا جی۔“

”تمہیں کیسے پتا؟“

”تھوڑا پڑھا لکھا ہوں‘ آپ کا چہرہ پڑھ کر بتا رہا ہوں۔“

”میں نے ناشتہ دیر سے کیا تھا۔“ یہ بھی دوسروں کا کتنا خیال رکھنے والا ہے‘ اس نے من ہی من میں سوچا۔

”چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مالک نوکر کا لحاظ بھی ہے مجھے لیکن پتا نہیں کیوں یہ خواہش میرے دل میں ابھری ہے کہ میں آپ کو بھی کھانے میں شریک ہونے کے لیے کہوں۔“

اس کے بلاوے کا انداز اتنا پیارا اور من موہنا لگا آشا کو کہ وہ ٹھکرا نہ سکی اور کرسی لے کر میز کی دوسری جانب اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

نہ جانے یہ کون سا جذبہ تھا کہ یکا یک اجنبی پن کی سب دیواریں گرتی لگ رہی تھیں ورنہ وہ تو لجائی شرمائی سی خود میں سکڑی سمٹی سی رہنے والی دوشیزہ تھی۔

کھانا کھانے کے بعد بھی کچھ دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ اس کے بارے میں پوچھتی گئی اور وہ گول مول جواب دیتا گیا۔

دیوار پر لگے گھڑیال نے گھنٹہ بجا کر اسے چونکا دیا اور وقت کا احساس کر کے وہ پریشان ہوگئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”ارے......اوہ......اب تم جاؤ۔“ اس کی میزبانی کے آداب بکھر گئے۔ ”اگر کسی نے دیکھ لیا تو موت ہی آ جائے گی۔“

روی زیرلب مسکرا رہا تھا۔ مالکن تھی مگر آنکھوں کے راستے سیدھا دل میں اترتی جا رہی تھی۔ ابھی کیا‘ وہ تو جانے کب سے اس کے دل پر راج کر رہی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں آشا جی...... آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ اس کی پریشانی کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”میں ہوں نا...... کھانا بہت لذیذ تھا‘ شکریہ!“ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

ہر ”شکریہ“ پر اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا پھر اس کے میں ہوں نا کہنے پر مسکرا دی۔ تم بہت اچھے ہو روی۔ پر تم بھی میرے لیے کیا کر سکتے ہو۔ جس دن چاچی جی اور سلیکھا موسی سے مڈبھیڑ ہوگی نا تو بس ”میں ہوں نا“ کا لفظ ”میں نہیں ہوں“ میں بدل جائے گا۔

معصوم سی آشا اپنے معصوم دل میں یہی سوچ سکتی تھی۔ دنیاداری کی باتوں‘ چھل کپٹ اور ڈپلومیٹک باتوں سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ تو خود کو دکھ دینے والی چاچی جی‘ سلیکھا موسی‘ سیما اور نکیتا کو بھی تکلیف میں دیکھ کر دکھی ہو جاتی تھی اور انہیں خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہو جاتی تھی۔

آشا بے سدھ سی پلنگ پر لیٹ گئی اور ایک بار پھر خیالوں میں کھو گئی۔

”یہ کیا ہوگیا...... یہ اسے کیا ہو گیا تھا۔ کچھ بھی ہو وہ تو اجنبی ہے نا۔“ لیکن اس کا دل چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ ”نہیں! وہ اجنبی نہیں ہے......وہ تو......وہ تو......“

اور ایک دلکش سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے دل کی دھڑکنوں کو جانچنے لگی۔

پھر دوسرے ہی پل اس کے چہرے کو اداسی نے گھیر لیا تھا۔ ایسی ہی تھی یہ آشا...... خوشی اور اداسی...... یہ دونوں ہی اس کی تنہائی کی ساتھی تھیں۔ اس کے یہ دونوں احساسات ایک دوسرے کے ایسے دشمن تھے کہ ایک کے آنے پر دوسرا بھاگ جاتا تھا۔

”مگر وہ ایک ڈرائیور ہے...... صرف ڈرائیور......! اس سے اتنی دیر باتیں کیں...... پر اس نے کچھ بھی تو نہیں بتایا اپنے بارے میں...... کون ہے...... کہاں سے آیا ہے......“ اس کا ذہن اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا۔ وہ اسی ذہنی کشمکش میں مگن رہی اور اس کشمکش میں بھی اسے سکون مل رہا تھا۔ ایسے میں وقت گزرنے کا احساس کسے ہو پاتا۔ پلنگ پر لیٹی ہی تھی کہ آنکھ لگ گئی۔

پتا نہیں کیسے وہ پھر جاگ گئی۔ لگا کہ کسی نے اسے جگایا ہو۔ گھڑیال کی طرف دیکھا تو پانچ بجنے ہی والے تھے۔

”ارے......“ اس کا دل فکر سے دھڑک اٹھا۔ ”صبح تو بچ گئی تھی لیکن لگتا ہے اب شامت ضرور آئے گی۔“

ہانپتی کانپتی کچن میں پہنچی۔ ٹرالی‘ چائے اور شام کے ناشتے سے بجی ایک دم تیار تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے دیوار کے سہارے ٹک کر لمبی سانسیں لینے لگی۔

”اے میرے اچھے بھگوان! اے میرے کرپالو ایشور...... یہ سب کیا ہے...... میں اتنا پانے کے لائق کب تھی؟ میرے مددگار...... میرے غیبی ہمدرد میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔“

وہ ٹرالی دھکیلتی ہوئی کچن سے نکل آئی۔ آج سب لوگ ڈائننگ روم میں جمع تھے۔

سلیکھا موسی کو بھی صبح سے کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا‘ اس لیے وہ بھی اپنی ساری تکلیفوں کو بھلا کر یہاں براجمان تھیں۔

اس وقت آشا‘ سلیکھا موسی کی چائے میں نمک ڈالنا نہیں بھولی تھی۔

چائے پیتے ہوئے چاچا جی بولے۔

”آشا بٹیا! وہ نیا ڈرائیور ہے نا...... اسے بھی چائے وغیرہ دے دینا۔“

سب کے چائے پی لینے کے بعد کچن میں آ کر آشا نے چائے اور دوسرا سامان ایک ٹرے میں رکھ کر کسی نوکر کو تلاش کیا۔

www.Paksociety.com

جب کوئی نہیں ملا تو وہ خود ہی ٹرے اٹھا کر سرونٹ کوارٹر کی طرف چل پڑی۔

یہ کام بھی آج پہلی بار ہو رہا تھا اس سے۔ نا جانے کس دھن میں بنا سوچے سمجھے کئی حرکتیں اس سے ہو رہی تھیں۔ شام ہو چکی تھی۔ دھوپ میں بھی کچھ کمی آ گئی تھی لیکن گرمی میں ابھی بھی کمی نہیں آئی تھی۔ مگر کچن میں رہتے رہتے وہ اب گرمی کی عادی ہو چکی تھی۔

اس کے گورے چہرے پر گرمی سے لالی چمک رہی تھی اور اس کا چہرہ ای کدم لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ روی کے کوارٹر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ ایک کھاٹ پر بیٹھا گرمی کا مزا لے رہا تھا۔

آشا کو اچانک دروازے پر ٹرے لیے کھڑا دیکھ کر نہ تو وہ چونکا اور نہ ہی کسی حیرت کا اظہار کیا۔ بس ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے وہ آشا کا استقبال کر رہا تھا۔

''کیسا ہے یہ روی؟ اسے میرے آنے پر کوئی حیرت نہیں ہوئی؟'' اس نے سوچا پھر اس کی مسکراہٹ سیدھی دل لوٹنے والی۔

''آشا جی آپ؟''

''ہاں! مجبوری تھی، کوئی نوکر ملا نہیں نا اور چاچا جی کا حکم۔'' اس نے روی کی شرارت بھری نظروں سے بچتے ہوئے صفائی دی۔

''نوکر ملتا بھی کیونکر......'' وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

''کیا......کیا کہا تم نے؟''

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ بے کار تکلیف کی آپ نے......مجھے ان سب کی اتنی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''کیوں......! تم انسان نہیں بھوت ہو گیا؟'' وہ کھسیا کر بولی۔

وہ تو اس سڑی گرمی میں روی کے لیے کتنے پیار سے یہ سب لائی تھی اور یہ......ہونہہ......ضرورت نہیں ......بن رہا ہے۔

''ٹھیک ہے تو میں جاتی ہوں......تم یہ گرم ہوا پیتے رہو۔''

وہ واپسی کے لیے مڑی، تبھی اس نے جلدی سے کہا۔

''رکیے! رک جائیے آپ تو غصہ کرنے لگیں۔''

''ہی ہی ہی......اب آیا نا راستے پر......'' اور اب مسکرانے کی باری آشا کی تھی۔

......☆☆☆......

پھر کئی دن ایسے ہی بیت گئے۔ کوئی ایسا ویسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس بیچ اتنا ضرور ہوا تھا کہ روی نے اپنے ہنس مکھ رویے اور سب کے لیے ''ہر وقت حاضر'' کی وجہ سے اس گھر میں اپنی پوزیشن مضبوط بنائی تھی۔

ایک ڈرائیور ہونے کے باوجود سب کے باقی دوسرے کاموں کے لیے خود کو وقف کر چکا تھا۔ پتا نہیں کیسا تھا وہ، اسے کسی کام کو انجام دینے میں زیادہ وقت نہیں لگتا تھا، یوں جانو کہ پلک جھپکتے پورا کام کر دیتا تھا۔

سلیکھا موسی اور چاچی جی تک اس کی تعریف کرنے لگی تھیں۔

اس دن تو آشا بھڑک اٹھی جب اس نے روی کو سیما کے ساتھ باہر نکلتے دیکھا۔ روی کوئی چٹکلہ سنا رہا تھا اور سیما ہنستی ہوئی لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

''ہونہہ......! سب ایک جیسے ہیں......کیسے دانت نکال رہا ہے......'' حالانکہ وہ جانتی تھی کہ سیما کالج جا رہی ہے اور وہ اسے چھوڑنے جا رہا ہے۔

''چھی......! اتنا بھی ہنستا ہے کوئی......''

اسے پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ایسی تو کبھی نہیں تھی۔ کوئی کچھ بھی کرے اسے کوئی مطلب نہیں رہا کرتا تھا۔

......☆☆☆......

''اری آشا......'' موسی کی کرخت آواز پر وہ ہڑبڑا کر باہر نکلی، دروازے کے پاس سے پلٹ کر واپس تیزی سے لوٹی، چولہا بند کیا، پھر تیزی سے باہر آ کر بولی۔

''جی موسی جی!''

''جی کی بچی! جا دوڑ کر بچے کے لیے شربت بنا کے لا......اتنی دھوپ میں میرے لیے بازار سے ٹھنڈا تیل لے کر آیا ہے۔''

''بچہ؟'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ تبھی موسی کے پیچھے سے ایک دم تر و تازہ شکل لیے مسکراتا ہوا روی نمودار ہوا۔

''اوہ......! یہ بچہ...... ہر وقت دانت باہر نکلے رہتے ہیں اس کے تو۔''

''سنا نہیں کیا نالائق! کھڑی کھڑی کیا بڑبڑا رہی ہے......اف......''

پتا نہیں کیوں یہ چھوٹے پرندے موسی کے دشمن بن گئے تھے۔ ایک چھوٹی سی چڑیا تیزی سے اڑتی ہوئی آ کر ان کے چہرے سے ٹکرائی پھر اڑتی ہوئی باہر غائب ہو گئی۔

ایک طرف سے روی اور دوسری طرف سے آشا موسی کو پکڑ کر اندر لے گئے اور بستر پر لٹا دیا۔ چہرے پر پہلے سے موجود زخم پر وار ہوا تھا۔

سلیکھا موسی اب ڈری ڈری نگاہوں سے آشا کو تاک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی لہر صاف بڑھتی جا رہی تھی۔ گھر کے دوسرے لوگ پتا نہیں کہاں تھے۔

''میں شربت بناتی ہوں۔''

اپنے غیبی سیوکوں کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ کچن میں آ گئی۔ وہاں شربت گلاس میں تیار رکھا تھا۔ وہ گلاس اٹھا کر باہر نکلنے کو پلٹی تھی کہ سیدھا کسی سے ٹکرا گئی۔

پر اس ٹکراؤ میں اسے درد کم لذت زیادہ محسوس ہوئی۔ دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

اب بھی اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتا وہ ٹکرانے والا روی تھا۔ ایک اس کا اپنا تیز دھڑکتا دل اور دوسرا اپنی جادوئی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کھڑا روی! اس وقت تو اسے دونوں ہی برے لگ رہے تھے۔

گلاس کا آدھا شربت چھلک کر گر چکا تھا۔ روی شرارت سے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر باقی بچا شربت بھی پی گیا۔

''آپ جادوگرنی ہیں کیا آشا جی؟''

''کیوں؟'' اس کا اتنا نزدیک کھڑا ہونا اس پر خود ہی جادو کر رہا تھا۔ الٹی بات......

''اتنی جلدی میں اتنا مزیدار شربت کون بنا سکتا ہے......''

''اوہ......وہ......'' گھبرا کر بولی۔ ''وہ......وہ......میں نے فرج میں رکھا ہوا تھا بنا کر۔''

''تھوڑا اور ملے گا کیا؟''

اب کیا کروں......کیا کروں......اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ایک دوسرے پر ملتے ہوئے وہ فرج کی طرف گھومی۔ مرے مرے قدم اٹھا کر فرج تک پہنچی۔ فرج کا دروازہ کھولتے ہی وہ ایک بار پھر بری طرح سے چونک گئی۔

ایک برتن میں کافی سارا شربت بنا رکھا ہوا تھا۔

''میرے غیبی غلام۔''

......☆☆☆......

اکثر دوپہر میں اب وہ برگد کے پیڑ کی چھاؤں میں جا بیٹھتی۔ روی جب گھر میں ہوتا تب اکثر وہ بھی وہاں موجود رہتا۔ آشا کے سامنے جب بھی روی ہوتا وہ اس کی جھیل سی گہری نیلی آنکھوں میں خود کو ڈوبتا ہوا

محسوس کرتی لیکن اس کے حد سے زیادہ شرارتی انداز سے چڑ بھی جاتی تھی۔

روی سے باتیں کرنا اسے بہت اچھا لگتا تھا اور کیوں نہ لگتا۔ اب تک تو وہ دیواروں سے' آئینے سے اور خود سے ہی باتیں کرتی آئی تھی۔ پہلا موقعہ تھا جب کچھ دنوں سے روی سے باتیں کرنے لگی تھی
گھر کے دوسرے لوگوں سے تو بات کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ سب اسے صرف حکم دیتے تھے۔ کبھی کبھی سیما یا نکیتا اس سے دو چار باتیں کرلیا کرتی تھیں اور بس......

روی سے اس کا ایسا گھل مل کر باتیں کرنا ایسا تھا جس پر وہ خود بھی کتنا ہی سوچتی رہتی کہ کیوں ایسا ہے۔ وہ ایک نوکر ہے نوکر کے ساتھ اتنا میل جول۔

ایک دن کسی وجہ سے چاچا جی گھر پر ہی تھے اور گاڑی بھی گیراج میں کھڑی تھی۔ ہمیشہ کی طرح سب لنچ کے بعد اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ وہ بھی اپنے کمرے میں آ گئی لیکن پھر باہر آ گئی' برگد کے نیچے۔

یہ روی کہاں گیا؟ اس وقت وہ اپنے کوارٹر میں نہیں بلکہ اسی برگد کے نیچے رہتا تھا۔ وہ تھوڑی بے چین سی ہوئی' کہیں بیمار تو نہیں؟

یہ سوچنا تھا کہ وہ مزید بے چین ہوگئی۔ اٹھی اور کوارٹر کی طرف چل دی۔ اس وقت تیز دھوپ کا اسے بالکل احساس نہیں تھا۔

آج دروازہ بند تھا اندر سے۔ کھٹکھٹانے پر کھلا۔ وہ بال بکھیرے سامنے کھڑا تھا۔ آشا کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر وہی جان لیوا مسکراہٹ سج گئی۔ تبھی دھیمی آواز میں گنگنانے لگا۔

”دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے۔“

دھوپ سے تپی آشا اس کی اس حرکت سے پوری طرح تپ ہی تو گئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ' تیزی سے جھپٹی اور اس کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔

”سمجھتے کیا ہو تم۔ ہاں...... بولو...... کیا سمجھتے ہو تم خود کو...... بولو...... ہاں...... بولو۔“ اور وہ اس کے بازو پر اپنا ماتھا ٹیک کر ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

اس رویئے سے بوکھلایا روی کئی قدم پیچھے ہٹ چکا تھا اور وہ بھی اس کے ساتھ سسکتی ہوئی آگے بڑھ چکی تھی۔

”آشا جی...... آشا جی!“ وہ دھیمے لہجے میں آواز دے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کی منزل اس کے سینے سے چپکی کھڑی تھی لیکن وہ ہاتھ نیچے جھلائے کھڑا رہا۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ آشا سیدھی ہوئی' ایک پل کے لیے اس کا سراپا روی کے سامنے تھا۔ آنسوؤں سے تر چہرہ...... آنکھیں کتاب کی طرح کھلی...... کتنی ہی باتیں ان میں لکھی ہوئی تھیں۔ بس پڑھتے جائیے۔ دوسرے ہی پل وہ پلٹی اور دروازے سے باہر دوڑتی چلی گئی۔

وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ کر اپنی سانسوں کو سنبھالنے لگی' تب کمرے میں کسی کے در آنے کی آہٹ ہوئی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔

کھلے دروازے میں روی کھڑا تھا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ہر وقت کھیلنے والا کھلنڈرا پن غائب تھا۔ آشا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ قابو میں آئی دھڑکنیں پھر سے رفتار پکڑ چکی تھیں۔

وہ روی کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی جو کمرے میں رکھی ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

”آپ میرے کوارٹر میں کیوں آئی تھیں آشا جی! پھر ایسے بھاگ کیوں آئیں؟“

وہ بھلا کیا بتاتی۔ اسے خود کب پتا تھا' پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا جو آج کل اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ کچھ

پل دونوں خاموش رہے۔ پھر آشا اچانک بولی۔

”تم جاؤ...... یہاں کیوں آ گئے؟“ جبکہ اس کا دل اس کے الٹ کہنا چاہ رہا تھا۔

”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ روی کا اتنا سنجیدہ لہجہ اسے کچھ زیادہ پسند نہیں آیا۔ ہنستا مسکراتا روی' اس کے ساتھ ہلکی چھیڑ چھاڑ کرتا روی ہی اسے پسند تھا جبکہ اس کی یہ بات آشا کو کبھی کبھی غصہ بھی دلاتی رہتی تھی۔

”آشا جی...... ہم...... کون ہے یہ۔“ آشا دبی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ بس ایسی ہی تھی وہ۔ نٹ کھٹ...... نرل...... ایک پل میں اداس' دوسرے پل میں خوش۔

شرارتی روی کو سنجیدہ موڈ میں دیکھ کر پتا نہیں کیوں اسے ہنسی آنے لگی تھی۔

”آشا جی! چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن بولے بنا اب نہیں رہ سکتا۔“ اسے مسلسل گمبھیر لہجے میں بولتے دیکھ کر آشا بھی تھوڑی سنجیدہ ہوگئی اور دھیان سے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

”میں آپ سے پیار کرتا ہوں۔ آج سے نہیں۔ جانے کتنے دنوں سے۔“

اس صورت حال کی اسے امید نہیں تھی مگر اس دھماکے دار اظہار نے اسے چونکا دیا تھا۔

”کتنے دنوں سے کیسے......؟“

”یہ سب میں آپ کو آرام سے بتا دوں گا مگر آپ......“

وہ تو اب تک کچھ جانتی نہیں تھی۔ روی کے اظہار نے اس کے من میں کتنے ہی دیئے جلا دیئے تھے۔ جس تڑپ اور جذبے کو وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی وہ اچانک اس پر عیاں ہو چکا تھا۔ اب وہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پتا نہیں کمرے میں ادھر ادھر رکھے سامان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کیا ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جا کر روی کی طرف پیٹھ کر کے پتا نہیں کیا ٹھیک کرنے لگی تھی۔

”کیا آپ کی اس خاموشی کو میں آپ کا انکار سمجھوں۔“ کچھ پل بیتنے کے بعد روی بولا' ساتھ ہی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

تب آشا اس کی جانب مڑی اور وہ چونک کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

”رکو روی......“ وہ ہچکیوں کے ساتھ بولی۔ ”میں کیا کہوں...... میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ تم جب سے یہاں آئے ہو۔ جب سے پہلی بار تمہیں دیکھا ہے' تبھی سے میرے اندھیرے من میں تمہارے نام کا دیا جل رہا ہے...... میرا ہر احساس تمہارے نام سے مہکتا ہے لیکن میں کتنی مجبور ہوں' تم مجھے مالکن کہتے ہو...... جب کہ میری زندگی اس گھر کے نوکروں سے بھی بدتر ہے۔ تم نوکر ہو مگر تم اپنے نجی فیصلوں میں آزاد ہو۔ تم کہیں بھی آ جا سکتے ہو۔ لیکن میں...... میں بنا تنخواہ کے اس گھر کی نوکر ہوں جو اس گھر کی چار دیواری میں ایک قیدی سے بھی گئی گزری ہوں۔ میں اپنے بارے میں کوئی فیصلہ خود نہیں لے سکتی۔ پھر مجھے کب یہ حق ہے کہ میں کوئی سندر سپنا دیکھوں۔“

آشا کی باتیں سن کر روی کا کلیجہ پھٹنے جیسا ہو گیا۔ وہ ایک ٹک قدرت کے اس حسین نمونے کو دیکھے جا رہا تھا' جو اس وقت زخموں سے چور' نڈھال سی دکھائی دے رہی تھی۔

”تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ روی! یہاں تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ گھرانہ تمہیں کبھی تسلیم نہیں کرے گا۔ میں لاکھ یہاں نوکر سے بھی گئی گزری ہوں' مگر یہ

www.Paksociety.com

لوگ اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے ایک ڈرائیور سے مجھے نہیں جوڑنے دیں گے۔"

"آشا جی......"

"رکو......! پہلے آشا جی کہنا بند کرو پھر آگے بولو......"

"اچھا......تو آشا مجھے اوروں سے کچھ مطلب نہیں ہے' میں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں' مجھے کھل کر اپنی مرضی بتا دو۔ باقی معاملات میں اپنے نصیب پر چھوڑ دوں گا۔ اگر تمہاری رضامندی کے بعد بھی تمہیں نہیں پا سکا تو میں دوش نہیں دوں گا۔"

"میں......میرے لیے تم پہلے انسان ہو جو میرے اتنا قریب رہے......میں نے تمہیں بتایا نا کہ میری دنیا تمہی سے روشن ہے۔ میرے لیے تمہی سب کچھ ہو۔"

ایک بار پھر وہ سسک پڑی۔

روی جذبات میں بہہ کر آگے بڑھا اور آشا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ آشا اپنا منہ اس کے سینے میں چھپا کر سسک رہی تھی۔

"میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں روی! دیوانوں کی طرح پیار کرتی ہوں۔ میری دنیا میں تمہارے سوا رکھا ہی کیا ہے۔"

کتنے پل وہ دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں یوں ہی چپکے رہے۔ کتنا سکون مل رہا تھا انہیں۔

"میں ایک ابھاگن لڑکی ہوں روی! بھگوان نہ کرے جو میری بدنصیبی کی پرچھائیں بھی تم پر پڑے۔" اپنی سمجھ سے وہ روی کو کوئی نقصان نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

"تم یہاں سے نوکری چھوڑ دو روی! کہیں اور چلے جاؤ۔ ان لوگوں کو تھوڑا بھی شک ہوا تو تمہیں جینے نہیں دیں گے۔"

اس نے روی کو کس کر بھینچ لیا۔ روی کو اس کے بدن کی کپکپاہٹ اور اس کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ آشا کی ریشمی زلفوں کو چھیڑ رہا تھا اور دوسرا اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا۔

روی اپنا ایک ہاتھ آگے لایا اور آشا کے چہرے کو ہولے سے اوپر اٹھایا اور اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

"تم خود کو ابھاگن کیوں کہتی ہو آشا۔" اس کے لہجے میں تو بس پیار ہی پیار تھا۔

"تم ان لوگوں کو نہیں جانتے روی!"

"یہ سب لوگ مجھے نہیں جانتے آشا......"

آشا نے چونک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

روی کی آنکھوں میں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا' ایک عجیب سا اعتماد تھا ان نیلی آنکھوں میں' یہ نیلی آنکھیں تو اس پر جادو سا کر دیتی تھیں۔

"تم اب اپنی ساری پریشانیوں کو بھول جاؤ۔ مجھ پر یقین رکھو میں سب ٹھیک کر لوں گا۔"

روی پر تو اسے خود سے زیادہ بھروسہ تھا۔ مگر پیار کی پہلی منزل پر شک کے زینے پر پھسلنے کا زیادہ امکان رہتا ہے۔

"مگر کیسے؟"

"تم یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں یہاں صرف تمہارے لیے ہوں بس۔ سب باتیں تم وقت آنے پر جان لوگی۔"

تب گھڑیال نے پانچ بجنے کا اعلان کیا اور آشا کا خون سوکھ گیا۔

"ہائے...... مر گئی' روی! تم جلدی جاؤ یہاں سے......میری تو آج خیر نہیں......تم نکلو......جاؤ۔"

لیکن روی بے فکری سے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پر آشا کو ابھی اس کی یہ جان لیوا مسکراہٹ بھی غصہ دلا رہی تھی۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں روی......! وہ لوگ مجھے کچھ کہیں تو مجھے کم دکھ ہوگا کیونکہ میں تو عادی ہوں ان کی باتوں کی مگر ان کی طرف سے تمہیں بے عزت کیا جانا مجھے برداشت نہیں ہوگا۔"

اطمینان رکھو آشا! اطمینان رکھو۔ جب تک تم نہیں چاہوگی تب تک کسی کا دروازہ نہیں کھلے گا۔"

اب تو وہ اور بھی پریشان ہوگئی۔ فکر مند چہرے سے وہ اسے تکے جا رہی تھی۔

"تمہارے وہ غیبی سیوک مجھ سے بھی مل چکے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا اور آشا کچن کی طرف دوڑ پڑی۔

امید کے مطابق ٹرالی کھانے پینے کے سامان سے سجی تیار تھی۔ جب وہ اسے دھکیلتی ہوئی ڈائننگ روم میں پہنچی تو سب لوگ ایک ایک کر کے آتے گئے۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور چیزیں میز پر سجانے لگی۔

......☆☆☆......

اگلے دن جب وہ برگد کے نیچے پہنچی تو روی پہلے سے موجود تھا۔

"آشا! آؤ تمہیں میں اپنے لوگوں سے ملواتا ہوں۔ اپنی آنکھیں بند کرو۔" معصوم آشا نے جھٹ سے آنکھیں بند کر لیں۔

"اب کھولو!" ایک پل کے بعد اس نے کہا اور آشا نے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے دیکھ کر تو مانو اس کی آنکھیں پلک جھپکنا بھول گئیں۔

وہ تو ایک خوابوں کا ماحول ہی تو تھا۔ سنگ مرمر کی دیواریں' ان پر قیمتی جڑاؤ موتی' جگہ جگہ ان میں ہیرے جواہرات پروئے ہوئے تھے۔ محل کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیلیں' ایک نہایت ہی خوب صورت منظر...... پہریدار بھی نظر آ رہے تھے لیکن دروازے اپنے آپ کھل جاتے تھے پھر بند بھی ہو جاتے تھے۔

"یہ شاید بجلی سے کھلتے بند ہوتے ہیں۔" ایسی بے خودی میں بھی آشا یہ سوچے بنا نہیں رہ سکی۔

صدر دروازے سے صاف شفاف اور کافی چوڑی سڑک بنی ہوئی تھی جو محل تک جاتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پھولوں کی کیاریاں تھیں۔

"کیسے نایاب پھول ہیں؟" میں نے تو آج تک ایسے پھول دیکھے بھی نہیں ہیں۔

راستے پر اتنی خوب صورت خوب صورت لڑکیاں ادھر ادھر آ جا رہی تھیں کہ انہیں اور ان کے قیمتی لباس کو دیکھ کر آشا خود کو بہت کمتر محسوس کر رہی تھی۔

روی کا ہاتھ تھامے چلتے ہوئے وہ دیکھ رہی تھی کہ سب ہی روی کے احترام میں سر جھکا کر آداب کر رہے تھے۔

"یہ تو کسی راجہ کا محل لگتا ہے...... یہ روی مجھے کہاں لے آیا؟" جب تھوڑا ہوش میں آئی تو فوراً پوچھ بیٹھی۔

"یہ محل میرے دوست وکرال کا ہے۔"

"وکرال؟ یہ کیسا نام ہے؟ پر تم تو مجھے اپنے لوگوں سے ملوانا چاہ رہے تھے۔" دل میں تو ہزاروں سوال پیدا ہو رہے تھے کہ وہ ایک پل میں آنکھیں بند کر کے یہاں پہنچے کیسے؟

"ایسا ہی ہے میرا دوست! اور دنیا میں وکرال کے علاوہ میرا کوئی اپنا نہیں ہے۔"

دونوں مرکزی دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ سامنے بڑا سا ہال نما کمرہ تھا جس کی سجاوٹ دیکھ کر آشا کی حیرت دوچند ہو رہی تھی۔ اچانک کسی کی آواز آئی۔

"آؤ آشا......! اس گھر میں تمہارا سواگت ہے۔" کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ک ک کون ہے؟" چاروں طرف دیکھ کر ڈری ڈری آواز میں پوچھ بیٹھی۔

"یہی میرا دوست وکرال ہے' یار! کیا طریقہ ہے یہ..... آشا کو کیوں ڈرا رہے ہو؟"

تب کمرے کی پچھلی طرف بنے دروازے سے ایک بہت ہی طویل القامت آدمی داخل ہوا۔ وہ بھی دیکھنے میں بہت سندر نوجوان تھا۔ وکرال نے بڑے ہی ادب سے آشا کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ اس کے ہاتھ کے ذرا سے اشارے پر ایک حسین کنیز اپنے ہاتھ میں ایک ٹرے لیے حاضر ہوئی جس میں سونے کے گلاسوں میں کوئی جوس یا شربت تھا۔ وکرال نے اپنے ہاتھوں سے گلاس آشا کو پیش کیا۔

"میں آج کل بہت پریشان ہوں روی! اسی وجہ سے تمہیں بلایا ہے۔" وکرال فکر مند لہجے میں بولا۔

"پریشان اور تم؟ تم سے تو پریشانی خود دور بھاگتی پھرتی ہے..... کیوں مذاق کرتے ہو؟" روی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہا میرے دوست! یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے سچ مچ مجھے پریشان کر دیا ہے۔" اس کے لہجے میں اداسی تھی۔

"کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟" سدا کی بھولی آشا کتنی دیر سے یہ سوال پوچھنا چاہتی تھی' موقعہ ملتے ہی پوچھ بیٹھی۔

"کیا تم نے آشا کو میرے بارے میں نہیں بتایا؟" وکرال نے روی سے پوچھا۔

"نہیں مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ آشا کو کیسے بتا پاؤں گا..... اس لیے اسے اس ماحول میں لے آیا تاکہ یہ آسانی سے ہر بات سمجھ سکے۔" یہ کہہ کر روی ایک لمحے کو رکا پھر آشا کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آشا میں نہیں جانتا کہ میرے ماں باپ کون ہیں..... بہت چھوٹا تھا تبھی شاید میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا۔ میں ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا۔ کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں گر گیا تھا۔ میرا سر زخمی ہو گیا اور میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ تب میں نے خود کو اس محل کے ایک آرام دہ بستر پر پایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا' سر کے ایک حصے میں تیز درد محسوس ہوا' جبکہ سر پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔ بستر کے قریب رکھی آرام کرسی پر ایک بہت ہی رعب دار اور مہربان ہستی بیٹھی مجھے بہت پیار سے دیکھ رہی تھی۔ ان کی کرسی کے ساتھ ہی ایک بہت ہی گورا' خوبصورت اور صحت مند لڑکا کھڑا تھا' وہ لڑکا لگ بھگ میری ہی عمر کا تھا۔ اس عالیشان کمرے میں ایک ڈاکٹر بھی تھا جو اپنے پاس کھڑے ایک نوکر کو کچھ سمجھا رہا تھا۔

"م..... میں کہاں ہوں؟" میں نے اس رعب دار ہستی سے پوچھا۔

ڈاکٹر بھی مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر میری طرف آیا اور میری نبض دیکھنے لگا۔

"گھبراؤ مت بیٹا! بتاؤ تم کون ہو؟"

اس نئی صورت حال سے میں اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ کچھ بول بھی نہیں سکا۔

"بابا! لگتا ہے اسے بھوک لگی ہے۔" اس لڑکے نے کہا۔ میرے لیے کھانا آیا۔ میں سچ مچ بہت بھوکا تھا۔ میں نے کھا لیا۔ اتنا لذیذ کھانا میں نے کبھی نہیں کھایا تھا۔

مجھے اپنے ماں باپ کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔

میں انہیں کچھ بتا نہیں سکا۔ وہ لڑکا یہی وکرال تھا۔ اس نے مجھ سے دوستی کر لی۔ دوستی بھی ایسی کہ ساتھ کھانا' ساتھ پینا' ساتھ کھیلنا لیکن اس عمر میں بھی میں یہ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکا کہ یہ پراسرار اور جادوئی لوگ ہیں۔ ان کی دنیا اس دنیا سے الگ ہے جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ انہیں میں نے کبھی کوئی کام کرتے نہیں دیکھا۔

بس مجھے لگتا کہ ہر کام بنا کیے ہی ہو جاتا ہے۔ وکرال کے والد اپنے قبیلے کے سردار تھے اور ان کے ٹھاٹھ باٹھ کسی راجہ سے کم نہیں تھے۔ وہ مجھے بھی بہت پیار کرتے تھے اور اپنے دوست کی طرح میں بھی انہیں بابا کہتا تھا۔ انہوں نے میرا نام ایک اچھے اسکول میں لکھوا دیا جہاں میں اور وکرال جایا کرتے تھے لیکن وہ اسکول میں نہیں پڑھا کرتا تھا۔ محل سے اسکول جانے کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ مجھے آنکھ بند کرنے کو کہا جاتا اور جب میں آنکھیں کھولتا تو خود کو اسکول کے قریب پاتا۔ میرا دوست مجھے اسکول کے گیٹ تک چھوڑ کر چلا جاتا۔ جب تک اسکول میں رہتا مجھے کچھ بھی عجوبہ دکھائی نہیں دیتا' بابا نے بڑے پیار سے مجھے اس بات کی تاکید کی تھی کہ محل کی کوئی بات اپنے اسکول کے ساتھیوں کو نہ بتاؤں۔ دھیرے دھیرے مجھ پر یہ اسرار کھلتا گیا یہ سب ہماری دنیا کے رہنے والوں سے الگ قسم کی مخلوق ہیں۔ میں یہاں سب کو اپنا روپ بدلتے اور نظروں سے غائب ہوتے دیکھتا تھا..... وقت کے ساتھ ساتھ میں اچھی طرح سمجھتا گیا کہ یہ لوگ کیا ہیں' کون ہیں۔ یہ جن تھے اور یہ جنوں کی بستی تھی۔ مجھے آج تک پتا نہیں کہ یہ بستی کہاں ہے..... میرے اندر بھی کچھ شکتیاں ڈال دی گئی تھیں جو ان کے نزدیک کوئی خاص بات نہیں تھی' اب میں آنکھ بند کر کے ایک مخصوص عمل کر کے اس بستی سے انسانوں کی دنیا میں جا سکتا تھا اور وہاں سے یہاں آ سکتا تھا۔ تمہارے چاچا جی کے شہر میں ہی اب میں رہتا ہوں۔ بابا نے مجھ میں انسانوں کے بیچ رہنے کے لائق ہر خوبی پیدا کر دی ہے لیکن میری اور وکرال کی دوستی ویسی ہی ہے۔"

آشا پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی روی اور کبھی وکرال کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"چلو بابا کے پاس چلتے ہیں۔" وکرال اٹھتے ہوئے بولا۔

"مگر تمہاری پریشانی؟"

"وہیں پتا چلے گا۔"

آشا سے آنکھ بند کرنے کے لیے کہا گیا۔ ایک پل بعد جب اس نے آنکھ کھولی تو ایک دوسرے محل نما گھر کے سامنے تھی۔

وہاں کی سجاوٹ اور سندرتا بے مثال تھی۔ بڑی سی ہال نما بیٹھک' قطار میں کھڑے جن جھک جھک کر ان کا استقبال کر رہے تھے۔ سامنے بڑے سے صوفے پر ایک نہایت رعب دار ہستی کے مالک بابا بیٹھے تھے۔

بیٹھک میں قبیلے کے خاص خاص لوگ موجود تھے۔ روی اور اس کے دوست وکرال نے جھک کر بابا کو آداب کیا۔ یہ دیکھ کر آشا نے بھی ان کو آداب کیا۔ تینوں کو بابا کے دائیں بائیں جگہ ملی اور سردار کے حکم سے تینوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"یہ بچی کون ہے روی؟"

"یہ آشا ہے بابا! روی کے پڑوس میں رہتی ہے اور بہت نیک لڑکی ہے۔" روی کو جھجکتے دیکھ کر وکرال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھی بات ہے روی! مگر تم جانتے ہو ہم انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ پھر اس طرح..... آشا کو یہاں لانا؟"

روی کو نظریں جھکائے خاموش بیٹھا دیکھ کر وکرال نے پھر جواب دیا۔

"بابا! میں نے روی سے کہا تھا آشا کو لے کر آنے کے لیے۔"

"ٹھیک ہے روی بیٹے! اب تم میری بات دھیان سے سنو۔" بابا ایک لمحے کے لیے رک کے پھر بولنا شروع کیا۔ "ہم جنوں کے قبیلے کے بھی عجیب عجیب رواج اور ریت و رسمیں ہیں جن کے بارے میں سن کر تم ہنسو

گے بھی اور حیرت بھی کرو گے۔ انہی رواجوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب ہمارے قبیلے کا لڑکا بڑا ہو جاتا ہے تو اسے ایک قیمتی پتھر دیا جاتا ہے۔ وہ نوجوان اس قیمتی پتھر کو ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہے۔ جب اسے کوئی کنواری لڑکی پسند آ جاتی ہے تو وہ اس لڑکی کو وہ پتھر تحفے میں دیتا ہے۔ اگر لڑکی وہ پتھر سویکار کر لیتی ہے تو ان دونوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔" بابا نے ان کے چہروں پر ایک سرسری نگاہ دوڑانے کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

"پتھر کو تحفے میں دینا اور لڑکی کی جانب سے اسے سویکار کرنا ہمارے یہاں منگنی کی رسم کہلاتی ہے......"

سب پورے دھیان سے بابا کی باتیں سن رہے تھے۔ بابا کے اتنا کہنے کے بعد روی کچھ سوچتے ہوئے بے چین سا ہو کر پہلو بدل رہا تھا۔

"اب سب سے خاص بات سنو روی! ایسا ہی ایک قیمتی پتھر تمہارے دوست وکرال کو بھی دیا گیا تھا۔ میرے سیوکوں نے مجھے خبر دی ہے کہ وہ پتھر ایک انسان لڑکی کو دیا گیا ہے۔ اس لڑکی نے اس پتھر کو سویکار بھی کر لیا ہے۔ پتھر کے ساتھ رہنے والے تین سیوک اس لڑکی کی سیوا میں لگ گئے ہیں اور ساتھ ہی چوبیس گھنٹے اس کی حفاظت بھی کر رہے ہیں۔"

اتنا سن کر روی کی بے چینی تو دیکھنے لائق تھی۔ وہ بہت ہی پریشان سا دکھائی دینے لگا تھا......

آشا بھی قیمتی پتھر...... تین سیوک...... سن کر چونک پڑی تھی۔ جب بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تو اس کا چہرہ بھی پیلا پڑنے لگا تھا اور وہ بار بار اپنے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

"تو یہ ہے غیبی سیوکوں کا راز......!" سارے واقعات فلم کی طرح اس کے دماغ میں دوڑنے لگے تھے۔ آشا کو زندگی میں کبھی اتنی پیچیدہ صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کی زندگی کچن ڈائننگ روم اور اپنے بیڈ روم تک سمٹی ہوئی تھی۔ نہ کبھی اس نے ان سے آگے کا سوچا تھا اور نہ کبھی ضرورت پڑی تھی۔

اس کی زندگی کے خوشیوں بھرے پل وہ تھے جب وہ بہت چھوٹی تھی۔ ماں باپ کی لاڈلی۔ نا کوئی سوچ نا فکر۔ گھر کے سارے معمول اس کے لیے ہی بنائے جاتے تھے۔ ماں باپ کی ہر سوچ کا محور وہی ہوتی تھی۔ اسے یاد تھا ماں کا خوب صورت چہرہ جس پر اس کے لیے ممتا اور پیار برساتی دو سندر آنکھیں۔ ان آنکھوں سے وہ ایک پل بھی اوجھل نہیں ہو پاتی تھی...... آہ...... لیکن وہ آنکھیں ہی اوجھل ہو گئیں۔ یہ سب یادیں اس کے دماغ میں دھندلی دھندلی سی موجود تھیں۔

ماں کی ممتا بھری آغوش کے بعد دادی ماں کی زندگی تک وہ پیار کی چھاؤں میں رہی لیکن اس کے بعد زندگی کا سفر کسی تپتے ریگستان میں ننگے پاؤں چلنے کی طرح تھا۔

پھر روی کے روپ میں اسے نخلستان مل گیا اور اس نے اپنے ساری محرومیوں کو روی کا نام لے کر بھلا دیا۔ اس کے لیے روی آزادی کا پیامبر تھا۔ روی کے ساتھ ساتھ غیبی سیوک تھے جو اس کی پریشانیوں کو کم کر رہے تھے لیکن اب؟ اب کیا ہو گا۔

"سنا ہے کہ جنوں کے قاعدے قانون بڑے سخت ہوتے ہیں۔" سوچتے ہوئے آشا نے ہال میں بیٹھے جنوں پر ایک نظر دوڑائی۔

"مگر بابا آپ نے وہ پتھر دیتے وقت اتنی باتیں بتا کیوں نہیں دی تھیں۔" یہی تو وکرال کی اصلی پریشانی تھی۔

"میں نے تو وہ پتھر اپنے دوست روی کو دے دیا تھا۔"

"لیکن وہ تو ایک لڑکی کے پاس ہے۔" بابا نے کہا۔

"ہاں بابا...... لیکن آپ پوری بات سن لیجیے۔" وکرال نے ادب سے دھیمی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے...... کہو۔ پر یاد رکھنا میرا نام سکندر ہے...... جنوں کی دنیا میں میرے قبیلے کا ایک خاص مقام ہے...... میں اپنے بیٹے سے بھی یہ امید رکھوں گا کہ وہ سچائی سے بات کرے۔" اس وقت ان کے چہرے پر جلال دکھائی دے رہا تھا۔

"بابا میں آپ سے سچ بولوں گا۔ میں اور روی شروع سے ہی یہاں وہاں ساتھ ساتھ گھومتے رہتے تھے۔ آپ جانتے ہیں آپ کے کہنے پر روی کے ساتھ ایک خاص عمل کیا گیا تھا جس سے وہ انسان ہوتے ہوئے بھی دوسرے انسانوں کی نظر سے اوجھل ہو سکتا ہے...... ایک دن ایسے ہی ہم گھوم رہے تھے۔ ایک بڑا سا برگد کا پیڑ تھا' ہم اس پر آرام کرنے بیٹھ گئے۔ یہ کسی مالدار انسان کا بڑا سا گھر تھا جس کے پیچھے وہ برگد کا پیڑ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے اس گھر سے ایک لڑکی کو باہر آتے دیکھا۔ وہ لڑکی بہت ہی خوب صورت تھی۔ اس کے کپڑے بہت معمولی تھے اور اس کے چہرے پر اداسی کا راج تھا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ لڑکی چلتے ہوئے برگد کے پیڑ کے پاس آ گئی اور وہاں رکھی ایک کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے مذاق میں روی سے کہا یہ لڑکی تمہاری دلہن بننے کے لائق ہے۔ پر روی کے من میں تو پہلے سے ہی یہ بات گھوم رہی تھی۔ اسے وہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ میں نے روی سے پھر کہا کہ لگتا ہے بہت غریب ہے۔ روی تم اسے کوئی تحفہ کیوں نہیں دے دیتے۔ روی کے پاس میرا دیا ہوا پتھر تھا۔ اسے اس نے پیڑ کی جڑ کے پاس رکھ دیا۔ روی کے اندر اتنی شکتی ہے کہ جب چاہے کوئی دوسرا آدمی آواز سن سکتا ہے۔ جب چاہے تو وہ اپنی آواز دوسرے انسانوں سے چھپا سکتا ہے۔

اس نے ایک بار اس لڑکی کو سنا کر اس کی سندرتا کی تعریف کر دی۔ وہ لڑکی ڈر گئی مگر کچھ ہی دیر میں اس بات کو بھول کر وہ اس پتھر کو دیکھنے لگی جو پیڑ کی جڑ کے پاس تھا۔ اس نے پتھر اٹھا لیا اور پیار سے اس پتھر کو دیکھنے لگی۔ پھر روی نے اس سے شکریہ کہا۔ اس آواز سے وہ پھر ڈر گئی۔ اس کے بعد ہم نے اس گھر میں اوجھل روپ سے گھوم پھر کر بہت سی جانکاریاں حاصل کیں۔ وہ لڑکی اس گھر کے مالک کے بھائی کی بیٹی تھی لیکن وہ اس گھر میں نوکروں کی طرح رہ رہی تھی۔ سب اس لڑکی پر بہت ظلم ڈھاتے تھے۔ تب ہم نے وہاں کئی جن سیوکوں کو دیکھا۔ پتا چلا کہ وہ ہمیشہ اس پتھر کے آس پاس رہتے تھے۔ وہ پتھر جس کے پاس ہوتا اس کے سیوک ہوتے لیکن میرے اور روی کے پاس جب تک پتھر رہا کوئی سیوک نظر نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی مجھے اور روی کو کسی سیوک کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ یہ ہے میری کہانی اور وہ معصوم لڑکی یہ آشا ہے۔"

کہانی کے ختم ہوتے ہوتے بابا سکندر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ چکی تھی۔

"اب میں ساری بات سمجھ گیا ہوں۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔ روی کو میں نے اپنا بیٹا مانا ہے۔ اس لیے تم نے وہ پتھر روی کو دے دیا تو کوئی بات نہیں۔ مگر روی کی دنیا انسانوں کی دنیا ہے۔ تب پتھر دے دینے سے منگنی نہیں ہوئی۔ انسانوں کے اپنے الگ رسم و رواج ہیں' تمہیں ان پر چلنا ہو گا روی! تم آشا سے تبھی شادی کر سکتے ہو جب اس کے چاچا خوشی سے اس کے لیے تیار ہوں۔" بابا کے اتنا کہنے کے بعد تینوں کے چہروں سے فکرمندی کے بادل چھٹنے لگے تھے۔

"بابا......! کیا ہم اپنی طاقت استعمال کر کے ان دونوں کی شادی نہیں کرا سکتے؟" وکرال نے پوچھا۔

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

"نہیں......! ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم جن ہیں اور وہ انسان۔ ہم پر ان کا قانون لاگو نہیں ہوتا اسی طرح ان پر ہم اپنی طاقت استعمال نہیں کر سکتے۔ دونوں کو ایشور نے بنایا ہے اور ایک دوسرے کے لیے حدیں طے کر دی گئی ہیں۔ ان حدوں کو توڑنے والا پاپ کا بھاگیدار ہوگا۔ ہم انسانوں کے بیچ رہتے ہیں لیکن ان سے ایک دم الگ تھلگ ڈھنگ سے زندگی گزارتے ہیں۔ ہاں کبھی کبھی جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کمزور انسان پر بہت زیادہ ظلم ہو رہا ہے تو ہم اپنی شکتی کا استعمال کر کے ان کی مدد کر دیتے ہیں لیکن بار بار ہم ایسا بھی نہیں کر سکتے۔" بابا تفصیل سے ساری باتیں سمجھا رہے تھے۔

"آشا بیٹی بھی اب ہمارے لیے اتنی ہی عزیز ہے جتنا روی! میں ایشور سے ان کے لیے دعا کروں گا۔ ہم پر اور اس گھر پر اب آشا کا بھی اتنا ہی اختیار ہوگا جتنا روی کا ہے لیکن ہم اپنے اصول سے مجبور ہیں کہ آج اپنی بیٹی کو جو پہلی بار ہم سے ملی ہے، ہم کوئی قیمتی تحفہ نہیں دے سکتے۔" یہ کہتے ہوئے بابا سکندر اپنی جگہ سے اٹھ کر آشا کے پاس گئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "میری بچی ایشور تمہیں ہر خوشی دے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ اپنے دوسرے جن ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل گئے۔

ان سب باتوں میں کافی وقت بیت چکا تھا۔ آشا کو اب فکر ہو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وکرال نے روی سے کہا۔

"آشا کو اس کے گھر چھوڑ دو۔" پھر آشا سے بولے۔

"ہم تمہارے سارے روٹین کو جانتے ہیں، فکر مت کرو! ابھی پانچ بجنے والے ہیں۔ تمہارے سیوک وہاں اپنے کام میں لگے ہیں۔"

ایک بار پھر آشا کو اپنی آنکھیں بند کرنی پڑیں۔ آنکھیں کھلتے ہی وہ اپنے پرانے مہربان برگد کے نیچے تھے۔ تھکن کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ وہاں سے چل کر وہ اپنے کمرے میں گئی۔ کام کے سلسلے میں اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ باتھ روم میں منہ پر پانی مار کر اپنے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتے ہوئے اس نے گھڑیال کی طرف دیکھا۔ پانچ بجنے میں ایک دو منٹ تھے۔ وہ کچن میں آئی۔ سجی دھجی ٹرالی ایک دم تیار تھی۔ اب اس کے بارے میں سوچنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ٹرالی کے ساتھ وہ ڈائننگ روم میں آ گئی۔ سلیکھا موسی، چاچی جی کے ساتھ بیٹھی تھیں اور کسی خاص موضوع پر دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔ اس کے چہرے کے زخم صاف دکھائی دے رہے تھے جن پر کسی مرہم کا لیپ لگا ہوا تھا۔

باقی لوگوں میں سیما اور نکیتا دوسری طرف بیٹھی تھیں جبکہ چاچا جی موجود نہیں تھے۔ آشا کو اندر آتے دیکھ کر سلیکھا موسی کی آنکھوں میں نفرت کی لہر صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ پتا نہیں کس مٹی کی بنی تھیں وہ۔ بھگوان نے ان سے ان کا سب کچھ چھین لیا تھا پھر بھی انہیں اس کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔

اور چاچی جی تو بچپن سے ہی ان کے دباؤ میں تھیں۔ شروع سے ہی وہ ہر کام اور ہر فیصلہ سلیکھا موسی کے کہنے کے مطابق کرتی تھیں۔

"ٹھیک ہے دیدی! آپ کا مشورہ بہت اچھا ہے...... میں ابھی ان سے بات کرتی ہوں۔" میز پر کھانے پینے کی چیزیں رکھتے ہوئے اس نے چاچی جی کو کہتے سنا۔

تبھی چاچا جی بھی آ گئے اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئے۔

"سنیے! آپ سے کچھ کہنا ہے......" چاچی جی کا چاچا جی سے کچھ کہنا شروع کرنے کا یہ خاص انداز تھا جسے سب جانتے تھے۔

"کہیے کیا بات ہے؟" چاچا جی نے مسکراتے ہوئے اپنے چشمے کے اوپر سے ان کی طرف دیکھا۔

"وہ ہمارے مہیش چاچا ہیں نا......" کسی وجہ سے چاچی جی جلدی سے بول نہیں پا رہی تھیں۔

"کون؟ وہ مہیش چاچا جو آپ کے میکے میں منشی کا کام کرتے ہیں؟ کیا ہوا انہیں؟" چاچا جی فکر مندی سے بولے۔

"انہیں کچھ نہیں ہوا، ان کا لڑکا ہے کشور...... پڑھا لکھا ہے، کیوں نہ ہم آشا کا رشتہ اس سے کر دیں۔ یہ بھی تو ہماری ذمہ داری ہے اور آشا بھی تو ہماری سیما اور نکیتا سے بڑی ہے۔"

آشا کا دماغ یہ سن کر سائیں سائیں کرنے لگا۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ تپتے ریگستان میں چلتے ہوئے پیاسے مسافر کو پانی دکھائی دے پر جب تک وہ پانی کے پاس پہنچے تیز آندھی آ کر اس کا رخ دوسری طرف کر دے۔ اسے چکر آیا اور وہ گرنے لگی تبھی محسوس ہوا جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ اسے گرنے سے بچا رہا ہو۔

لیکن چاچا جی نے اس کی حالت دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ شاید زیادہ گرمی سے اسے چکر آ رہا ہو۔ چہرہ گلابی سے پیلا ہو گیا تھا۔

کچھ اس کی حالت دیکھ کر اور کچھ مصلحت سے انہوں نے آشا کو کمرے میں جا کر آرام کرنے کو کہا۔

وہ خود تو چل کر جانے لائق نہیں تھی مگر کسی نے سہارا دے کر اسے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ کوئی اس کے ساتھ چل رہا ہے لیکن اب ان باتوں پر سوچنا بیکار تھا پھر بھی اسے بڑا عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور سامنے اپنی مسکراتی نیلی آنکھوں کے ساتھ روی کھڑا تھا۔ دروازے کے پاس روی نے اس کو تھام لیا۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس نے ساتھ چلتے روی کی آنکھوں میں جھانکا۔ روی کے دل پر تو چھریاں چل رہی تھیں اسے دیکھ کر۔

"آشا! کیا میں بابا کا وچن توڑ کر ان سب کو تہس نہس کر دوں۔ بولو...... مجھ سے یہ آنسو نہیں دیکھے جاتے۔"

دونوں کمرے کے بیچ آ چکے تھے۔ روی کی بات سن کر وہ پلٹ کر اس کے سینے سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ اس کے آنسو روی کے سینے کو بھگو رہے تھے۔ روی اسے خود میں سمیٹ کر اس کی پیٹھ کو ہلکے ہلکے سہلا رہا تھا۔

"روی! وہ...... چاچی جی......" اتنا ہی بول پائی تھی کہ روی نے اپنی انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھ دی۔

"کچھ مت بولو...... سب پتا ہے مجھے...... ایک ایک پل کی خبر رکھتا ہوں میں۔" اس کا چہرہ اوپر تھا اور اس کی ہرنی سی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"مگر روی......!"

"کوئی اگر مگر نہیں...... تمہیں کس نے کہا کہ تم فکر کرو ہاں؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

آشا کا حال تو اس بچے کی طرح ہو رہا تھا جسے کوئی بھیانک چیز دکھا کر ڈرایا گیا ہو۔

روی کو نہ جانے کیا سوجھا اس نے ہلکے سے آشا کی کمر میں گدگدی کر دی۔ وہ اچھل کر اس سے الگ ہو گئی اب اسے احساس ہوا کہ اب تک وہ کس حالت میں روی سے لپٹ کر کھڑی تھی۔

اب تو شرم سے اس کا برا حال تھا۔ پلکیں اتنی بھاری ہو گئی تھیں کہ آنکھیں کھول کر دیکھنا اس کے لیے مشکل تھا۔

روی تو بس اس کا سرخ ہوتا چہرہ اور لاج سے جھکی آنکھیں دیکھتا ہی رہ گیا اور من ہی من میں بھگوان کا اتنی سندر مورتی بنانے پر شکریہ ادا کرنے لگا۔

تبھی آشا نے نظر اٹھا کر روی کو دیکھا لیکن اس کے پیچھے کھلے دروازے کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

"ہے رام......" اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ روی نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور سمجھ گیا۔

اس نے آگے بڑھ کر آشا کو کندھے سے پکڑ کر بستر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ تو اور بھی گھبرا گئی۔

"روی تم جاؤ اب...... مجھے مرواؤ گے کیا؟ دروازہ کھلا ہوا تھا اور ہم......" وہ بولتے بولتے ایک بار پھر شرما گئی۔ روی کی تو آج لاٹری لگ گئی تھی۔ ایسی آشا اسے آج سے پہلے کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ پریم سے شرابور شرمائی، گھبرائی آشا...... اس کا یہ انوکھا روپ۔

"تو اب میں نہیں ڈرتی...... تم یہی چاہتے ہو نا...... اب جاؤ۔"

ہا...... ہا...... ڈرتی بھی ہو اور نہ ڈرنے کا دعویٰ بھی کرتی ہو۔" روی قہقہہ لگا کر بولا۔ اس کے قہقہے سے آشا پریشان ہوگئی۔

"سنو آشا! ابھی جب تک میں یہاں ہوں تمہارے سیوک کسی کو ادھر آنے نہیں دیں گے اور میں نے اب تک کی زیادہ تر زندگی سکندر بابا کی نگرانی میں گزاری ہے۔ میرے اوپر انہوں نے کئی طرح کے عمل کیے تھے جس کی وجہ سے مجھے عام آدمی سے کہیں زیادہ حساسیت آ گئی ہے۔ میں جب چاہوں کسی سے اپنی آواز چھپا سکتا ہوں۔" اور وہ زور سے چلایا۔ اس کی اس حرکت پر آشا بے ساختہ ہنس پڑی۔

......☆☆☆......

"بابا! کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھتے رہیں اور وہ لوگ آشا کی شادی کہیں اور کر دیں۔" وکرال نے بابا سکندر سے پوچھا۔

"تو پھر تم لوگ کیا کرنا چاہتے ہو۔ ہمیں بھی سب پتا ہے۔ روی وقت کا انتظار کرے۔ ابھی ایسا برا وقت آیا بھی نہیں۔ ہم ایک بار پھر کہہ رہے ہیں یاد رکھو آشا کے گھر کے کسی انسان پر تم لوگ اپنی شکتی کا استعمال نہیں کرو گے اور نا ہی انہیں تنگ کرو گے۔"

"ٹھیک ہے بابا! ایسا ہی کریں گے ہم۔" کچھ سوچ کر وہ بولا اور بابا سے اجازت لے کر چلا گیا۔

......☆☆☆......

چاچا جی مہیش کے بیٹے کشور کے ساتھ آشا کا رشتہ کرنا دل سے قبول نہیں کر پا رہے تھے لیکن ان کے پاس دوسرا کوئی حل بھی نہیں تھا جو وہ چاچی جی کے آگے رکھتے۔

انہوں نے صرف اتنا کہہ کر بات کو ٹالنا چاہا کہ کشور کو دیکھ کر کوئی فیصلہ لیں گے۔

سلیکھا موسی جوڑ توڑ کی ماہر تھیں۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے خبر اکٹھا کیے رہتی تھیں۔ اس معاملے میں بھی چاچی جی کی ماسٹر مائینڈ وہی تھیں۔

"کشور کل انٹرویو کے لیے شہر آ رہا ہے۔ اسے یہاں گھر پر بلا لیا جائے۔"

پھر یہ طے ہو گیا کہ چاچا جی اگلے دن ہی کشور سے مل کر کوئی فیصلہ لیں گے۔

سلیکھا موسی کو معصوم سی آشا سے پتا نہیں کس جنم کا بیر تھا۔ وہ اسے جلد سے جلد اس گھر سے چلتا کر دینا چاہتی تھیں۔

اگلے دن دوپہر میں جب آشا برگد کے پاس گئی تو روی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہی شرارتی نیلی آنکھیں، اس وقت تو ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

کہنے لگا۔

"بدھائی ہو آج شریمان کشور جی تشریف لا رہے ہیں۔"

"بے شرم!" وہ دھیرے سے بولی۔ روی سن نہیں پایا۔

"کیا بولی؟"

"میں نے کہا اچھی بات ہے۔ خوشی کی بات ہے لیکن تم کیوں بے چین ہو رہے ہو؟" اس کی شرارت کا جواب اس کے انداز میں دیتے ہوئے بولی۔

"مہاراج کا آپ کے ہونے والے پتی کے روپ میں چنے جانے کا امکان ہے۔" آشا کے جواب سے جل کر اس نے کہا۔

آشا کے مزاج میں اب بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ کہاں تو کسی سے کچھ بولتی نہیں تھی اور اب...... اب اسی طرح کے جواب بھی دے سکتی تھی۔ مگر ایسا صرف روی کے ساتھ ہی تھا۔ کئی لوگ تو اس کی ایک بات سننے کو ترستے تھے۔

"امکان کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور تم وہ حد تلاش کرو۔" اتنا کہنے پر روی کے ہونٹوں پر وہی دل جلانے والی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"تم سچ مچ بے شرم ہو روی! کوئی اپنی پریمیکا سے ایسا کہتا ہے کیا؟"

"کیا بولی؟ ہائے...... ذرا پھر سے کہنا۔" اس نے ایسے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا کہ وہ ایکدم سے شرما گئی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ اور آنکھیں ڈھک لیں۔ پھر پتا نہیں کیا سوچ کر اداس ہو گئی۔

اس کے چہرے سے نہ تو اداسی چھپتی تھی اور نا خوشی۔

"مجھے کیوں بتاتے ہو یہ سب۔ میں نے تو سب کچھ تم پر چھوڑ دیا ہے۔ اب پھر میں فکر کروں گی تو تم ہی ٹوک دو گے۔" وہ اداسی سے بولی۔ روی نے آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"میں یہی جواب سننا چاہتا تھا تم سے مگر اداس ہو کر نہیں۔" وہ بولا۔

"ابھی شام کی چائے کے وقت وہ موجود ہوگا۔ سلیکھا موسی نے مجھے ہی بات سمجھا کر اسے میرے ذریعے بلوایا ہے۔ میں اسے دیکھ آیا ہوں بڑا ہینڈسم قسم کا لڑکا ہے۔"

"اب بتاؤ تم کیا کرو گے؟" وہ سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"بابا کے وچن نے تو باندھ کے رکھ دیا ہے، ہمیں پھر بھی دیکھنا تم...... کچھ نہ کچھ تو کروں گا ہی۔ بس دیکھ کر گھبرانا مت۔ جو بھی ہوگا اس میں تمہیں بھی خوب مزا آئے گا۔"

تبھی صدر دروازے پر سیما کا چہرہ دکھائی دیا۔ دھوپ کے ڈر سے وہ باہر آنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ وہیں سے آشا کو عجیب طرح سے گھورتے ہوئے آواز دے کر بلایا۔

آشا ایک نظر روی پر ڈالتے ہوئے سیما کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا بات ہے سیما؟" بے وقت اسے یہاں دیکھ کر آشا کو حیرت ہو رہی تھی۔ ابھی تو تین ہی بجے تھے۔ اس موسم میں ابھی تو سب اپنے کمروں میں بند رہتے تھے۔

"چلو پاپا نے تمہیں بلایا ہے۔" عجیب بے ڈھنگا انداز تھا اس کا۔ آشا اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ساتھ چل دی۔

"ویسے یہ ڈرائیور ہے بڑا ہینڈسم، کیوں آشا؟" آشا کو برا تو بہت لگا مگر وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ خاموش رہی۔

"یہ ڈرائیور نہ ہوتا تو...... میں تو اسے نہ چھوڑتی۔"

"شکر ہے! وہ تیرے معیار کا نہیں۔" اپنے

www.Paksociety.com

دل میں ٹھنڈک سی محسوس کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

اس پر سیما کچھ جواب دیتی مگر چاچا جی کا کمرہ آ گیا۔ اندر چاچی جی بھی براجمان تھیں۔

"تم کچن میں جاؤ اور ناشتے کا ڈھنگ سے انتظام کرو۔" اسے دیکھتے ہی چاچی جی نے کہا۔ "اور سنو..... گھر میں مہمان آ رہے ہیں' سب کچھ خاص ہونا چاہئے۔ کوئی شکایت نہ ہو۔" پھر سے وارننگ دے کر وہ چاچا جی کی طرف مخاطب ہو گئیں۔

وہ وہاں سے نکلی اور کچن میں پہنچی۔ وہاں اسے کچھ کرنا نہیں تھا۔ عجیب احساس تھا یہ۔ بیٹھے بیٹھے سب کچھ بن جاتا۔ چائے ابل رہی تھی جب ایک نوکر نے اسے ناشتہ لے کر جانے کو کہا۔ ٹرالی ایسے ایسے لوازمات سے سجی تھی جنہیں آنے والے مہمان نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہوگا۔

سجی دھجی ٹرالی کے ساتھ جب وہ ڈائننگ ہال میں پہنچی تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ سب چیزوں کو میز پر سجانے لگی۔ تبھی ایک ایک کر کے سبھی آنے لگے۔

ان میں ایک اجنبی چہرہ بھی تھا۔ ٹھیک ٹھاک نوجوان تھا۔ مگر چہرے سے چاپلوسی ٹپک رہی تھی۔ سلیکھا موسی کے پلو سے لگ کر آ رہا تھا۔ دونوں دھیمی آواز میں کچھ باتیں بھی کر رہے تھے۔

سلیکھا موسی نے اسے اپنے بغل میں جگہ دی۔ سامنے چاچا جی اور چاچی جی تھیں۔ ان سے تھوڑا ہٹ کے سیما اور نکیتا بیٹھی تھیں۔

"کشور! یہ میری بھتیجی یعنی میرے سورگباشی بھائی کی بیٹی آشا ہے۔" چاچا جی آشا کی طرف اشارہ کر کے کشور سے بولے۔

آج پہلی بار اس کی پہچان ہوئی تھی۔ پہلی بار کسی مہمان کے سامنے اسے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا تھا۔

خوش ہونے کی جگہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اچانک اسے اکیلے پن کا احساس ہونے لگا۔ اپنے دائیں بائیں گردن گھما کر اس نے دیکھا جیسے کسی کو کھوج رہی ہو۔

"تم کہاں ہو روی۔" اس نے جیسے من ہی من اپنے بھگوان کو پکارا تھا۔

"میں تو ہر پل تمہارے پاس ہوں میری جان۔" اس نے پھر چاروں طرف دیکھا۔ ناشتہ کرتے ہوئے لوگوں کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر یہ تو صاف صاف روی کی آواز تھی۔ اس نے ایک لمبی سانس چھوڑی۔ دل کو خوشی اور سکون مل گیا تھا۔ مسکراتے ہوئے وہ مہمان کی طرف مڑی اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"آپ ناشتہ کریں ورنہ سب ٹھنڈا ہو جائے گا۔" کتنی پراعتماد آواز تھی اس کی۔ سیما اور نکیتا چونک پڑی تھیں۔ خود میں گم اور سمٹی سکڑی رہنے والی آشا تو نہیں تھی یہ۔

کہتے ہیں نا کہ پیار انسان میں اتنا اعتماد بھر دیتا ہے کہ وہ پہاڑوں کا سینہ بھی چیر سکتا ہے' مٹی کے کچے گھڑے کے سہارے دریا پار کرنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ صحراؤں کی خاک چھان سکتا ہے۔

"لو کشور بیٹا! یہ مٹھائی کھاؤ۔" کتنی مٹھاس تھی سلیکھا موسی کی آواز میں۔ تبھی سب لوگ کشور کی طرف دیکھنے لگے۔

"اوہ......! یہ تو پتھر ہے۔" وہ کراہتا ہوا بولا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مٹھائی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ اپنا جبڑا سہلا رہا تھا۔

چاچی جی اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مٹھائی لے کر دیکھنے لگیں' وہیں موسی پیچھے مڑ کر خونی نظروں

سے آشا کو گھور رہی تھیں۔

"مگر بیٹا! یہ تو ایک دم نرم مٹھائی ہے...... دیکھو۔" چاچی جی اپنی انگلیوں سے مٹھائی کو دبا کر بتا رہی تھیں۔

"تمہارے دانتوں میں تکلیف ہے کیا؟ لو یہ حلوہ کھاؤ۔" چاچا جی ایک پلیٹ میں حلوہ ڈال کر کشور کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

"نہیں انکل میرے دانت بالکل ٹھیک ہیں۔" پھر اس نے چمچ سے حلوہ نکال کر اپنے منہ میں ڈالا۔

"آہ......" اس بار کی کراہ اور بھی دردناک تھی۔ "ارے یہ تو اینٹوں کے ٹکڑے ہیں۔" منہ میں ڈالے ہوئے حلوے کو اس نے وہیں میز پر اگل دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے جبڑوں کو سہلانے لگا۔ منہ پورا کھلا ہوا تھا اور منہ سے رال ٹپک کر میز پر گر رہی تھی۔

یہ دیکھ کر سیما اور نکیتا جلدی سے اٹھ کر میز سے دور بھاگیں' انہیں گھن آنے لگی تھی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کشور! تم تو بڑے سلجھے ہوئے لڑکے مانے جاتے ہو۔ کیا ہے یہ سب۔" موسی کو انسلٹ محسوس ہو رہی تھی۔

"روی......! یہ سب تم کروا رہے ہو؟" اس نے اپنے خیالوں میں روی سے پوچھا۔

"نہیں...... بالکل نہیں...... یہ سب تمہارے شرارتی سیوکوں کا کیا دھرا ہے۔" اپنی شرارتی آواز میں روی بولا۔ ایک تو اس کی آواز سنائی دینا ہی حیرت کی بات تھی' اوپر سے کشور کی حیران کر دینے والی حرکتیں۔

تبھی کشور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ موسی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"میں اب سلجھا ہوا نہیں ہوں...... آپ سب میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ کھانے کی چیزوں میں پتا نہیں کیا کیا ڈالا ہوا ہے۔"

دعا

آیا عصیاں کا طوفان یا اللہ یا رحمٰن
بخشش کا کر دے تو سامان یا اللہ یا رحمٰن
تو ہے غفار و منان' تو ہے تار و منان
ہر لغزش کو کر بے جان یا اللہ یا رحمٰن
نزع کا وقت آئے شیطان چھینے جب میرا ایمان
ذکر سے تر ہو میری زبان یا اللہ یا رحمٰن

(سمیرا فاریہ رحمٰن' کراچی)

"اطمینان سے بیٹھو کشور بیٹا! پہلے یہ بتاؤ کہ آشا تمہیں کیسی لگی؟"

"کیسی لگی۔" وہ کھڑے کھڑے بڑبڑایا۔ اچانک اس نے زور سے قہقہہ لگایا' جھک کر سلیکھا موسی کو بانہوں میں تھام کر انہیں کھڑا کیا' ڈائننگ ٹیبل سے تھوڑا الگ لے جا کر انہیں پکڑے پکڑے ناچنے لگا اور لگاتار ہنس بھی رہا تھا۔

سب لوگ اپنے منہ پر ہاتھ رکھے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ سلیکھا موسی کی تو ڈر کے مارے بولتی بند تھی۔ سیما اور نکیتا سے برداشت نہیں ہوا' منہ دبا کر پیٹ پکڑ کر ہنسے جا رہی تھیں۔

"مجھے آپ بہت اچھی لگتی ہیں آنٹی! کتنی سندر ہیں آپ۔" ناچتے ہوئے وہ موسی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"موئے پاگل ہو رہے ہو کیا...... یہ کیا بے ہودگی ہے۔ چھوڑو مجھے۔" وہ جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے آ کر بیٹھ گئی۔ ان کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔

"ہاہاہاہا...... کیوں ڈر گئیں آنٹی؟ میں تو آپ سے

www.Paksociety.com

شادی کروں گا۔“ اور وہ جھوم جھوم کر گانے لگا۔
اب یہ سب چاچا جی کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے کشور کی طرف بڑھے۔
”نالائق لڑکے! کیا کر رہا ہے تم...... تجھ میں تھوڑی بھی تمیز نہیں ہے کیا؟“ انہوں نے کشور کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اچانک وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے چاچا جی نے کوئی بٹن دبا کر اسے خاموش کر دیا ہو۔
وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاچا جی کو دیکھے جا رہا تھا۔ چاچا جی ایک پل کو رکے اور پھر تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔
”یہ کیا ہوا اور انکل اتنے ناراض کیوں دکھائی دے رہے تھے؟“
”پھر ایک ڈرامہ......“ یہ نکیتا تھی۔
”کشور اب تم گاؤں کے لیے نکل جاؤ۔ شام ہو رہی ہے۔ تم نے اچھی ہماری عزت بڑھائی ہے۔“ سلیکھا موسی بڑے دکھ سے بولیں اور وہ بھی اٹھ گئیں۔
پھر تو سب ہی ڈائننگ روم سے نکل گئے۔
آشا پلیٹیں سمیٹ رہی تھی کہ جانے کدھر سے روی آ گیا۔
آشا کے پاس تو اس کے لیے سوالوں کا بھنڈار تھا لیکن یہاں پر یہ سب پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ وہ برتن اٹھا کر ٹرالی میں رکھ چکی تھی۔
”تھوڑی دیر بعد میرے کمرے میں آؤ روی!“ وہ بہت دھیرے سے بولی۔
روی اپنی آنکھیں گول گول نچاتا ہوا بولا۔
”آہ! میری دعوت کمرے میں ہوگی سرکار؟“ اس کے اس انداز پر آشا خجل سی ہو گئی۔ جھینپتے ہوئے بولی۔
”ٹھیک ہے دعوت ہوگی پر بہت سی باتیں مجھے کرنی ہیں۔ ابھی تم جاؤ۔ یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے......“
”ٹھیک ہے۔ جیسا حکم سرکار کا۔“ اور وہ باہر چلا گیا۔
شام سے آشا کی ڈیوٹی کچن میں ہوتی تھی رات کے کھانے میں الگ الگ ملی فرمائشوں کو پورا کرنا ہوتا تھا۔ اس وجہ سے دیر تک اسے فرصت نہیں مل پاتی تھی۔
اس وقت بھی وہ کچن میں آئی تھی۔ ویسے آج کل کچھ دنوں سے اسے کچھ کرنا نہیں پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ کچن میں زیادہ وقت گزارتی تھی۔ ایک تماشہ ہوتا تھا وہاں۔ جادو کے کھیل کی طرح کام ہوتا ہوا دیکھتی رہتی۔ کبھی کبھی تو اس کے پورے بدن میں سرسراہٹ سی دوڑ جاتی تھی۔
کبھی سوچتی کہ ان جادوئی کاموں کو ہوتے ہوئے گھر کا کوئی فرد دیکھ لے تو؟ مگر سیوکوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ گھر کے لوگوں کو کوئی عجیب بات نظر نہیں آئے گی۔
کچن میں بیٹھے بیٹھے اکتا جاتی تو کچن کے پیچھے کھلنے والے دروازے سے باہر پائیں باغ میں آ جاتی۔
ابھی جب وہ پائیں باغ میں آئی تو کچھ ہی دیر میں وہاں روی بھی آ گیا۔ اسے دیکھ کر آشا کے چہرے اور آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی تھی۔
”چلو روی! کمرے میں باتیں کرتے ہیں۔“ وہ خوشدلی سے دلکش مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہوئے بولی۔
”اور دعوت؟“
”تمہیں کیسی دعوت چاہیے؟ کیا کھاؤ گے؟“
”بس بس مجھے پتا ہے کہ تمہارے سیوک پلک جھپکتے میں سب کچھ حاضر کر سکتے ہیں۔“
”ایسا کیوں کہتے ہو روی! سب کچھ تمہاری وجہ سے ہے۔ مجھے پتا ہے مجھ سے زیادہ وہ تمہارے حکم کے پابند ہیں۔“
”اچھا اچھا اتنا سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“
”ٹھیک ہے۔ پر چلو تو بہت سی باتیں پوچھنی ہیں۔“ وہ اسے آگے دھکیلتے ہوئے بولی۔
”چھوڑو کہاں کمرے میں جاؤ گی۔ چلو یہیں اس بینچ پر بیٹھتے ہیں۔ کتنا اچھا موسم ہے یہاں۔“
”پر یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے۔“
”کوئی نہیں آ رہا۔ چلو بیٹھتے ہیں وہاں پر۔“ روی اس کا ہاتھ پکڑ کر باغ میں بنی آرام دہ بینچ کی طرف لے گیا۔
وہ بے خودی کی حالت میں اس کے ساتھ چل دی۔ یہ کوئی جادو یا جن والی کرامت نہیں تھی بلکہ وہ تو اس کے لمس اور پیار کی کرامت تھی۔
اسے اب اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ کوئی ان کو دیکھ لے گا۔ وہ تو اس کو اپنا دیوتا مان چکی تھی۔ اس نے کہہ دیا کہ کوئی نہیں آئے گا تو بس وہ ہر وہم کے ڈر سے دور ہو گئی۔
باغ میں بجلی کی روشنی ہر طرف بکھری پڑی تھی۔ گرمیوں کی ڈھلتی شام تھی۔ اب ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جو بہت بھلی معلوم پڑ رہی تھی۔ دونوں بینچ پر پاس پاس بیٹھ گئے۔
زیادہ دن نہیں گزرے تھے جب اس نے پہلی بار روی کو دیکھا تھا۔ مگر اتنے دنوں میں ہی وہ اس کا سب کچھ بن چکا تھا۔ اس کا پیار آشا کی نس نس میں بس چکا تھا۔ اپنے پریتم سے ملنے کے لیے من ہر دم بے چین رہا کرتا تھا۔
حالانکہ روی سے ملنا اس کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ پھر بھی اتنے دنوں تک جس حیثیت میں رہ کر وہ اپنی زندگی گزار چکی تھی اس کی وجہ سے اب بھی اس کا دل ڈرتا رہتا تھا۔ بھگوان جانے آگے کیا ہوگا۔

اقوال زریں
☆ کسی کا دل دکھانا خدا کو ناراض کرنے کے برابر ہے۔
☆ بھوکے کو کھانا کھلاؤ اس سے جنت کے دروازے کھلتے ہیں۔
☆ اپنے اللہ اور رسولؐ کو راضی رکھنے کے لئے اسوۂ حسنہ پر عمل کرو۔
☆ والدین کا کہا مانو کیونکہ وہ ہمیشہ نیک کام کے لئے کہتے ہیں۔
☆ جو انسان جھکتا نہیں وہ ٹوٹ جاتا ہے۔
☆ جھوٹ سے گریز کرو۔ تمام گناہ چھوٹ جائیں گے۔
☆ روزہ رکھو۔ اس سے غریبوں کے حالات کا احساس ہوتا ہے۔
☆ جو دعا مانگو دل سے مانگو۔ بے شک خلوص دل سے مانگی جانے والی دعا قبول ہوتی ہے۔
☆ دعا ہر کسی کو دو۔ بددعا کسی کو نہ دو۔
☆ نماز قائم رکھو۔ خیالات صاف رہیں گے۔
(عائزہ مظہر، چونالہ نوالوک)

”ہاں بولو...... تمہیں کیا پوچھنا تھا۔“
تبھی آشا کو کشور والا واقعہ یاد آ گیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے باغ کے سارے پھول پودے اس کے ساتھ ہنس پڑے ہوں۔
روی تو ایک ٹک اسے دیکھتے ہوئے اس کی ہنسی کو اپنے دل میں اتار رہا تھا۔
”اچھا یہ بتاؤ یہ سب کر کے تم نے بابا سکندر کے حکم کو کیوں توڑا ہے...... بتاؤ۔“ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے اس نے روی سے پوچھا۔
”پہلے یہ جان لو کہ یہ سب میں نے نہیں وکرال نے کیا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا کہ وہ بابا سے کیے

www.Paksociety.com

وعدے کو نہیں توڑ رہا۔ بابا نے کہا تھا کہ اس گھر کے کسی فرد پر اپنی شکتی کا استعمال نہیں کرنا لیکن کشور تو اس گھر کا فرد نہیں ہے۔ اس نے بہت ہلکے ڈھنگ سے یہ کام کیا جس سے اسے کوئی نقصان بھی نہیں ہوا۔"

"مگر کیسے کرتے ہیں وہ لوگ ایسا؟ مجھے تو بہت ڈر بھی لگ رہا تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی۔"

"اس وقت جو تم نے دیکھا وہ بالکل آسان کام ہے جو ایک انسان بھی کر سکتا ہے۔ تمہارے سیوک کچن میں جو کرتے ہیں وہ صرف جن ہی کر سکتے ہیں۔"

"کیسے؟ کشور کے ساتھ جو ہو رہا تھا وہ ایک انسان کیسے کر سکتا ہے۔" اسے حیرت ہوئی۔

"یہ ایک ایسا عمل ہے جسے سب انسان نہیں سیکھ سکتے۔ اس کے لیے انتھک ریاض اور لگن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس عمل کو بہت سے سچے سادھو مہاتما لوگ بھی جانتے ہیں۔ اسے ٹیلی پیتھی کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے ایک انسان اپنے سے کافی دور کے انسان کے دماغ کو اپنے قبضے میں کر کے اس سے کچھ بھی کروا سکتا ہے۔ ٹیلی پیتھی کے ذریعے وہ اس فرد کے دماغ میں رہ کر اس سے باتیں بھی کر سکتا ہے۔"

"اوہ...... ہو...... تو اس کا مطلب تم نے اس وقت ٹیلی پیتھی کے ذریعے مجھ سے بات کی تھی؟"

"ہاں...... لیکن افسوس میں یہ عمل نہیں جانتا۔" وہ ایسی بیچارگی والی صورت بنا کر بولا کہ وہ ہنس پڑی۔

"پر کیسے؟ تم نہیں جانتے پھر بھی تم نے مجھ سے باتیں کی تھیں...... یہ کیسے ممکن ہے؟"

"اس کے لیے میں کئی بار بابا سکندر کی ڈانٹ سن چکا ہوں۔ انہوں نے بہت کوشش کی تھی کہ میں ٹیلی پیتھی سیکھ جاؤں پر میں نہیں سیکھ سکا۔"

"کیوں؟"

"بابا کے کہنے کے مطابق میرا مزاج اس کے لائق نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک انسان کو اپنے دماغ کو پوری یکسوئی کے ساتھ ایک ہی نقطے کو گھنٹوں دیکھے رہنا پڑتا ہے جو میں نہیں کر سکا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا میں نے نہیں سیکھ سکا لیکن جنوں کو یہ سیکھنا نہیں پڑتا۔ ان میں پیدائشی یہ طاقت ہوتی ہے۔"

"مگر اس وقت تو تم نے مجھ سے بات کی تھی نا؟"

"ہاں...... جن اپنے خاص عمل کے ذریعے کسی انسان میں یہ عمل کچھ گھنٹوں کے لیے پیدا کر سکتے ہیں۔"

"اب میں سمجھ گئی۔ چلو اچھا ہوا تم یہ عمل نہیں سیکھ سکے۔"

"کیا مطلب! ایسا کیوں سوچتی ہو تم؟"

"کیونکہ تب تم ٹیلی پیتھی کا سہارا لے کر میرے ساتھ من مانی کرتے۔" شرارتی انداز آشا میں بھی آتا جا رہا تھا۔ سچ میں کہتے ہیں نا کہ پیار انسان میں بہت سی تبدیلیاں لے آتا ہے۔

"اس کا مطلب ہے میں آج تک تمہارے دل میں اپنا وشواس پیدا نہیں کر سکا۔" گمبھیر آواز میں کہتا ہوا روی اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ ایک دم تڑپ اٹھی۔ اس کے ایک اشارے پر وہ اپنا سب کچھ قربان کر سکتی تھی۔

بیٹھے بیٹھے ہی اس نے روی کو اپنے نرم بازوؤں میں کس لیا اور اس کے کندھے پر اپنا سر ٹکا کر بولی۔

"روی......! میرے روی......! میں ایک بار تو بھگوان کا کہا ٹال سکتی ہوں پر تمہارا نہیں۔ تم ایسا کیسے سمجھ سکتے ہو۔ میں تو مذاق میں بول رہی تھی۔"

روی نے اب اسے اپنی مضبوط بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔

"اب کبھی ایسی بات مت کہنا۔ جس طرح انسانوں سے بھری دنیا میں تم اکیلی ہو اسی طرح میں بھی ایک دم اکیلا ہوں۔ تم شاید یقین نہ کرو انسانوں میں میرا ایک بھی دوست نہیں۔ بس اسکول اور کالج کے کچھ لڑکے ہیں، جنہیں تم چاہو تو دوست سمجھ سکتی ہو۔"

کتنی ہی دیر تک یہ دو پریم دیوانے دنیا سے بے خبر ایک دوسرے کی بانہوں میں ایک دوسرے کی دھڑکنوں کو گنتے رہے۔

ادھر آشا یا روی کو بالکل پتا نہیں تھا کہ آشا کے خلاف سلیکھا موسی اور چاچی جی نے کون سا جال بچھایا ہوا ہے۔ وہ تو اپنے پیار کے نشے میں مست تھے۔ پیار جن کے دل میں ہو وہ نیک بندے ہوتے ہیں، انہیں دوسرے بھی نیک لگتے ہیں۔ وہ بے فکر ہوتے ہیں۔ ویسے بھی اس مطلب پرست دنیا کا تجربہ نہ تو آشا کو تھا اور نہ روی کو۔ آشا گھر کی چار دیواری میں بند رہتی تھی۔ روی کا زیادہ میل جول جنوں سے تھا۔ وہ انسان ہوتے ہوئے بھی انسانوں کی بہت سی فطرتوں سے انجان تھا۔

کون جانے کہ یہ دو پریمی اس مطلب پرست اور انسانوں کی چالاکیوں سے بھری اس دنیا میں اپنی دنیا کیسے بسا سکیں گے۔

......☆☆☆......

ادھر سلیکھا موسی کے کمرے میں ایک بار پھر سب کی بیٹھک ہوئی۔ چاچا جی کو چھوڑ کر سب وہاں موجود تھے اور بحث کا گرما گرم موضوع تھی آشا۔

"مجھے تو پورا شک ہے کہ چھوری جادو وادو جانتی ہے۔" موسی نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔

"پر یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ تو بچپن سے میرے گھر میں ہے۔ آج تک کہیں نہیں گئی۔ پھر جادو؟" چاچی جی نے کہنے کو تو کہہ دیا مگر شک اس کے دل میں بھی گھر کر چکا تھا۔

"یہ سب بکواس ہے۔" نکیتا نے بھی اپنا منہ کھولنا ضروری سمجھا۔

"مجھے تو لگتا ہے سارے گھر والوں پر اس نے جادو کر رکھا ہے۔" موسی نے نکیتا کو گھورتے ہوئے کہا۔

"جاؤ تم دونوں اپنے کمرے میں۔" چاچی جی نے دونوں بیٹیوں کو گھورتے ہوئے کہا اور دونوں اٹھ کر پیر پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"تم نے دیکھا ہے نا کہ ہم دونوں کے ساتھ کیسے حادثات ہوئے ہیں۔ پھر کشور والا واقعہ۔ کیا یہ سب کسی وجہ کے بغیر ہوا ہے؟" سلیکھا موسی نے چاچی جی کو شیشے میں اتارنا جاری رکھا اور یہ حقیقت بھی ہے کہ شیطان صفت انسان کا دماغ عام انسان کے مقابلے کہیں زیادہ تیز چلتا ہے۔

"تمہاری بات دل کو لگ رہی ہے دیدی! پر ہم کر کیا سکتے ہیں۔" چاچی جی تو اپنی بڑی بہن کے دماغ پر چلنے والی تھیں۔ فکر مندی سے بولیں۔

"میرے پاس اس کا حل ہے۔ بس تمہیں میرے کہنے کے مطابق چلنا اور کرنا ہوگا۔" موسی چاچی کے دل کا تہہ لینے کے لیے بولیں۔ دونوں بہنیں بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہی تھیں۔

"دیدی! مجھے تو گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ کچھ غلط تو نہیں ہوگا نا دیدی! آخر کرنا کیا ہے؟"

"اپنے کان ادھر لاؤ اور دھیان سے میری بات سنو۔" سلیکھا موسی، چاچی جی کو اپنا لائحہ عمل بتاتی رہیں۔

"مگر سیما کے پاپا اس پر راضی ہوں گے کیا؟"

"تم انہیں کچھ نہیں بتاؤ گی۔ وہ تو اپنی بھتیجی کے پیارے چاچا جی ہیں نا۔"

"پر دیدی ایک بار پھر سوچ لو کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

(باقی آئندہ ماہ)

❖

www.Paksociety.com

جواز

اسرار احمد

انسانی فطرت کا مطالعہ کرنے والے ایک ماہر نفسیات کی سرگزشت وہ خود نفسیاتی مریض بن گیا تھا مگر اسے اس کا ادراک نہ تھا۔

مغربی ادب سے انتخاب، باذوق قارئین کے لیے بطور خاص

دولی میں سوائے اس کے اسٹائل اور اس کی واڑھی کے اور کوئی ایسی بات نہ تھی جس کی بنا پر کہا جا سکتا کہ وہ ایک سائیکالوجی انسٹرکٹر ہے۔ اسے اپنا پیشہ کتنا پسند تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے بس اسی قدر کافی تھا کہ اسے کمرے میں جا کر دیکھ لیا جاتا۔ جہاں وہ اپنی گھومنے والی کرسی پر اسی طرح براجمان ملتا تھا کہ اس کے دونوں پیر سامنے کی میز پر ہوتے تھے۔ پشت کرسی سے ٹکی ہوتی تھی اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں گردن تلے جمی ہوتی تھیں۔

اس وقت بھی وہ اسی حالت میں تھا اور اس کی آنکھیں نفسیات کے اس نئے ٹیچنگ اسسٹنٹ پر جمی ہوئی تھیں جو پچھلے دو ہفتے سے اس کے کمرے میں حصہ دار کی حیثیت سے بیٹھ رہا تھا۔

''ہولینڈ!'' دولی نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہارے سلسلے میں خاصا تجسس ہے۔ میرے ایک محتاط اندازے کے مطابق سائیکالوجی پڑھنے والے اضطراری کیفیت کے حامل ہوتے ہیں، میں نے ایسے لوگوں کو پھڑکو کا نام دیا ہے اور ان کے عمل کو پھڑکن کہتا ہوں بہرحال تمہارا مسئلہ کیا ہے؟''

یہ کمرہ تقریباً آٹھ فٹ چوڑا تھا۔ ہولینڈ کی میز کے پیچھے دیوار تھی جب کہ دولی کا چہرہ دروازے کی طرف تھا، ان دونوں کی میزوں کے درمیان ایک تنگ سا راستہ تھا۔ ہولینڈ اس وقت اپنے سامنے رکھے کاغذات کے پلندوں کو ٹھیک کرنے میں مصروف تھا، اس نے پُرخیال انداز میں دولی کی سمت نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر دوبارہ اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ دولی کی ایک مخصوص شہرت تھی اور وہ اس سے آگاہ ہو چکا تھا۔

''نہیں!'' دولی نے اس طرح کہا جیسے کوئی تبصرہ کر رہا ہو۔ ''بظاہر تو یوں ہی لگتا ہے اور میرے اندازے کے مطابق تمہارے اندر پھڑکن کی رفتار بہت ہی کم ہے۔ اس کے لیے میں تمہیں صرف پانچ نمبر دے سکتا ہوں۔''

دولی کی شہرت دو وجوہ سے بنی تھی۔ ایک تو وہ اس لیے مشہور تھا کہ اس کی فطرت میں سور پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کی شہرت کی دوسری وجہ تھی کلاس روم میں اس کا مسحور کن انداز تقریر۔ طالب علموں کے لیے اس کی شخصیت خاصی دلچسپ اور سحر انگیز تھی۔ اس کے طنز کی لپیٹ میں نہ آنے والے لڑکے واقعی اسے بولتے دیکھ کر محظوظ ہوتے تھے۔

ہولینڈ نے اپنے آخری کاغذ کو بھی ختم کر کے جب ایک جانب رکھ دیا تو وہ سیدھا ہوا اور اس نے دولی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''اور یہ پھڑکن کیا ہے؟ کیا تم نہیں جانتے۔'' ''یہ نیوروسس اور سائیکاسس'' جیسی اصطلاحات اب بہت پرانی ہو چکی ہیں۔ معقول انداز میں انہیں بدلنے کی سخت ضرورت ہے۔ اب میں نے اس سلسلے میں اپنی ایک اصطلاح ایجاد کی ہے۔ پھڑکن، تاب

ی کو کیوریز سے ناپتے ہیں۔ شور کو ڈیسی بلز سے۔ ل نفسیاتی مسئلوں کو پھڑکن سے ناپا جاتا ہے۔ ہارے اندر اس کی رفتار بہت کم ہے حالانکہ تم بھی ایک سائیکالوجی گریجویٹ ہو۔'' ہولینڈ نے اپنے میں وبی سرخ پنسل کو ایک سمت ڈال دیا۔

''تمہارا مطلب ہے نفسیات کے طلباء بہ نسبت سرے طلباء کے ذہنی طور پر زیادہ پراگندہ ہیں.....''

''ذہنی پراگندگی نہیں پھڑکو کہو۔'' مداخلت کرتے ہوئے دولی نے کہا۔ ''اسی وجہ سے تو وہ نفسیات پڑھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے حقیقتاً وہ اپنے دماغ کے لیے کسی جواز کی اوٹ لیتے ہیں۔ وہ اپنی حرکات کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں اور میں تو کہوں گا کہ وہ انہیں سمجھتے بھی نہیں۔ بس ایک جواز درکار ہوتا ہے مثلاً میری ماں دھانسو تھی اور میرا باپ خبطی...... لہٰذا میں جو کچھ ہوں مجھے تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ اپنے پھڑکو ہونے کی وکالت میں وہ ایک ہزار جواز پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتے اور اسی کی بناء پر وہ خوش بھی رہتے ہیں۔

ہولینڈ آہستہ سے کھنکارا پھر اس نے جھک کر پنسل اٹھالی۔ ہولینڈ ایک خاصا سنجیدہ سا نوجوان تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دولی اس وقت واقعی سنجیدہ ہے کہ نہیں...... بے یقینی کی کیفیت اس کے لیے تھوڑی پریشان کن بھی تھی۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جس کو تم جواز سمجھ رہے ہو وہ کوئی ٹھوس وجہ ہی ہو مثلاً جیل کا قیدی اگر یہ سمجھے کہ یہاں کا عملہ اس کو ناپسند کرتا ہے تو کیا تم اس قیدی کو ''پیرانوئڈ'' قرار دے دو گے۔ کیا تم یہ کہو گے کہ وہ بدگمانی کے خبط میں مبتلا ہے؟''

''نہیں!'' دولی نے چہکتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اگر

سرورِ کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

☆ علم حاصل کرو اللہ کے لئے علم حاصل کرنا نیکی ہے۔

☆ علم کی طلب عبادت ہے۔ اس میں مصروف رہنا تسبیح اور بحث و مباحثہ کرنا جہاد ہے۔

☆ علم سکھاؤ تو صدقہ ہے، علم تنہائی کا ساتھی فراخی اور تنگ دستی میں رہنما، غم خوار دوست اور بہترین ہم نشین ہے علم جنت کا راستہ بتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ علم کے ذریعے قوموں کو سربلندی عطا فرماتا ہے۔ علم سے انسان معرفت خداوندی حاصل کر سکتا ہے۔

☆ وہ لوگ جو علم حاصل کرتے ہیں بدقسمت کی سعادت سے محروم رہتے ہیں۔

☆ ہمیں چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چل کر کائنات میں اپنا مقام پیدا کریں۔

(ریما خان، چوٹالہ جہلم)

وہ نفسیات کا طالب علم ہو تو پھر میں اس پر شرط بھی لگا سکتا ہوں۔''

''خوب! تو پھر ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں، میں تو یہاں انسانی فطرت کا مطالعہ کرتا ہوں اور کیا کروں گا؟ دیکھو میں تمہیں اس پھڑک داری کی ایک زندہ مثال دکھا سکتا ہوں۔ صاف ستھری مثال۔ پچانوے فی صد پھڑکو اور باہر کے ہال تک لمبا چوڑا جواز۔ کیا تم ہیکٹر لیتھ کو جانتے ہو؟''

''نہیں میں ابھی نیا نیا آیا ہوں، تمام لوگوں کے ناموں سے واقف نہیں ہوں لیکن میں نے تو کسی

ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اپنے پھڑکو پن کے لیے ہال جتنا لمبا چوڑا جواز لیے گھومتا ہو۔"

دولی نے آہستہ سے اپنا سر ہلایا۔ "پھر تو تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔ وہ زبان کا بھی خاصا کڑوا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" دوسرے لمحے اس نے اپنے پیر میز سے زمین پر گرا دیے اور کرسی سے اچھل کر باہر ہال کی طرف بڑھا۔

ہولینڈ لمحہ بھر کے لیے متذبذب رہا پھر اس نے دولی کی تقلید کی اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ کاریڈور کے دونوں طرف براؤن پارٹیشن بورڈ کے چھوٹے چھوٹے بہت سے کیبن بنے ہوئے تھے۔ کاریڈور کی دیوار پر متعدد تصاویر آویزاں تھیں۔ کتابوں کا ایک ڈسپلے ریک بھی تھا۔ نوٹس بورڈ بھی تھا اور ایک جانب کالج کے کھیلوں کے کارنامے بھی لکھے ہوئے تھے یہیں ایک گروپ فوٹو بھی آویزاں تھا۔ یہ ان لڑکوں کا تھا جو پچھلے سال کالج سے رخصت ہوئے تھے۔ ان میں چند اساتذہ بھی موجود تھے۔ دولی اس تصویر کے سامنے ٹھٹک گیا پھر اس نے تصویر کے سب سے چھوٹے قد والے لڑکے پر انگلی رکھی اور بولا۔

"یہ ہے ہیکٹر لیتھ!"

"اسے تو میں نے دیکھا ہے۔"

"تمہارے خیال میں اس کی کیا عمر ہوگی؟"

ہولینڈ نے تصویر کو دیکھا پھر اس شخص کو یاد کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے اکیس بائیس سال۔"

"نہیں! اس کی عمر اٹھائیس سال ہے۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" دولی نے کہا۔ "وہ اٹھائیس سال کا ہے لیکن لگتا ہے بیس سال کا۔ تم یقین کرو اس سے بڑا جھاواں یہاں اور کوئی نہیں۔"

تصویر کا یہ لڑکا قد میں بمشکل پانچ فٹ ایک انچ دو انچ کا ہوگا۔ اس کا چہرہ گول تھا اور اس پر بچوں جیسی تازگی تھی آنکھوں پر موجود عینک اور لباس میں سنجیدگی نہ ہوتی تو اسے بڑی آسانی سے میٹرک یا انٹر کا طالب علم قرار دیا جاسکتا تھا۔ بلاشبہ تصویر میں وہ سب سے الگ سا نظر آتا تھا۔ خصوصاً اساتذہ کی قطار میں۔ دولی بھی اس تصویر میں موجود تھا' اپنی داڑھی کے ساتھ۔

واپس اپنے کمرے میں پہنچ کر ہولینڈ نے اپنی کرسی سنبھال لی لیکن دولی وہیں اس کی میز کی نکر پر بیٹھ گیا۔

"اور سنو!" دولی نے کہا۔ "پہلے یہ فوج کی ملازمت میں گیا تھا لیکن وہاں اسے جذباتی عدم توازن کی وجہ سے باہر کردیا گیا پھڑکو پن کی کچھ مقدار اسے فوج سے بھی ملی ہوگی۔ تب سے یہ یہاں پڑھا رہا ہے لیکن کلاس میں پہنچ کر اس کا پھڑکنا اور بڑھ جاتا تھا لہٰذا اب اسے ریسرچ اسسٹنٹ بنا دیا گیا ہے اس تبدیلی کے بھی نمبر لگادو تو پھر پھڑک داری کی مقدار مزید بڑھ جائے گی۔"

"تو پھر ڈاکٹر صاحب آپ کی تشخیص کیا ہے؟" ہولینڈ نے مزاقاً کہا۔

دولی نے شانے اچکا دیے۔ "میں نہیں جانتا۔ مینک ڈپریسو کہہ لو اس کا موڈ جلد جلد بدلتا ہے آج تم پر نچھاور ہوگا تمہیں اپنی ایک ایک بات بتائے گا اور دوسرے روز تم سے یوں کترا کر گزر جائے گا جیسے تمہیں جانتا تک نہ ہو اور خدانخواستہ اگر اس کا موڈ زیادہ خراب ہوا تو پھر تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اس سے دس قدم دور رہو۔ تھوڑے سے نمبر اس کے بھی دے دو۔ باقی رہے بیس نمبر سو وہ جواز کے

ہیں۔"

"اچھا اور یہ جواز کیا ہیں؟"

دولی لمحے بھر کے لیے چپ رہا پھر اس نے کہا۔ "اس کا خیال ہے اپنے خیالات کے مطابق کہ اس کی زندگی کا سفر دوسروں کی بہ نسبت قدرے سست رفتار ہے یعنی وہ ابھی پوری طرح سے بڑا نہیں ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کی ذہنی اور جسمانی نشوونما کا عمل ابھی پورا نہیں ہوا ہے یعنی اس کی عمر کے دوسرے لوگ جن منزلوں سے گزر آئے ہیں ابھی اس نے ان سے گزرنا ہے۔"

"آخر وہ ایسا کیوں سوچتا ہے؟"

دولی مسکرایا۔ "وہ سمجھتا ہے کہ وہ بڑھ رہا ہے اس کا خیال ہے کہ اس کا قد بڑھ رہا ہے۔"

ہولینڈ سنجیدہ ہوگیا۔ "لیکن اگر یہ بات درست ہو تو پھر واقعی ایک قابل دید بات ہوگی کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ ایسے میں آدمی تھوڑا سا الجھ بھی سکتا ہے۔ دوسروں سے مختلف ہونا بھی تو کسی بوجھ جیسا ہوتا ہے۔"

"اچھا جواز پیش کیا تم نے۔" دولی نے خشک لہجے میں کہا۔ "اس کے ساتھ بھی تو یہی مسئلہ ہے یعنی خود فریبی۔"

"لیکن اگر اس کا قد واقعی بڑھ رہا ہو......"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ بس اس فریب میں خود کو مبتلا کیے ہوئے ہے۔"

"آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا نہیں۔"

کمرے سے باہر نکل کر وہ ہولینڈ کو کاریڈور میں دوبارہ لے گیا پھر اس نے ایک چھوٹے سے کمرے کو کھولا۔ وہ کمرہ خالی تھا۔ یہ کمرہ انہی کے کمرے جیسا تھا لیکن اس میں صرف ایک ہی میز تھی' کمرے کے

aanchal.com.pk
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ھے
آج ھی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں

پرچہ نہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

تین طرف الماریاں تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں، وولی نے بجلی جلادی۔

''اندر آ جاؤ۔'' اس نے ہولینڈ سے کہا۔

پھر اس نے دیوار کی سمت اشارہ کیا جہاں سفیدی پر پنسلوں سے بنی چند افقی لکیریں پڑی ہوئی تھیں اوپر اور نیچے کی لکیروں میں تقریباً ڈیڑھ انچ کا فاصلہ رہا ہوگا۔

''یہ دیکھو۔'' وولی نے کہا۔ ''یہاں اس نے اپنا قد ناپا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ وہ بڑھ رہا ہے۔''

''اور تمہارے کہنے کے مطابق ایسی کوئی بات نہیں پھر یہ نشانات کیا ہیں؟''

''یہ تو طے ہے کہ اس کا قد نہیں بڑھ رہا ہے۔'' وولی نے کہا۔ ''نشانات میں میرا ہاتھ ہے۔'' وہ آہستہ سے ہنسا۔ ''میں اوپر کی لکیر مٹا کر نیچے لکیریں بناتا رہا ہوں اور وہ قد ناپتے وقت میری مٹائی ہوئی پر نئی لکیر بنا کر سمجھتا ہے کہ اس کا قد بڑھ رہا ہے۔''

ہولینڈ کا منہ بن گیا۔ ''اچھا اب میں چلوں گا۔ میرے پاس کئی کام ہیں۔'' پھر وہ کچھ کہے بغیر مڑا اور چل دیا۔ اس کے انداز سے ناپسندیدگی جھلک رہی تھی۔ وولی نے اس کے عقب سے کہا۔ ''یہ ایک نفسیاتی تجربہ ہے۔'' لیکن ہولینڈ نہیں رکا۔

وولی نے بے نیازی سے شانے اچکا دیے پھر وہ بڑھا اس نے پنسل سے نشانات کو مٹایا اس کے بعد اس نے ڈیسک سے پنسل اٹھائی جس کے ساتھ ربر منسلک تھا۔ اس نے دیوار پر بنا ہوا سب سے اوپری نشان مٹا دیا پھر احتیاط کے ساتھ نیچے ایک دوسری لکیر بنادی۔

اس کے بعد اس نے پنسل کو میز کی سمت اچھال دیا اور خود بھی چلنے کے لیے مڑ گیا۔ ابھی وہ دروازے پر ہی پہنچا تھا کہ اس نے ہیکٹر لیتھ کو اپنی سمت آتے دیکھا۔ وولی نے ہٹ کر اسے راستہ دے دیا۔

لیتھ بالکل اپنی تصویر جیسا ہی تھا بچوں... اور جیکٹ اور سیاہ اوور کوٹ میں۔ اس کے ہاتھ ایک بریف کیس دبا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر یوں رہا تھا جیسے کوئی کم عمر لڑکا اپنے باپ کی نقل اتا ہے۔

اس نے وولی کو گھور کر دیکھا اور بولا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''ایک کتاب دیکھنے آیا تھا۔''

''تمہیں کتاب لینی ہو تو مجھ سے کہا کرو۔ اس طرح آنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم میرے لیے کوئی نہ کوئی الجھن کرتے رہتے ہو۔ جاؤ اپنے کمرے میں۔''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔'' ولی نے کہا خوامخواہ برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔'' پھر وہ وہاں سے کھسک گیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ کم از کم لیتھ نے اسے لکیروں کو بناتے نہیں دیکھا صرف ایک لمحہ پہلے وہ آجاتا تو معاملہ ضرور خراب ہو جاتا۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو ہولینڈ اپنے کاغذات نکال نکال کر میز پر رکھ رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' وولی نے پوچھا۔

''جا رہا ہوں یہاں سے۔'' ہولینڈ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا۔ ڈیپارٹمنٹ آفس میں ایک میز خالی ہے جب تک کوئی دوسرا بندوبست نہیں ہوتا میں وہاں بیٹھ جاؤں گا۔''

''لیکن کیوں؟'' وولی نے پوچھا۔ آخر تم جا کیوں رہے ہو؟ یہ تمہیں ہوا کیا ہے؟''

''تم بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟'' ہولینڈ نے ناگواری سے وہی سوال دہرایا۔ ''آفس والوں نے

کوٹلیا چانکیہ

ان کے یہاں صرف ایک سیاسی فلسفی پیدا ہوا تھا جو چانکیہ تھا۔ فلسفی سیاسیات ہونے کے حوالے سے وہ کوٹلیا کہلانے پر فخر محسوس کرتا تھا۔ کیونکہ کوٹلیا کے معنی ہیں مکار اور فریب کار۔ ہندوؤں کی تصانیف میں اس کی تحریر کردہ کتاب ارتھ شاستر کو بہت اہمیت حاصل ہے ارتھ شاستر میں لکھے گئے اصول جہاں بانی درج

ول اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔

۱۔ ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک کیا جائے جو دشمنوں سے کیا جاتا ہے اور ان پر کڑی نظر رکھی جائے۔

۲۔ غیر ہمسایہ سلطنتوں سے دوستانہ تعلقات رکھے جائیں۔

۳۔ جن سے دوستی رکھی جائے ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیش نظر رہے اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی چھوٹنے نہ پائے۔

۵۔ دل میں ہمیشہ رقابت کی آگ مشتعل رکھی جائے۔ ہر بہانے سے جنگ کی چنگاریاں سلگائی جاتی رہیں۔ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پروانہ کی جائے۔

۶۔ دوسرے ملکوں میں مخالفانہ پروپیگنڈا تخریبی کاروائیاں بدامنی انتشار پیدا کرنے کی مہم جاری رکھی جائے۔ اپنے آدمی ناجائز ذرائع سے داخل کر کے خفیہ محاذ قائم کیا جائے جو حکومت کے خلاف سازشیں برپا کردے۔

۷۔ رشوت اور دیگر اسی قسم کے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے اور دوسرے ملکوں کے غداروں کو نے کی کوشش کی جائے۔

۸۔ امن کے قیام کا خیال تک بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کرے۔

(انتخاب کیا ہے پروفیسر اے ایچ انصاری صاحب کی کتاب بابری مسجد کی شہادت سے)

(سریش کمار..... ٹنڈو آدم خان)

سے پہلے ہی کہا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی نہیں بیٹھ سکتا اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کا خیال صحیح تھا۔ دیکھو مسٹر! میرا مشورہ ہے کہ تم میرے ساتھ کوئی حرکت نہ کرنا سمجھے۔''

❁

لیتھ کا منہ وولی کو دیکھ کر بن گیا تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو کنٹرول کیا تھا ورنہ وہ وولی کو اور زیادہ جھاڑتا مگر اسے کچھ اتنا ہی تھا۔

اس نے مڑ کر دیوار کی سمت دیکھا۔ جہاں سفیدی پر پنسل سے لکیریں بنائی گئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے وہی پنسل اٹھائی جو وولی نے میز پر ڈال دی تھی پھر اس نے ٹھیک اسی جگہ وہی لکیر دوبارہ بنادی جہاں سے وولی نے پہلی والی لکیر مٹادی تھی۔

اس کے بعد وہ دیوار کے سامنے جا رکا۔ سب سے اوپر والا پنسل مارک اب اس کی آنکھوں کے برابر تھا بلکہ کچھ ذرا سا نیچے تھا۔ اس نے سوچا جلد یا بدیر وولی کو اصلیت کا علم ہو ہی جائے گا پھر وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔

''میرا قد تو واقعی بڑھ رہا ہے۔ وولی تم بتاؤ تمہارا جواز کیا ہے؟''



www.Paksociety.com

خونی ڈرامہ

راحیلہ تاج

ایک حساس دل شخص کی روداد' وہ اپنی بہن کے روشن مستقبل کا خواہاں تھا اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو بھی تیار تھا۔

پاکیزہ جذبوں سے گندھی حساس دلوں کے لیے ایک دل گداز تحریر

اگر کسی ماہر ڈاکٹر نے معائنے اور ایکسرے کے بعد کسی شخص کو یہ بتایا ہو کہ تم دو مہینے میں مر جاؤ گے اور ان دو مہینوں میں بھی تمہیں مرض کی شدید ترین تکلیفیں برداشت کرنا ہیں تو آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں کہ اس شخص کا کیا حال ہوگا۔ اس لیے کہ اگر آدمی یہ جان جائے کہ اسے اتنے دن میں مر جانا ہے تو پھر وہ شاید ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ تلخ ترین حقیقت جاننے کے بعد کہ میں دو مہینے میں مر جاؤں گا اسے جو سب سے پہلے خیال آئے گا وہ خودکشی کا خیال ہوگا۔ کم سے کم میں تو یہی سمجھتا ہوں پھر وہ شخص یہ سوچے گا کہ اگر میں نے خودکشی کر لی تو میرے متعلقین کا کیا ہوگا؟

ہفتے یعنی ٹھیک کرسمس کے پرمسرت دن مجھے ڈاکٹر ہیولاک نے بڑے تذبذب کے بعد بتایا کہ آپ دو مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہیں گے۔ لہٰذا اپنے بعد کے لیے آپ کو جو بندوبست کرنا ہے وہ کر لیجیے۔ میری جو کیفیت ہوئی اس کا اظہار فضول ہے۔ آخر میں نے خود کو ایک چلتی پھرتی لاش تصور کر لیا۔ اب میں صرف اپنی بہن کے بارے میں سوچتا تھا اور اب مجھے جو سانس بھی لینا تھا وہ اس کے لیے۔

میری بہن ایملی کے سوا دنیا میں میرا کوئی نہ تھا وہی میرے لیے سب کچھ تھی۔ وہ ابھی پڑھ رہی تھی۔ میرا ایک فارم تھا میرے بعد اس کی دیکھ بھال کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اپنی جائداد اور زندگی دونوں کا دس دس ہزار ڈالر کا بیمہ کرا لیا تھا یہ صرف ایملی کے مستقبل کا خیال تھا جو مجھے خودکشی سے باز رکھتا تھا اس لیے کہ خودکشی کی صورت میں میری دونوں پالیسیاں بیکار ہو جاتیں اور ایملی محروم رہ جاتی لیکن طبعی موت یا ایکسیڈنٹ کی صورت میں ایک تو میری جائداد رہن سے چھوٹ جاتی دوسرے بیمہ کمپنی میری واحد وارث ایملی کو دس ہزار ڈالر ادا کرتی۔

اس لیے مجھے اپنی دو مہینے کی عذابناک زندگی سے نجات پانے اور ایملی کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لیے کوئی اور ہی طریقہ اختیار کرنا تھا۔ میری خودکشی میں تو ایملی کا سراسر نقصان تھا۔ جس وقت میں ڈاکٹر کے یہاں سے واپس ہوا اس وقت ایملی گھر پر نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ میں نے اسے جو شکاری بندوق لا کر دی تھی وہ اسے لے کر شکار کو گئی ہوگی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ جب ایملی گھر واپس آئی۔ جیکی دم اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ خرگوش مار کر لائی تھی آتے ہی پوچھنے لگی۔ "یہ تو بتاؤ کارٹر ایکسرے رپورٹ کا کیا ہوا؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟"

میں نے اس سے جھوٹ بولا اور کہا۔ "میں تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ پریشان ہونے کی بات نہیں۔" یہ سن کر اس کا چہرہ دمک اٹھا اور بولی۔

"میرے خدا! میں اس وقت کتنی خوش ہوں۔"

کھانے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور ایملی سے کہا کہ میں کام سے شہر جا رہا ہوں۔ تم اب

جاؤ۔ باہر نکل کر میں نے اپنی پک اپ کو اسٹارٹ کیا اور فارم سے کچھ دور نکل آیا اور شہر جانے کی بجائے بالکل مخالف راستے پر روانہ ہوا تین چار میل طے کرنے کے بعد میں کالب کے فارم پر پہنچا جو اس نے ٹھیکے پر لے رکھا تھا وہ چھبیس سال کا ایک خوب صورت نوجوان تھا اور اس چھوٹے شہر کی لڑکیوں میں بے حد مقبول تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ایملی اسے پسند کرتی ہے لیکن جب ایملی کو میں نے سمجھایا کہ وہ بہت معقول نوجوان ہے لیکن اپنی کاہلی اور بے پروائی کی وجہ سے ایک بہتر مستقبل کی ضمانت نہیں دے سکتا تو اس نے کالب میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔

کالب مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا اور بولا۔

"مسٹر کارٹر آپ یہاں کہاں؟" وہ مجھے اپنے حقیر اور معمولی سے کمرے میں دیکھ کر کافی شرمندہ ہو رہا تھا۔

"میں تم سے ایک بہت اہم معاملے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔" وہ یہ سن کر بڑی سنجیدگی اور محویت کے ساتھ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "بات یہ ہے کالب تم کچھ دن پہلے تک میری بہن کے بارے میں سوچتے رہے ہو کیا ایسا نہیں ہے؟" وہ چونک اٹھا اور بولا۔

"لیکن مسٹر کارٹر میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس پر مجھے نادم ہونا پڑتا اور جب ایملی نے مجھے بتایا کہ آپ مجھ سے اس کا ملنا جلنا پسند نہیں کرتے اس دن سے میں نے اس سے بات تک کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

میں نے اس سے کہا۔ "یہ کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے اس وقت ایملی سترہ برس کی تھی اب چند مہینے کے بعد وہ انیس سال کی ہو جائے گی۔ اس وقت اس کی عمر کے پیش نظر میری یہی ذمہ داری تھی کہ میں اسے نصیحت کروں۔" وہ میری بات سن کر کافی حیران ہوا اور بولا۔

"شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اب آپ کو ہمارے ملنے جلنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"میں دراصل یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس کے بارے میں کس طرح سوچتے ہو۔ کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو یا یوں ہی وقت گزارنا مقصود ہے۔" وہ میری بات سن کر پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔

"آپ نے پوری سنجیدگی کے ساتھ پوچھا ہے اور میرے اوپر پوری طرح اعتماد کیا ہے تو میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے شادی کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں سوچا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایملی جیسی ساتھی کو پا کر میں اپنے آپ کو خوش نصیب نہیں سمجھوں گا بلکہ اصل بات وہی ہے جو آپ نے ایملی سے کہی تھی یعنی یہ کہ میں اس کے لیے ایسی زندگی فراہم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا جو اس کے شایانِ شان ہو۔"

"اچھا یوں فرض کرو کہ جیسے تمہارا اپنا ایک فارم ہے اور بینک میں دس ہزار ڈالر ہیں تب؟"

وہ حیران حیران سا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ "کیا آپ کا اشارہ خود اپنے فارم اور اپنے روپے پیسے کی طرف ہے۔ کیا آپ یہ سب کچھ ایملی سے میری شادی ہونے کی صورت میں مجھے دے ڈالنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"ہاں......"

وہ ساکت وصامت ہو گیا پھر رک رک کر کہنے لگا۔ "مگر کس لیے۔ کیا ایملی کسی ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئی ہے کہ......؟" میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور مجھے اس کی سوچ پر بہت غصہ آیا۔ میں اچانک چیخ پڑا۔ "کیا تمہارا دماغ خراب ہے تم اس کے بارے میں اس طرح بھی سوچ سکتے ہو۔"

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے میری بات سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے۔ میں ایملی کو ایک شریف ترین لڑکی سمجھتا ہوں۔ درحقیقت میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ آپ نے جو سوچا ہے اس کی وجہ کیا ہے؟"

"ہاں...... میں تمہیں یہی بتانا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ان باتوں کو راز میں رکھو گے اس لیے کہ اگر تم نے یہ پیش کش قبول نہ کی تو میں اس سلسلے میں ایک اور نوجوان سے گفتگو کروں گا۔"

"مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے غیر ذمے داری کی توقع نہیں کریں گے۔ میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں۔"

"نہیں مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ میں تمہارے خاندان کے کسی بھی فرد سے ایسی توقع نہیں کرسکتا۔ بہرحال صورت یہ ہے کہ چند دن پہلے میرے دل کا ایکسرے ہوا تھا۔ ایکسرے رپورٹ دیکھنے کے بعد ڈاکٹر ہیولاک نے بتایا ہے کہ میں دو مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہوں گا۔"

کالب یہ سن کر بہت ہی متاثر ہوا اور گہرے سکوت کے بعد بولا۔ "مجھے یہ سن کر بڑا دکھ پہنچا ہے لیکن کیا ڈاکٹر کو یقین ہے۔"

"ہاں۔ ریڈیولاجی کے ایک اسپشلسٹ اور دوسرے ڈاکٹروں نے بھی ایکسرے رپورٹ دیکھ کر یہی بتایا ہے کہ میرے بچنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے ایملی کا بندوبست کر جاؤں میں نے بیمے کی دو پالیسیاں لی ہیں۔ ایک میرے فارم کو رہن سے چھڑا دے گی۔ دوسری دس ہزار ڈالر کی پالیسی میری زندگی کے بیمے کی ہے۔"

"لیکن آپ نے ایملی کے لیے مجھے کیوں منتخب کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔"

"ایملی کو ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے فارم کا بندوبست کرسکے اور تم اس اعتبار سے ایک مناسب ترین آدمی ہو اور پھر میری تم سے ایک اور خواہش ہے جس کے عوض میں ایملی کو تمہارے حوالے کرسکتا ہوں۔"

"وہ خواہش کیا ہے؟"

"ڈاکٹر نے یہ بتایا ہے کہ میں اس بیماری کے باعث سخت تکلیف اٹھاؤں گا' آخری دنوں میں یہ تکلیف ناقابل برداشت ہوجائے گی۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق ڈیڑھ دو ہفتے میں شروع ہونے والی ہے۔ میں اس عذاب سے جلد از جلد نجات پانا چاہتا ہوں۔"

وہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں تم مجھے قتل کردو۔"

"قتل کردوں یہ کیسے ہوسکتا ہے اور پھر یہ کہ اس کی سزا موت ہے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں نے جو طریقہ سوچا ہے اس کے باعث یہ اقدام جرم نہیں قرار پائے گا اور کسی کو شک نہیں گزرے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"یہ بہت آسان ہے میں تم سے ایک مصنوعی دشمنی پیدا کرلوں گا۔ ہوگا یہ کہ تم ایملی سے میل جول پیدا کرنے میں سرگرمی اور بے احتیاطی کا مظاہرہ کرو گے میں اس پر سخت اعتراض کروں گا لیکن تم باز نہیں آؤ گے میں تمہیں قتل کرنے کی دھمکی دوں گا اور ایک رات بندوق لے کر تمہارے گھر جا پہنچوں گا اور دو ایک فائر بھی کروں گا تم اپنے بچاؤ میں مجھ پر گولی چلاؤ گے فرق یہ ہوگا تمہارا یہ عمل میرے ہلاک کرنے ہی کے لیے ہوگا اس صورت میں تمہارا کوئی قصور نہیں گا۔ عدالت تمہیں بے قصور قرار دے گی اور تم بری جاؤ گے۔" وہ میری بات سن کر خاموش ہوگیا اور نے لگا' پھر سر اٹھایا اور کہا۔

"آپ نے ایک پہلو پر توجہ نہیں دی۔ ایملی ایک ایسے شخص سے شادی کرنا کس طرح قبول کرے گی جس نے اس کے بھائی کو قتل کیا ہو۔"

"میں یہ سوچ چکا ہوں۔ میں تمہیں ایک تحریر دوں گا جس میں اس تمام واقعے کی تفصیل درج ہوگی تم قتل کے کیس سے بری ہونے کے بعد ایملی کو وہ تحریر دکھاؤ گے۔"

"لیکن وہ تحریر دیکھ کر بھی راضی نہ ہوئی تو؟ پھر یہ بھی تو ممکن ہے وہ اس تحریر کو پولیس کے حوالے کردے۔"

"میں ایملی کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ وہ کبھی ایسا نہ کرے گی اور اگر اس نے ایسا کیا بھی تو جیسا تم سمجھ رہے ہو تب بھی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"ہمارے ملک کے قانون کے مطابق کسی شخص پر قتل کے الزام میں دوبارہ مقدمہ نہیں چل سکتا۔ ایک بار بری ہونے کے بعد اگر تم خود بھی اعتراف قتل کرلو تب بھی تمہیں گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔"

"کیا آپ کو یقین ہے؟"

"ہاں......"

پھر میں نے بعض مثالیں پیش کیں جس کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تیار ہوگیا ہے۔ اس کے بعد میں نے اسے اپنا پورا منصوبہ سمجھایا اور گھر واپس آگیا۔

دوسری رات سال نو کی آمد کی تقریب میں بلدیہ ہال میں جشن کا اہتمام کیا گیا تھا ہم نے فیصلہ کیا کہ وہیں سے اس منصوبے پر عمل کیا جائے۔ جب میں ہال میں داخل ہوا تو وہاں بہت ہنگامہ تھا۔ میں مجسٹریٹ آموس ہارن کے برابر ایک گوشے میں جا کھڑا ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے کو نئے سال کی مبارکباد دی۔ اس کے بعد میں نے اچانک بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو یہ کالب اسٹل' ایملی کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔"

"ہاں آج یہ ایک دوسرے میں اس طرح گم ہیں کہ انہوں نے کسی اور کے ساتھ رقص ہی نہیں کیا۔"

میں آگے بڑھا اور کالب کا کندھا پکڑ کر اسے اپنی طرف گھمایا۔ اس وقت آرکسٹرا بجنا بند ہوگیا۔ ہال میں جتنے لوگ تھے انہوں نے مجھے یہ کہتے ہوئے سنا۔ "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آئندہ تمہیں ایملی کے ساتھ بات کرتے نہ دیکھوں۔"

کالب نے جواب دیا۔ "مسٹر کارٹر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ایملی کوئی بچی نہیں ہے وہ اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہے۔ آپ اس کے باپ نہیں ہیں۔"

میں نے یہ سنتے ہی اس کا کالر پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے چلایا۔ "میں کچھ نہیں جانتا میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ اگر میں نے دوبارہ تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تو انجام کے ذمہ دار تم خود ہی

حادثہ

ایک پروفیسر کسی سوچ میں مگن تھے کہ نیچے سے آواز آئی۔ "پروفیسر جی! آپ کی بیٹی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔" یہ سن کر فوراً بوکھلا کر چھت سے نیچے چھلانگ لگادی۔ جب وہ آٹھویں منزل پر پہنچے تو انہیں یاد آیا کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ جب وہ پہلی منزل پر پہنچے تو انہیں یاد آیا کہ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔

(ثنا خان......لاہور)

www.Paksociety.com

ہو گے سمجھے یا نہیں؟"

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا گریبان چھڑایا۔

اس وقت میں نے ایملی کی رندھی ہوئی آواز سنی وہ کہہ رہی تھی۔

"کارٹر خدا کے لیے بس کرو۔" میں نے کالب کے منہ پر ایک ہاتھ مارا۔ اس نے جواب میں اتنا زور دار تھپڑ مارا کہ میں گر پڑا اور میں نے چیخ کر کہا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس موقع پر مجسٹریٹ آموس ہارن آگے بڑھا اور اس نے کالب اسٹل کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایملی نے مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ میں پھر چیخا۔

"سن لیا کالب میں تجھے قتل کر دوں گا۔"

مجسٹریٹ آموس بولا۔ "کوئی کسی کو قتل نہیں کرے گا۔" ایملی نے میرے چہرے پر نظر ڈالی اور جب یہ دیکھا کہ کوئی ضرر نہیں پہنچا ہے تو بڑی اذیت کے ساتھ بولی۔

"میں سمجھتی ہوں کہ تم نے اس تقریب کو پوری طرح خراب کر دیا ہے۔ اب مجھے گھر پہنچا دو۔" وہ راستے بھر خاموش رہی۔

جب وہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو بولی۔ "تمہیں میرے معاملے میں اس طرح حکم چلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں جس لڑکے کے ساتھ چاہوں گی رقص کروں گی۔" اس کا ردعمل میری خواہش کے مطابق تھا۔ اگر وہ کہتی کہ اب میں کالب سے نہیں ملوں گی تو میرا سارا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔

دوسرے دن شام کو کالب اپنی پرانی پک اپ میں ہمارے فارم پر آیا۔ میں دروازہ کھول کر برآمدے میں داخل ہوا تو ایملی تیزی سے سیڑھیوں سے اتر رہی تھی۔ کالب نے میرے پاس آ کر کہا۔ "مسٹر کارٹر میں رات کے معاملے کے سلسلے میں آیا ہوں، مجھے آپ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" میں نے بڑے روکھے لہجے میں کہا۔ "ہاں۔"

"میں معافی نہیں مانگ رہا۔ آپ ہی نے پہلے میرے اوپر ہاتھ اٹھایا تھا۔ میں نے تو صرف مصالحت کی پیش کش کی ہے۔"

پیچھے سے ایملی کی آواز آئی۔ "کالب یہاں کیوں نہیں آ جاتے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" میں بولا پھر میں کالب کو خدا حافظ کہہ کر اندر جانے لگا تو ایملی نے مجھے دروازے میں ہی روک لیا اور کہنے لگی۔

"یہ گھر میرا بھی ہے۔ کالب یہاں آؤ۔"

میں تیزی سے اندر گیا اور بندوق لے کر واپس آیا۔ لیکن ایملی نے ایک ہاتھ سے بندوق کی نال اور دوسرے ہاتھ سے میری کلائی پکڑ لی اور ہانپتے ہوئے بولی۔

"تم پاگل ہو گئے ہو کارٹر؟"

"کیا بک رہی ہو تم جان کی حفاظت کرنے کو دیوانگی سمجھتی ہو۔"

"خدا کے لیے کارٹر آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ میں اسے لوٹائے دیتی ہوں۔" اس نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔ پھر دوڑ کر برآمدے میں گئی اور کالب سے کہا۔ "تم میری خاطر یہاں سے چلے جاؤ۔ میں تم سے پھر کسی وقت بات کروں گی۔ اس کے بعد واپس آ کر مجھ سے کہنے لگی۔

"تم نے حد کر دی ہے پاگل ہو گئے ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہاری فرمانبرداری کی ہے لیکن اب میں تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ کالب ہو یا کوئی اور میں جس سے چاہوں گی ملوں گی تم مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔"

"اگر تم نے ایسا کیا تو میں اسے گولی سے اڑا دوں گا۔" میں نے غضب ناک ہو کر جواب دیا۔

"تو پھر تمہیں سزائے موت بھی ہو گی اور میں تماشا دیکھنے آؤں گی۔"

رات کے کھانے کے بعد وہ جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کالب کے یہاں گئی ہے۔ میں نے مجسٹریٹ آموس کو فون کیا اور کہا۔ "میں کارٹر بول رہا ہوں۔ میری بہن گھر سے نکلی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ کالب کے پاس گئی ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کالب اسٹل کو گرفتار کر لیں۔"

"لیکن کس جرم میں کارٹر؟"

"جبر اور تجاوز کے جرم میں، ایملی نابالغ ہے اور کالب کی عمر ۲۶ سال ہے۔"

"اچھا میں جاتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اس تک میرا پیغام پہنچا دیں......؟"

"کیا......!"

"یہ کہ اگر اب وہ حیلے بہانے سے میری بہن کو اپنے گھر لے گیا تو میں آپ کو فون نہیں کروں گا، بلکہ بندوق لے کر سیدھا اس کے پاس پہنچوں گا۔"

"یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

کوئی ایک گھنٹے بعد ایملی واپس آئی اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد آموس کا فون آیا اس نے بتایا "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے وہ دونوں تو بیٹھے باتیں کر رہے تھے تم کالب اسٹل کے بارے میں غلط سوچ رہے ہو۔ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے۔"

"کیا آپ نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟"

"دیکھو......"

"میں نہیں چاہتا کہ تم مزید اس موضوع پر گفتگو

aanchal.com.pk

تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں



پرچہ نہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

www.Paksociety.com

کرو۔ اگر کالب کسی حادثے سے دوچار ہوا تو میں تمہارے اور اپنے تعلقات کا لحاظ کیے بغیر تمہیں گرفتار کرلوں گا۔"

میں نے اپنا کردار بڑی خوبی سے ادا کیا تھا اب مجھے آئندہ شب میں اپنے منصوبے کے آخری حصے پر عمل کرنا تھا۔ یعنی کالب اسل کو مارنے کے لیے جاتا اور خود ہلاک ہوجاتا تھا کیا ایمیلی سوچ سکتی تھی کہ میں اس کے لیے کیا کررہا ہوں۔

☆☆☆☆

دوسرے دن اتوار تھا' میں چرچ جانے کے لیے تیار ہوا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ایمیلی آج میرے ساتھ نہیں جائے لیکن وہ میری توقع کے خلاف جلدی سے تیار ہوکر میرے ساتھ چرچ روانہ ہوگئی۔ اس وقت وہ بالکل نارمل نظر آرہی تھی۔ چرچ میں دعا کے بعد مجسٹریٹ آموسی اور اس کی بیوی کو ایک گوشے میں لے جاکر بات کی پھر وہ کالب کو باہر جاتے دیکھ کر اس کی طرف لپکی اور اس سے کچھ کہا۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اس کے بعد وہ میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی' اسی دوران آموسی اور اس کی بیوی بھی باہر نکل آئے' آموسی نے اس سے پوچھا۔

"تمہیں ہم سے کیا کہنا تھا۔"

"جناب مجھے آپ دونوں کو اس بات کا گواہ بنانا ہے کہ میں کالب اور کارٹر کا جھگڑا ختم کرانا چاہتی ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ میں کالب کے قتل کی ذمے دار قرار پاؤں اور میرے بھائی کو سزائے موت ہو۔ مجھے کالب سے عشق ہوتا تو میرا طرز عمل کچھ اور ہوتا۔ میں اسے صرف پسند کرتی ہوں۔ آج میں اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ آئندہ میں کالب سے کوئی سروکار نہیں رکھوں گی۔"

میں اور کالب دونوں اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے میرے سارے منصوبے کو خاک میں ملا دیا تھا۔ رات کو میں دوبارہ کالب کے فارم پر گیا اور کہا۔

"اب کیا کیا جائے؟"

"اب ہمیں لڑائی کا کوئی اور بہانہ تلاش کرنا ہوگا' کوئی ایسا اقدام کرو جس سے میں اشتعال میں آکر تمہیں ہلاک کرنے تمہارے فارم پر آؤں۔"

"ایک بات ہوسکتی ہے تمہارا کتا جیکی چند روز سے میرے فارم پر آرہا ہے میں اسے مار ڈالوں گا اور تمہیں ایک معقول وجہ مل جائے گی۔"

"ہاں یہ بالکل ٹھیک ہے۔" اس کے بعد ہم نے منصوبے کی تفصیل طے کی۔

دوسرے دن صبح میں کیفے آگیا۔ دس بجے کالب بھی وہاں پہنچ گیا وہاں بیٹھ کر اس نے بلند آواز میں کہا۔

"کل ایک منحوس کتے نے میری کئی مرغیاں مار ڈالیں۔"

اس پر میں بولا۔ "اس طرف تو میرا ہی ایک کتا ہے اور اس نے تو ایسا نہیں کیا۔"

کالب نے درشت لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے تمہارے کتے کا ذکر نہیں کیا۔ اب اگر میں نے اس کتے کو اپنے فارم میں دیکھا تو اسے گولی سے اڑادوں گا۔"

"تم جیکی کو مار کر دیکھنا پھر معلوم ہوگا تم کس طرح زندہ رہتے ہو۔"

کیفے میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے اس گفتگو سے گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ کالب نے اپنا وہسکی کا گلاس خالی کیا اور باہر نکل گیا۔

اس رات برف باری ہوئی۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ برف باری کی وجہ سے موسم کی جو کیفیت ہوگی وہ جیکی کو خرگوشوں کے پیچھے جانے پر اکسائے گی اور ہوا بھی یہی۔ صبح کو جب وہ دم ہلاتے ہوئے ایمیلی کو کالج کی بس میں سوار کراچکا تو تیزی سے راستے پر ہولیا۔ میں گزشتہ روز کی طرح شہر روانہ ہوگیا اور کیفے میں جابیٹھا۔ کوئی ایک بجا ہوگا کہ دروازہ کھلا اور ایمیلی اندر داخل ہوئی۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس پر نظر ڈالی۔ اس نے کہا۔ "میں نے باہر تمہاری پک اپ کھڑی دیکھی تو یہاں چلی آئی۔ تم شہر کیوں آئے تھے؟"

"مگر تم اس وقت کالج کی بجائے یہاں کیوں ہو؟"

"یہاں تو میں تمہیں دیکھنے آگئی تھی۔ کھانے کا وقت تھا۔ میں اپنی ایک دوست کے ساتھ ریستوران میں کھانا کھانے آئی تھی۔"

اسی وقت کالب کا ایک ہمسایہ رابرٹ بھی وہاں آگیا۔ ہم نے اپنے اپنے منصوبے کے ایک خاص حصے کے لیے رابرٹ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ ایک تنہائی پسند بوڑھا تھا اور اسے میری اور کالب کی دشمنی کے اس ڈرامے کی کوئی خبر نہیں تھی اس نے کہا کہ میں ابھی تمہارے گھر گیا تھا۔ تم وہاں نہیں ملے تو میں یہاں آگیا۔

"کیا بات ہے۔"

"کالب نے ایک پیام دے کر مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اس نے کہا ہے کہ چونکہ تمہارا کتا پھر اس کی مرغیوں کے پیچھے گیا تھا' لہٰذا اس نے اسے مار ڈالا ہے تم اس کی لاش لے جاؤ۔"

میں غصے سے بے قابو ہوکر چیخنے لگا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

پھر میں دروازے کی طرف جھپٹا لیکن ایمیلی نے مجھے دھکا دے کر گرادیا۔ اور باہر دوڑ پڑی۔ جب تک میں اٹھتا وہ پک اپ لے کر جاچکی تھی۔ میرا منصوبہ درہم برہم ہوا جارہا تھا۔

میں نے کیفے میں واپس آکر رابرٹ سے کہا کہ تم مجھے اپنی گاڑی میں لے چلو۔ جلد بہت جلد۔"

"میں اس معاملے میں تمہاری مدد نہیں کرسکتا۔"

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر گاڑی کی طرف لے کر آیا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ جب میں اپنے فارم کے قریب پہنچا تو پک اپ ہاں موجود تھی گویا ایمیلی مجسٹریٹ کو اطلاع دینے نہیں گئی تھی۔ میں نے گاڑی سے اتر کر آواز لگائی۔

"ایمیلی ...... ایمیلی۔" مگر کوئی جواب نہ ملا پھر اندر جاکر اپنی بندوق اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ پک اپ وہاں سے اب غائب ہوچکی تھی۔ میں سمجھ گیا وہ کالب کو اطلاع دینے گئی ہے۔ میں نے رابرٹ سے کہا کہ گاڑی سے اتر آؤ وہ بڑبڑاتا ہوا گاڑی سے اتر گیا اور بولا۔

"کیوں پاگل ہوئے ہو کارٹر۔ ایک کتے کی اتنی قیمت نہیں ہے کہ تم اپنی جان خطرے میں ڈال لو۔"

میں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ جب میں کالب کے فارم پر پہنچا تو مجھے جیپ نظر آئی۔ ایمیلی نے مجھے دیکھتے ہی جیپ روک لی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور رنگ اڑا ہوا تھا۔ وہ لرز رہی تھی۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"یہ میں...... نہیں دیکھ سکتی تھی کہ تم کالب کو قتل کرکے موت کی سزا پاؤ۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ تمہیں تمہارے ارادوں سے باز نہیں رکھا جاسکتا اور پھر یہ کہ جیکی صرف تمہارا ہی نہ تھا وہ میرا بھی تھا۔ اس لیے ...... اس لیے میں نے کالب کو قتل کردیا۔"

میں نے دیکھا جیپ کی پچھلی نشست پر شکاری بندوق پڑی ہوئی تھی۔

☯

www.Paksociety.com



حسام بٹ

وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ اس کی بازی گری اور رنگا رنگی انسانوں کو عجیب تماشے دکھاتی ہے۔ جو لوگ وقت کی آواز نہیں سمجھتے وہ اس کا شکار ہوکر حالات کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ گزرے ہیں جنہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں وقت کی باگیں موڑ دیں حالات کا رخ تبدیل کرکے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ تاریخ میں امر ہوکر رہ گئے۔ آج ان کا نام فخر سے لیا جاتا ہے۔

ایک آشفتہ سر نوجوان کی سرگزشت' اس نے پھولوں کی چاہ کی تھی مگر حالات نے اس کا دامن کانٹوں سے بھردیا مگر اس نے وقت کے آگے سپر ڈالنے کی بجائے اس سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔

سطر سطر تجسس قدم قدم ہنگامے لیے نئے افق کی دلچسپ و دلکش سلسلے وار کہانی

یقین بڑی عجیب وغریب چیز ہے۔ انسان کو کسی شے کا یا تو یقین ہوتا ہے یا پھر یقین نہیں ہوتا۔ جس امر کی توقع پہلے سے ذہن میں موجود ہو اس پر یقین کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگتا۔ جبکہ غیر متوقع حالات و واقعات کو کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ان لمحات میں میرا ذہن غیر یقینی کی سی کیفیت کا شکار تھا کیونکہ میں نے کھلی آنکھوں سے جو منظر دیکھا وہ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

میری نگاہ کار پورچ پر جمی تھی۔ جہاں گرے ہائی روف پہلے سے موجود تھی اور اس کے پہلو میں ندیم شیروانی کو لے کر آنے والی سیاہ جیپ رک چکی تھی اور اس کے یکے بعد دیگرے کھلنے والے دروازوں نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ جیپ کی پچھلی نشست سے ندیم شیروانی اور اس کا غیر ملکی دوست بر آمد ہوئے تھے۔ غیر ملکی شخص کا تعلق امریکا یا کسی یورپی ملک سے معلوم ہوتا تھا۔ اس غیر ملکی باشندے کی عمر چالیس کے قریب ہی ہوگی۔ وہ دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ میں توقع کررہا تھا کہ شیروانی کے ساتھ میری جان تمنا فرحانہ جیپ سے باہر آئے گی لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ ممکن ہے' فرحانہ جیپ کی اگلی سیٹ پر ہو اور یہی سوچ میرے چونکنے اور بے یقینی کا سبب بن گئی تھی کیونکہ اگلی نشست سے باہر آنے والے کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا تھا۔ اس کھلی حقیقت پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میری بینائی میں کسی قسم کا کوئی ضعف نہیں تھا جو اس شخص کو پہچاننے میں مجھے کسی دقت کا سامنا ہوتا۔ وہ درجنوں' سیکڑوں بار کا دیکھا ہوا چہرہ تھا میں اس چہرے کو کیسے فراموش کرسکتا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں میرے تیر سے شکار ہونے والا' فارماسیوٹیکل کمپنی کا سابق مارکیٹنگ منیجر مرزا یاسین بیگ تھا۔

مرزا یاسین بیگ اور یہاں ندیم شیروانی کے ہمراہ۔

میرا ذہن ان کے باہمی تعلق کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگر ان دونوں شیطانوں کے بیچ دیرینہ مراسم تھے تو پھر اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی

جاسکتی تھی کہ شیروانی نے مرزا کو میرے بارے میں سب کچھ بتادیا ہوگا۔ یہ بات بھی مرزا کے علم میں آچکی ہوگی کہ جس لڑکی کو شیروانی نے یرغمال بنا رکھا ہے اس سے میرا قلبی تعلق ہے۔

وہ بہت ہی نازک اور حساس لمحات تھے۔ اس دوران میں جیپ کا ڈرائیور بھی باہر نکل چکا تھا۔ میری بے تاب نگاہ جس پری وش کو دیکھنا چاہتی تھی اس کا دور دور تک نشان نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ فرحانہ اس جیپ میں نہیں آئی تھی۔ اس کی عدم موجودگی سے میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا تھا۔ پتا نہیں' اس خبیث شیروانی نے میری فرحانہ کے ساتھ کیا کیا تھا اور اسے کہاں قید کررکھا تھا۔

شیروانی جیپ سے نکلنے کے بعد دو سیکنڈ سے زیادہ کارپورچ میں نہیں رکا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے ڈرائیور سے کچھ کہا اور اپنے ساتھ آنے والے دونوں افراد کی معیت میں بنگلے کے اندر داخل ہوگیا۔ اس کے انداز سے عجلت کا اظہار ہوتا تھا۔

میں گن سونتے' راہ داری کے آخری کنارے پر کھڑا تھا۔ میں نے دانستہ ایسا زاویہ لے رکھا تھا کہ میں تو کارپورچ کے منظر کو بڑے واضح انداز میں دیکھ سکتا تھا مگر وہاں موجود افراد مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے اور وہاں کارپورچ میں اب صرف دو افراد نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک تو وہی ڈرائیور تھا جسے شیروانی کوئی اشاراتی ہدایت دے کر گیا تھا اور دوسرا اس بنگلے کا کوئی ملازم تھا۔ گولی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے علاوہ بنگلے پر دو اور افراد بھی ہیں جو دیگر کام سنبھالتے ہیں۔ یہ بندہ انہی میں سے کوئی ہوسکتا تھا۔ شیروانی کا ڈرائیور دبلا پتلا اور دراز قد تھا جبکہ اس کے ساتھ موجود شخص پستہ قامت' گورا چٹا اور کلین شیو تھا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے گردن گھما کر گولی کی طرف دیکھا اور میرے سینے سے ایک بوجھل سانس خارج ہوکر رہ گئی۔ چند لمحات پہلے یہ بندہ میری فوری کارروائی کے نتیجے میں راہ داری کے فرش پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ میں نے چرے ہوئے دستے والا پنچ کس اس سرعت سے گولی کے حلق میں اتارا تھا کہ اسے اپنا بچاؤ کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک تڑپنے پھڑکنے کے بعد ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی اور دوبارہ کارپورچ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

میں نے دیکھا ڈرائیور نے کلین شیو بندے کو کچھ سمجھا کر میری جانب روانہ کردیا تھا گویا اس نے شیروانی کی ہدایات کو آگے منتقل کردیا تھا۔ گورا چٹا پستہ قامت شخص نپے تلے قدموں کے ساتھ راہ داری کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس طرف میں تھا یا پھر میرا نگران گولی۔ اس بندے کو یقیناً میرے حوالے سے یا پھر گولی کے حوالے سے ہدایات دی گئی تھیں۔ گولی کی لاش راہ داری کے فرش پر پڑی تھی۔ پھٹے ہوئے حلقوم سے خون کا جو فوارہ چھوٹا تھا اس نے گولی کے لباس کو رنگنے کے علاوہ راہ داری کے فرش کو بھی آلودہ کردیا تھا۔ وہ ایک وحشت ناک منظر تھا۔

اتنا وقت نہیں تھا کہ میں گولی کی لاش کو ادھر ادھر کردیتا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اگر میں کوئی جگہ دیکھ کر بہ فرض محال گولی کی لاش کو کہیں چھپانے میں کامیاب ہو بھی جاتا تو کمرے کا کھلا ہوا دروازہ وہاں ہونے والی ہنگامی کارروائی کا راز فاش کردیتا۔

میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ مجھے جو بھی کرنا تھا' چند سیکنڈ میں کرنا تھا۔ کلین شیو بندہ اب تب میں راہداری تک پہنچنے ہی والا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور میرے ہاتھوں میں ایک خطرناک گن موجود تھی۔

www.Paksociety.com

آتشیں ہتھیار کو استعمال کرنے کا مجھے کوئی عملی تجربہ نہیں تھا تاہم "مرتا کیا نہ کرتا" کی روشنی میں یہ کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں تھا بس ٹریگر ہی تو دبانا تھا میں ایک فوری فیصلے پر پہنچ گیا۔

یہ فیصلہ کلین شیو بندے کو جہنم واصل کرنے کا نہیں تھا۔ میں ایسی حماقت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر میں اسے شوٹ کر دیتا تو فائر کی آواز پورے بنگلے میں گونجتی اور آن واحد میں وہاں موجود تمام افراد میری جانب دوڑ لگا دیتے۔

میں کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ میں قید سے آزاد ہو چکا تھا اور ایک خطرناک گن میری دسترس میں تھی۔ جسے میں حسب ضرورت کسی بھی وقت استعمال کر سکتا تھا۔ گوئی کی خون آلود لاش اور کمرے کا ٹوٹا ہوا دروازہ یہ کہانی سنانے کے لیے بہت کافی تھا کہ میں گولی کو قتل کر کے وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔

میرے ذہن نے جو فیصلہ کیا تھا اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں دبے قدموں اسی کمرے کی سمت کھسک گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں ایک قیدی کی حیثیت سے بند تھا۔ وہ کلین شیو بندہ گولی کو مردہ حالت میں فرش پر پڑے دیکھ کر صورت حال کی سنگینی کو بھانپ لیتا۔ پھر اس کے پاس دو ہی آپشنز رہ جاتے۔ نمبر ایک وہ گولی کو اپنے ہی خون میں لت پت دیکھ کر خوف سے چلا اٹھتا اور واپسی کے راستے پر دوڑ لگا دیتا تاکہ دوسرے لوگوں کو اس سانحے کے بارے میں آگاہ کر سکے۔ نمبر دو وہ جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھتا اور قیدی کو کمرے کے اندر تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ اس صورت میں میں بہ آسانی اس پر قابو پا سکتا تھا۔ میں ٹوٹے ہوئے دروازے کے عقب میں گن تھامے ریڈ الرٹ ہو گیا۔

چند ہی لمحات کے بعد راہداری کی جانب سے قدموں کی چاپ ابھری۔

کلین شیو شخص راہداری کے قریب پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"سکندر......!"

وہ کسی سکندر کو پکار رہا تھا۔ پتا نہیں یہ سکندر کون تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تو اسے گولی کو پکارنا چاہیے تھا جو میری کڑی نگرانی پر مامور تھا۔ عین ممکن تھا گولی کا اصلی نام سکندر ہی ہو۔

"سکندر۔" ایک مرتبہ پھر اس کی آواز ابھری۔

میں نے سانس روکی اور کسی بھی نوعیت کی ایمرجنسی کے لیے تیار ہو گیا۔ اس بات کے امکانات کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ گولی کی لاش کا جائزہ لینے کے بعد وہ کمرے میں جھانکنے کی کوشش کرتا۔ میں نے اپنی سماعت کو راہداری پر مرکوز کر دیا اور آنے والے سنسنی خیز لمحات کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے جس مقام پر گولی کا جھٹکا کیا تھا وہ راہداری کے تقریباً وسط میں واقع تھا۔ میں دروازہ توڑ کر جب کمرے سے باہر نکلا تھا تو راہداری میں گولی سے میری مڈبھیڑ ہو گئی تھی اور ہم گتھم گتھا لڑھکتے ہوئے دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر چلے گئے تھے۔ جہاں میں نے پھٹے ہوئے دستے والا اسکرو ڈرائیور اس کے نرخرے میں پیوست کر کے اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا تھا۔ اب اس کی لاش راہداری کے آخری سرے اور کمرے کے دروازے کے درمیان پڑی تھی۔

میں نے دروازے کو کھلا ہی رہنے دیا تھا اور اس کے پٹ کے پیچھے پناہ لے رکھی تھی۔ اگلے ہی لمحے کلین شیو شخص راہ داری کے اندر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی جھنجلائی ہوئی آواز بھی ابھری۔

"سکندر کہاں ہو تم' میری بات کا جواب دو...!"

بولتے بولتے وہ تشویش ناک انداز میں رک گیا۔ میرے اندازے کے مطابق گولی کی لاش پر اس کی نظر پڑ گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے حلق سے وحشت بھری آواز خارج ہوئی۔

"اوہ مائی گاڈ' سکندر کی لاش اسے کس نے قتل کیا ہے؟"

پھر یقیناً اس کی نگاہ کمرے کے دروازے کی طرف اٹھی ہو گی۔ "تو یہ اسی قیدی کا کارنامہ ہے۔" اس کی وحشت میں اب دہشت بھی شامل ہو گئی تھی۔ "لگتا ہے وہ حرامی گولی کو مار کر فرار ہو گیا ہے۔"

اس بدبخت نے مجھے بڑی غلیظ گالی دی تھی مگر یہ وقت جوش میں آنے کا نہیں بلکہ ہوش میں رہ کر حالات کے مقابلہ کرنے کا وقت تھا۔

اغلب امکان اس بات کا تھا کہ اب وہ کمرے کے اندر جھانک کر تسلی کرنا چاہے گا کہ میں واقعی وہاں سے فرار ہو چکا ہوں یا ابھی تک کمرے کے اندر ہی موجود ہوں لیکن اس نے میری توقع کے خلاف ردعمل ظاہر کیا۔ میں نے راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی اور محسوس کر لیا کہ وہ اس سانحے کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو باخبر کرنے گیا ہے۔ اگلے ہی لمحے اس کی وحشت زدہ آواز بھی ابھری۔

"شہبازی' شہزاد ادھر آؤ اس خطرناک قیدی نے سکندر کو قتل کر دیا ہے۔"

اس سے یہ واضح ہو گیا تھا کہ گولی کا اصلی نام ہی سکندر تھا۔

کلین شیو بندہ اپنے ساتھیوں کو پکارتے ہوئے راہ داری سے رخصت ہوا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ شہبازی اور شہزاد اس کی پکار کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے۔ گولی کی موت اور میرے فرار کا واقعہ کوئی معمولی نوعیت کا نہیں تھا۔ اس بنگلے میں پچھلے اٹھارہ بیس گھنٹے سے جو ہو رہا تھا اور آئندہ بھی ہونے والا تھا۔ وہ سب میری ذات کے گرد گھومتا تھا لہٰذا مجھے نظر انداز کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا یعنی کوئی لمحہ جاتا تھا کہ راہداری میں ایک بھونچال آنے والا تھا اور مجھے اس بھونچال کی آمد سے پہلے خود کو کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچانا تھا۔

وہ نہایت ہی فیصلہ کن لمحات تھے۔ میں اس وقت کمرے کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے عقب میں موجود تھا۔ اس کمرے کو کسی بھی حوالے سے محفوظ مقام نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اگر ان لوگوں پر یہ تاثر قائم ہو رہا تھا کہ میں گولی کو مار کر بنگلے سے فرار ہو گیا ہوں تو یہ تاثر برقرار رہنا چاہیے تھا۔ میں اپنے دشمنوں کو اس بنگلے میں زندہ سلامت چھوڑ کر کہیں جانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ البتہ تھوڑی دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو جانا ضروری تھا۔

اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں خود کو چھپانے کے حوالے سے کوئی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کر پاتا۔ جو بھی کرنا تھا لمحے بھر میں ان لوگوں کی آمد سے قبل کرنا تھا۔ میرے ذہن میں راہداری کا وہ کونا چمکنے لگا جہاں کھڑے ہو کر میں نے کار پورچ میں سیاہ جیپ سے ندیم شیروانی اور مرزا یاسین بیگ کو نکل کر بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب جاتے دیکھا تھا۔ راہداری کے اس سرے پر لکڑی کا اچھا خاصا سامان رکھا ہوا تھا۔ دو تین دروازے اور کھڑکیاں بھی تیار حالت میں دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں اور بڑھئی کا مخصوص اڈا بھی وہاں نظر آ رہا تھا۔ اس بنگلے میں لگنے والے کھڑکیاں اور دروازے اس مقام پر کارپینٹر نے تیار کیے تھے اور یہ

کام ابھی تک جاری تھا۔ وہ بنگلہ ابھی مکمل طور پر تیار نہیں ہوا تھا۔ تعمیری مراحل مکمل ہوچکے تھے تزئین و آرائش کا کام عمل میں تھا۔ میں دیوار کے ساتھ کھڑے ایک دروازے کی اوٹ میں چلا گیا اور ان لوگوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

یہ انتظار ان سے کسی ملاقات کے لیے نہیں تھا بلکہ مجھے لمحاتی مہلت درکار تھی۔ اتنی مہلت جب وہ راہداری میں داخل ہوکر گولی کی لاش کی جانب پیش قدمی کرتے وہ جیسے ہی راہداری میں پہنچتے مجھے وہاں سے نکل جانا تھا۔ نہایت ہی چپکے سے رازداری کے ساتھ اور بنگلے کے اندرونی حصے کا رخ کرنا تھا جہاں میرے اصل دشمن موجود تھے۔ میں نے اس آزادی کے لیے ایک قیمت چکائی تھی جسے مع سود وصول کرنے کا وقت آگیا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں نے دروازے کے پیچھے سانس روک لی۔ قدموں کی آواز سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک سے زیادہ افراد تھے پھر جب وہ راہداری میں داخل ہوئے تو ان کی گفتگو سے پتا چلا وہ دو افراد تھے۔ میں ان کے چہرے تو نہیں دیکھ پا رہا تھا تاہم آوازوں سے یہ کھل گیا کہ ان دو میں وہ کلین شیو شامل نہیں جو تھوڑی دیر پہلے گولی کی لاش کا معائنہ کرکے گیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے یہی فیصلہ کیا تھا کہ ان کے راہداری میں پہنچتے ہی میں وہاں سے نکل جاؤں گا مگر ان کی باتوں نے مجھے چند لمحات وہاں رکنے پر مجبور کردیا۔

''شہبازی! تم کہاں مر گئے تھے یہاں اتنا بڑا واقعہ ہوگیا اور تمہیں کچھ خبر ہی نہیں۔''

ان میں سے ایک نے دوسرے کو ڈانٹا تو ڈانٹ کھانے والے کا نام مجھے معلوم ہوگیا۔ اس کے جواب نے دوسرے کے نام کا راز بھی کھول دیا۔

''یار شہزاد! ابھی تم لوگوں کے آنے سے پہلے تو سب ٹھیک تھا۔''

یہ وہی شہزاد اور شہبازی تھے جنہیں تھوڑی دیر پہلے کلین شیو شخص نے چلا کر مخاطب کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق شہزاد اس دراز قد ڈرائیور کا نام تھا جو سیاہ جیپ کو ڈرائیو کرکے یہاں تک لایا تھا۔

''جب سب ٹھیک تھا تو پھر وہ قیدی کہاں گیا؟'' شہزاد نے غصیلے لہجے میں دریافت کیا۔ ''سکندر کی لاش دیکھ کر صاف پتا چل رہا تھا کہ اس قیدی نے بڑی بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتارا ہے اور یہاں سے فرار ہوگیا ہے۔''

''اگر وہ بندہ اس بنگلے سے نکلتا تو مجھے ضرور پتا چلتا۔''

شہبازی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں صبح سے مسلسل گیٹ پر موجود ہوں۔''

''کسی خطرناک قیدی کو جو ایک قتل بھی کرچکا ہو فرار ہونے کے لیے گیٹ کا رخ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔'' شہزاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ تمہاری آنکھوں میں دھول جھونک کر جاچکا ہے۔''

''نہیں شہزاد میں سمجھتا ہوں' وہ بندہ ادھر بنگلے میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔'' شہزاد کے ساتھ آنے والے شہبازی نے بڑے وثوق سے کہا۔ ''میں اسے ڈھونڈتا ہوں۔''

بات مکمل کرتے ہی شہبازی نے اس کمرے کی جانب پیش قدمی کی جہاں مجھے قید کیا گیا تھا۔ شہزاد ڈرائیور کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی' وہ شہبازی سے مخاطب ہوکر تنبیہی انداز میں کہہ رہا تھا۔

''جو بھی کرنا ہے' ایک منٹ سے پہلے کرلو۔ عمران' باس کو اس واقعے کی اطلاع دینے گیا ہے تم اس بنگلے کے محافظ ہو۔ تم کیسے محافظ ہو ایک خطرناک قیدی

اپنے نگران کو قتل کرکے یہاں سے فرار ہوگیا اور تمہیں کچھ خبر ہی نہیں۔ باس تمہاری کھال کھینچ لے گا۔ وہ ابھی یہاں پہنچ رہا ہے اور میں بھی ادھر جا رہا ہوں۔''

''باس۔'' سے شہزاد کی مراد یقیناً شیروانی ہی تھی اور عمران کا مطلب تھا وہی کلین شیو بندہ جو تھوڑی دیر پہلے راہداری میں گولی کو مردہ حالت میں پڑے دیکھ کر گیا تھا۔

شہزاد نے جن عزائم کا اظہار کیا تھا اس پر فوراً عمل بھی کر ڈالا یعنی بات ختم کرتے ہی وہ اپنے باس کے استقبال کے لیے راہداری سے نکل گیا۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ شہبازی کمرے میں میری تلاش میں ناکامیاب رہنے کے بعد باہر نکلے گا اور عین ممکن تھا وہ مجھے کھوجنے کے لیے اس دروازے کا رخ کرتا جس کے پیچھے میں نے پناہ لے رکھی تھی۔ گولی کی موت اور میرے فرار کے حوالے سے اس بنگلے پر جو کچھ بھی پیش آیا تھا وہ شہبازی کی کوتاہی میں شمار ہوتا لہٰذا وہ اپنی گردن بچانے کے لیے کچھ بھی کرسکتا تھا۔

میں نے ایک حتمی فیصلہ کیا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دروازے کی اوٹ سے نکل آیا۔ شہبازی ابھی تک کمرے کے اندر ہی تھا۔ میں نے کار پورچ کی جانب نگاہ دوڑائی۔ وہاں مجھے کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ سیاہ شیشوں والی جیپ اور گرے سوزوکی ہائی روف پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ جتنی دیر میں' میں دروازے کے عقب سے نکل کر راہداری سے باہر آیا تھا۔ اس دوران میں شہزاد بنگلے کے اندرونی حصے میں غائب ہوچکا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور کار پورچ کی جانب دوڑ لگا دی۔

راہداری اور کار پورچ کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا میں نے متعدد بار جس راہداری کا ذکر کیا ہے' وہ بنگلے کے سامنے والے حصے میں تھی جس کے آخری سرے پر وہ کمرا بنا ہوا تھا تھوڑی دیر پہلے تک جو میرے لیے قفس کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں ابھی تک بنگلے کا

آپ دُنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں
ماہنامہ آنچل کراچی
ماہنامہ نئے اُفق کراچی
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے
میڈل ایسٹ' ایشیا' افریقہ' یورپ کے لیے 6000 روپے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ' منی آرڈر' منی گرام' ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کرکے کرسکتے ہیں۔
رابطہ: طاہر احمد قریشی...... 0300-8264242
نئے اُفق گروپ آف پبلی کیشنز کمرہ نمبر: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔
فون نمبر: 2/35620771-922+ فیکس: 5620773-922+ Email:circulationngp@gmail.com

[illegible] پایا تھا لہٰذا اس کی مکانیت سے پوری طرح آگاہ نہیں تھا۔ ویسے یہ بات میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ بنگلہ نہیں تھا جہاں میں شیروانی کی ہدایت کے مطابق پانچ لاکھ روپے لے کر فرحانہ کو چھڑانے پہنچا تھا۔ اس کی نسبت یہ بنگلہ خاصا کشادہ اور وسیع و عریض نظر آتا تھا۔

اللہ کا نام لینا خاصا مددگار ثابت ہوا تھا۔ اللہ کے اسماء الحسنیٰ میں اسم ''اللہ'' کی ویسے بھی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہ اسم خاص اسم ذات اور اسم اعظم کہلاتا ہے اگر کوئی اس اسم مبارک کے استعمال سے کما حقہ واقف ہو تو نہ صرف اس کی اپنی بگڑی بن جاتی ہے بلکہ اس کے نیک مشوروں سے اور بہت سوں کے معاملات بھی معمول پر آجاتے ہیں۔ میں اسم اعظم کا کوئی عامل نہیں تھا۔ بس ایسے ہی اس قادر مطلق کو اس کے ذاتی نام سے پکارا تھا اور اس نے میری سن لی تھی۔

میں دوڑتے ہوئے جیسے ہی سیاہ جیپ تک پہنچا بنگلے کے اندرونی حصے سے چند افراد کی باتوں اور قدموں کی آوازیں میری سماعت تک پہنچیں۔ وہ جو کوئی بھی تھے' عمران کے بلاوے پر آرہے تھے اور شہزاد کو بھی ان کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ ان کا باس ڈھیٹ زمانہ خبیث الاخبث ندیم شیروانی بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ میں گرے ہائی روف اور سیاہ جیپ کی اوٹ لے کر ایسے رخ پر بیٹھ گیا کہ اندر سے برآمد ہونے والوں میں سے کوئی مجھے دیکھ نہ سکے۔

وہ باتیں کرتے ہوئے تیز قدموں سے باہر نکل آئے۔ نمایاں آواز شہزاد کی تھی۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا مراد۔'' اس کے لہجے میں بڑی جھنجلاہٹ پائی جاتی تھی۔ ''اس بنگلے پر تم چاروں موجود تھے پھر بھی وہ زخمی اور قیدی شخص تم لوگوں کے منہ پر جوتا مار کر یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ کتنی شرم کی بات ہے نہ صرف فرار ہوگیا بلکہ تمہارے ایک ساتھی کو موت کے گھاٹ بھی اتار گیا۔''

''میں عمران کے ساتھ بنگلے کے اندر تھا۔'' مراد نامی اس شخص نے وضاحت کی۔ ''ہم دونوں باس کے جشن کے انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے باس نے آج رات یہاں آنا تھا مگر اچانک ان کا پروگرام تبدیل ہوگیا تو ہمیں ہنگامی بنیادوں پر سب ارینج کرنا پڑا ہے۔''

''سکندر مسلسل اس کی نگرانی کررہا تھا اور شہباز ی گیٹ پر پہرا دے رہا تھا۔'' عمران نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ ان دونوں کی موجودی اور مستعدی میں اتنا بڑا واقعہ ہو کیسے گیا اور ہمیں اس کی خبر تک نہیں ہوئی۔''

''سانپ نکل چکا ہے اب اس کا راستا پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' شہزاد نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''اپنی ذات پر حد سے زیادہ اعتماد بھی انسان کو لے ڈوبتا ہے۔ سکندر کو خود کو گولی کہلوانے کا بڑا شوق تھا نا۔ اسی شوق کے غرور میں اس کا حشر نشر ہوا ہے۔ قید میں موجود زخمی اور بے بس شخص اسے ذلت ناک موت کے حوالے کر کے رفو چکر ہوگیا ہے۔''

یہ تمام تر گفتگو ان کے بیچ چند سیکنڈ میں ہوئی تھی اور وہ بھی تیز قدموں سے چلتے ہوئے' کار پورچ کے قریب سے گزر کر بنگلے کے سامنے والے حصے یعنی جائے وقوعہ کی جانب بڑھ گئے تھے۔ میں نے سیاہ جیپ کے نیچے سے ان کے قدموں اور ٹانگوں کے محدود حصوں کا نظارہ کیا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ تینوں وہاں جا کر جو بھی کارروائی کرتے اس کی رپورٹ انہوں نے اپنے باس کو کرنا تھی اور وہ رپورٹ

گم دبش ان الفاظ میں ہوتی۔ ''خطرناک قیدی اپنے نگران سکندر عرف گولی کو موت کی نیند سلانے کے بعد بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔''

اس رپورٹ کا ندیم شیروانی پر کیا اثر ہوتا' مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اس کوتاہی پر اپنے نمک خواروں کے ساتھ کیا سلوک کرتا مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی میں یہاں دبکا ''تفتیشی ٹیم'' کی واپسی کا انتظار کرسکتا تھا۔ میں اپنی عارضی پناہ گاہ سے نکلا اور دبے مگر تیز قدموں کے ساتھ بنگلے کے پہلو میں چلا گیا اور پھر آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں' وہ بنگلا خاصا وسیع و عریض تھا جس کے پہلو میں باؤنڈری وال کے ساتھ دونوں جانب پانچ چھ فٹ جگہ چھوڑ کر تعمیرات کی گئی تھیں۔ تاکہ بنگلے کے اندرونی حصے میں ہوا کا مناسب گزر ہوتا رہے۔ ہر معقول شخص اپنی رہائش گاہ کو صحت افزا رکھنے کے لیے ہوا کی آمد و شد کو نظر انداز نہیں کرتا۔

میں توقع کررہا تھا کہ گولی کے حوالے سے سنسنی خیز اطلاع پا کر شیروانی' بہ نفسِ غلیظ خود باہر نکل آئے گا کیونکہ گولی کی عبرت ناک موت کے ساتھ ہی میری گم شدگی کی خبر بھی پہنچی تھی۔ میں اس کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ وہ مجھے اذیت ناک سبق سکھانے کے لیے ہی اس بنگلے پر پہنچا تھا۔ میرے فرار کے معاملے کو وہ کس طرح نظر انداز کرسکتا تھا۔ لیکن میرے اندازے کے برعکس وہ بنگلے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس وقت بنگلے کے اندرونی حصے میں شیروانی' اس کے غیر ملکی دوست اور مرزا یاسین بیگ کے سوا کسی اور کو نہیں ہونا چاہیے تھا اگر اور کوئی اندر موجود تھا تو میں اس کی موجودی سے قطعی بے خبر تھا۔

وہ دن کا وقت تھا چاروں جانب چمکیلی مگر دھیمی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ماحول میں ایک خوشگوار سی خنکی بھی تھی۔ ان لمحات میں' میں بالکل آزاد تھا۔ اگر میں چاہتا تو بنگلے کی باؤنڈری وال پھلانگ کر کہیں بھی جاسکتا تھا۔ مگر میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میرا دھیان دو افراد پر لگا ہوا تھا۔ شیروانی اور بیگ پر۔ یہ دونوں میرے دشمن تھے اور انہیں ایک ساتھ دیکھ کر میری نظر میں یہ اور بھی دشمن ہوگئے تھے۔ ان سے دو' دو ہاتھ کیے بغیر یہاں سے جانا مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا۔ انسان مخصوص حالات کے تحت سوچنے پر مجبور ہوتا ہے جب میں گولی کی نگرانی میں' ایک کمرے میں قید تھا تو میری اولین ترجیح یہی تھی کہ میں کسی طرح اس قید سے فرار ہونے کی کوشش کروں۔ اب میں بالکل آزاد تھا۔ کوئی میری راہ کھوٹی کرنے والا نہیں تھا۔ اگر کوئی ایسی کوشش بھی کرتا تو میں اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتا۔ مگر اب میری خواہش وہاں سے جانے کی نہیں تھی کیونکہ مجھے ایک ٹارگٹ مل گیا تھا۔ میں اپنے خطرناک اور کمینے دشمنوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کیے بغیر اس بنگلے سے واپس کیسے چلا جاتا۔

میری معلومات کے مطابق' شیروانی اس بنگلے پر مجھے روحانی عذاب میں مبتلا کرنے آیا تھا۔ مجھے زیر کرنے کی خوشی میں اسے یہاں کوئی جشن منانا تھا۔ جس میں وہ میری نگاہ کے سامنے فرحانہ کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتا اور اس کے دعوے کے مطابق میں بے بسی سے دل مسوس کر رہ جاتا۔ وہ میری بے بسی اور بے کسی کا مذاق اڑاتا۔ مجھے ذلیل کرتا اور وہ کمینگی کی جس انتہا کو بھی چھو سکتا تھا اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی۔ میں اس کی کسٹڈی میں نہیں رہا تھا جو وہ مجھے اپنی ذلیل خواہش کا نشانہ بناتا۔

WWW.Paksociety.com

شیروانی اپنے ہنگامی پروگرام کے مطابق بنگلے پر پہنچ چکا تھا مگر اس کے ساتھ فرحانہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ فرحانہ کو بعد میں یہاں پہنچایا جاتا کیونکہ اس کی غیر موجودی میں شیروانی کا گھٹیا منصوبہ اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں نہیں پہنچ سکتا تھا اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ......!

ایک فوری خیال نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ ایک اچھوتی سوچ اچانک ہی میرے ذہن میں ابھری تھی کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ فرحانہ پہلے سے یہاں موجود ہو۔ شیروانی کے حکم پر اسے اسی بنگلے کے کسی حصے میں قید رکھا گیا ہو۔ فرحانہ کے وہاں ہونے کے احساس نے میرے وجود میں بجلی سی بھردی۔ اگرچہ اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا مگر تھا ضرور۔

میں تیزی سے چلتے ہوئے بنگلے کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ یہاں پر درمیانے سائز کا ایک لان بنا ہوا تھا۔ جس میں سرسبز گھاس کا فرش بچھا ہوا تھا۔ مذکورہ لان کے کناروں پر پھول دار پودے بھی دکھائی دیتے تھے۔ مجھے کسی طرح احتیاط کے ساتھ اس بنگلے کے اندرونی حصے تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ اس طرح کہ کوئی مجھے دیکھ نہ پائے اور مجھے اپنے مقصد میں کامیابی بھی حاصل ہوجائے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس وقت اندر تین افراد کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں شہزاد، عمران اور مراد بھی یہاں پہنچنے والے تھے اپنی تازہ ترین اور سنسنی خیز رپورٹ کے ساتھ۔

بنگلے کے عقبی حصے کا جائزہ لینے کے بعد میں نے ایک طرف کا رخ کیا۔ میری نگاہ ایک بند دروازے پر جمی تھی۔ مذکورہ دروازہ عقب سے بنگلے میں داخل ہونے کا راستہ فراہم کرتا تھا۔ میں محتاط قدم اٹھاتے ہوئے بہ سرعت اس دروازے تک پہنچ گیا۔

میں نے بند دروازے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر اس کی کیفیت کو جانچنے کی کوشش کی تو وہ بڑی شرافت سے کھلتا چلا گیا۔ وہ دروازہ لاک تھا نہ اس کے اندر سے کنڈی لگانے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ میں سانس روک کر اندر داخل ہوگیا۔

میں نے خود کو ایک وسیع راہ داری میں پایا جس کی دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ جو یقیناً بیڈروم کی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں۔ وہ بنگلا تعمیر کے آخری مراحل میں تھا اور ابھی تک وہاں باقاعدہ رہائش اختیار نہیں کی گئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ بنگلہ شیروانی کی ملکیت تھا کہ نہیں البتہ اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ اس وقت وہ بنگلہ اس شیطان کی شیطانی سرگرمیوں کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ گویا ندیم شیروانی کو اس بنگلے کے استعمال پر کلی اختیار حاصل تھا۔

اچانک میرے قدم رک گئے۔ چند گز کے فاصلے پر ایک کمرے سے مجھے شیروانی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ مذکورہ کمرے کا دروازہ کھلا تھا لہٰذا شیروانی کی آواز بہ آسانی میری سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ وہ اپنے غیر ملکی دوست سے مخاطب تھا۔ وہ اس سے انگلش میں بات کر رہا تھا جو کچھ اس انداز کی تھی۔

''مسٹر جوزف! آئی ایم ویری سوری میں تمہیں جس تفریح کے لیے یہاں لایا تھا وہ اب ممکن نہیں رہی۔''

''میں کوئی گڑبڑ محسوس کر رہا ہوں مسٹر شیروانی۔'' جوزف نے جواباً تشویش ناک لہجے میں استفسار کیا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں، ہاں خیریت ہے۔'' شیروانی نے بات بنانے کے انداز میں کہا۔ ''بس، وہ پروگرام ممکن نہیں رہا جس کے لیے ہم سب یہاں آئے تھے۔''

''نیور مائنڈ!'' جوزف نے بے پروائی سے کہا۔ ''ہماری دوستی سلامت رہے پروگرام تو ہوتے ہی رہیں گے۔''

ان دونوں کے بیچ یہ گفتگو مکمل انگلش میں ہو رہی تھی۔ شیروانی کی انگلش صاف تھی تاہم لہجے سے وہ مار کھا رہا تھا۔ جوزف نامی اس دراز قامت شخص کے لب و لہجے سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ اس کا تعلق امریکہ سے تھا۔ امریکیوں کا اپنا ایک مخصوص تلفظ، لہجہ اور اسٹائل ہے جو فوراً پکڑ میں آجاتا ہے۔ شیروانی اور جوزف کی باہمی گفتگو سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ شیروانی نے ابھی تک جوزف کو اس بنگلے پر ہونے والے اپ سیٹ سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ جوزف نہیں جانتا تھا کہ ان لوگوں کی آمد سے پہلے یہاں ایک قتل ہوچکا ہے اور جس قیدی کو ذلیل وخوار کرنے کے لیے وہ ایک جشن منانے کا ارادہ رکھتے تھے وہ بھی سب کو چکما دے کر بنگلے سے فرار ہوچکا تھا۔

''باس۔'' مرزا یاسین بیگ کی آواز ابھری۔ ''صورت حال خاصی گمبھیر ہے آپ جنید خان کو فون کردیں تو اچھا ہے کہیں وہ یہاں پہنچنے کے لیے نکل نہ پڑے۔''

یاسین بیگ نے شیروانی کو ''باس'' کہہ کر مخاطب کیا تھا جس سے واضح ہوگیا کہ وہ بھی شیروانی کے اشاروں پر ناچنے والا ایک پتلا ہی تھا تاہم وہ شیروانی کے خاصا قریب نظر آتا تھا۔ شیروانی کا لہجہ اس امر کی تصدیق کرتا تھا کہ اس کی نظر میں مرزا یاسین بیگ کی ایک خاص حیثیت ہے۔

''یہ تم نے خوب یاد دلایا۔'' شیروانی نے چونکے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اب جنید خان کا یہاں کوئی کام نہیں لہٰذا اسے اپنے اسٹیشن پر ہی موجود رہنا چاہیے۔''

میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ جنید خان ایک نیا نام سامنے آیا تھا۔ شیروانی کی باتوں سے تو یہی محسوس ہوتا تھا کہ جنید خان کی اپنی ایک اہمیت ہے اور وہ ایک خاص مقصد سے یہاں پہنچنے والا ہے اور یقیناً اس مقصد کا تعلق اس جشن سے تھا جو میری عزت افزائی کے لیے یہاں منایا جانے والا تھا۔

''ہیلو جنید۔'' کمرے سے شیروانی کی مخصوص آواز ابھری۔ یقیناً اس نے جنید خان نامی اس بندے کو فون کیا تھا۔

دوسری جانب کی آواز میں نہیں سن سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم ادھر سے جنید خان نے کیا کہا ہوگا۔ مجھ تک صرف شیروانی کی آواز پہنچ رہی تھی۔ وہ تحکمانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''تم اپنے اسٹیشن پر ہی رہو۔ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے یہ پروگرام فی الحال ملتوی کردیا ہے۔ تفصیلات سے تمہیں بعد میں آگاہ کروں گا۔''

ادھر سے جنید خان نے شیروانی کی ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا ہوگا۔ شیروانی کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''ٹھیک ہے تم اپنی ساری توجہ لڑکی پر مرکوز رکھو۔ میں نے تم پر بھروسا کرکے اسے تمہارے پاس چھوڑا ہے۔ اس کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں ہونا چاہیے۔ تم سے بعد میں بات کروں گا۔''

ادھر شیروانی کی بات ختم ہوئی، ادھر بیگ نے لقمہ دیا۔ ''باس! آپ کا قیدی کہیں فرار نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس شیطان کی محبوبہ آپ کے قبضے میں ہے اسے

www.Paksociety.com

ناک سے لکیریں نکالتے ہوئے سر کے بل آپ کے قدموں میں آنا ہوگا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" شیروانی کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "یہ لڑکی ایک حسین چارا ہے جس کی کشش سے میں جب چاہوں اسد کو شکار کر سکتا ہوں۔ لہٰذا فرحانہ کو ہر حال میں میرے قابو میں رہنا چاہیے۔"

"باس! ابھی آپ نے جس خبیث کا نام لیا ہے یہ ہم سب کا مشترکہ دشمن ہے۔ اس نے سازش کر کے جس طرح ہمیں نوکری سے نکلوایا ہے وہ ساری تفصیل میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"نوکری سے اسی کو نکالا جاتا ہے جسے نوکری کرنے کا شوق ہوتا ہے۔" شیروانی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "میں نے تو پہلے بھی کئی بار تمہیں آفر کی تھی کہ میرے سیٹ اپ میں آجاؤ۔ میں تم جیسے ذہین اور چالاک لوگوں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ میرے ساتھ جتنے بھی کام کے افراد ہیں میں نے انہیں کبھی اپنا نوکر یا ملازم نہیں سمجھا خیر دیر آید درست آید۔"

اس کے بعد ندیم شیروانی اور مرزا یاسین بیگ کے درمیان کیا گفتگو ہوئی وہ میں سننے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا۔ کیونکہ مجھے فوراً اپنی پوزیشن بدلنا پڑی تھی۔ بنگلے کے داخلی حصے میں، میں نے تفتیشی ٹیم کے افراد کو نمودار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ ان کا رخ یقیناً اسی کمرے کی جانب تھا۔ جہاں ان کا باس شیروانی براجمان تھا۔ وہ اپنی تحقیقاتی رپورٹ پیش کرنے شیروانی کے پاس آرہے تھے۔

اگر میں اپنی جگہ پر کھڑا رہتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ میں ان کی نگاہوں میں نہ آؤں، میرے پاس کوئی سلیمانی ٹوپی نہیں تھی لہٰذا پہلی فرصت میں خود کو ان کی نظروں سے پوشیدہ کرنا ضروری تھا۔

اس راہ داری کی دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ میں ایک ایک بند دروازے کو "چیک" کرتے ہوئے الٹے قدموں بڑی سرعت سے پیچھے ہٹنے لگا۔ میری نگاہ مسلسل تفتیشی ٹیم پر جمی تھی۔ میں کسی بھی قیمت پر یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ وہ لوگ یہاں میری موجودی سے آگاہ ہو جائیں۔ میری ذات کے حوالے سے ایک تاثر قائم ہو چکا تھا کہ میں گولی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ یہ تاثر قائم رہنا چاہیے تھا۔

یہ پتا چل جانے کے بعد کہ میری فرحانہ اس بنگلے میں نہیں تھی۔ بلکہ جنید خان نامی کسی شخص کی تحویل میں تھی۔ اس بنگلے سے میری دلچسپی قدرے کم ہو گئی تھی تاہم میں شیروانی کو سوکھا بخشنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اگر میں کسی طرح اس مردود کو اپنے قابو میں کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر اس کی زبان سے میں فرحانہ اور خوش دلی کا پتا بھی بہ آسانی اگلوا سکتا تھا۔ لیکن فی الحال تو خود کو روپوش کرنے کا معاملہ درپیش تھا۔ تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔

میں تیز قدموں سے کھسکتے ہوئے اسی مقام پر جا پہنچا جہاں سے اس راہ داری میں داخل ہوا تھا۔ اسی لمحے میں نے شہزاد اور مراد کو راہ داری کے دوسرے سرے پر دیکھا۔ عمران ان کے ساتھ نہیں تھا۔ میں اچھل کر بیرونی دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہ دیوار اسی دروزے کی تھی جس سے گزر کر میں راہداری میں پہنچا تھا۔ اب میں راہ داری سے باہر بنگلے کے عقبی حصے میں لان کے قریب تھا۔ میں نے جس کمرے میں شیروانی اینڈ کمپنی کو آپس میں مشاورت کرتے سنا تھا۔ وہ کمرا راہداری کے دوسرے سرے کے قریب تھا۔ ان دونوں کو شیروانی کے پاس پہنچنے میں چند سیکنڈ لگتے۔

میں نے لگ بھگ دس سیکنڈ تک انتظار کیا۔ پھر دیوار کی اوٹ میں رہتے ہوئے نگاہ دوڑائی، راہداری اس سرے سے اس سرے تک خالی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ شہزاد اور مراد کمرے میں پہنچ کر اس وقت اپنے باس کو رپورٹ پیش کر رہے تھے۔

اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا اور میں بنگلے کے پہلو میں رینگ گیا۔ یہ وہ پہلو نہیں تھا جدھر سے میں سفر کر کے بنگلے کے پچھواڑے پہنچا تھا۔ یہ دوسرا پہلو تھا اور اس طرف پڑی ایک گھوڑی نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی۔ میں اس گھوڑی کا ذکر کر رہا ہوں جو پینٹرز حضرات دیواروں کے بالائی حصوں اور چھتوں وغیرہ پر رنگ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

مذکورہ گھوڑی ایک بیرونی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ بنگلے میں رنگ و روغن کا کام بھی ہو رہا تھا۔ میں بہ آسانی اس گھوڑی کی مدد سے چھت پر پہنچ سکتا تھا۔ فی الحال اس بنگلے میں میرے لیے سب سے محفوظ جگہ چھت ہی تھی۔ جس طرف کسی کا خیال نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے خطرناک گن کو اسٹریپ کی مدد سے گلے میں ڈال کر پہلو میں کر لیا اور نہایت ہی محتاط انداز میں ایک ایک قدم اوپر چڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں بنگلے کی چھت پر تھا۔ یہاں سے چاروں جانب کا نظارہ کیا جا سکتا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے جس بنگلے میں قید کیا گیا تھا وہ گلستان جوہر کے ایک زیر تعمیر دور افتادہ حصے میں واقع تھا۔ گویا ان لوگوں نے بے ہوشی کی حالت میں مجھے اسی علاقے کے ایک بنگلے سے دوسرے بنگلے میں شفٹ کر دیا تھا۔

میں نے ایک آسودہ اور گہری سانس خارج کی پھر بنگلے کے گیٹ کی جانب نگاہ دوڑائی۔ گیٹ پر مجھے کوئی بندہ بشر دکھائی نہ دیا۔ عمران اور شہبازی کہیں اور مصروف تھے۔ اگلے ہی لمحے ان کی مصروفیت میری نظر میں آگئی۔ میں نے دیکھا، وہ گولی کی لاش کو کھینچ کر سامنے والی راہداری سے باہر لا رہے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ لوگ گولی کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں چھت پر بیٹھے بیٹھے دلچسپی سے ان کی شیطانی کارروائی کو دیکھنے لگا۔

ان لمحات میں میرا ذہن کئی زاویوں پر بہ یک وقت سوچ رہا تھا۔ فرحانہ تو ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن سے اِدھر اُدھر نہیں ہوئی تھی۔ میں خوش دلی کے حوالے سے بھی گہری تشویش میں تھا۔ امی، شازیہ، عبدالخالق انکل، امینہ آنٹی اور دیگر خیر خواہوں میں بھی دھیان لگا ہوا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نیچے شیروانی کیا کھچڑی پکا رہا تھا؟

میری شدید خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے گھر والوں کو اپنی خیریت سے آگاہ کر دوں مگر رہائی کے بعد سے ابھی تک مجھے کسی فون تک رسائی حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور پھر اپنی خیریت کی اطلاع بہم پہنچانے کا مرحلہ بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کئی ایک پیچیدگیاں بھی نتھی تھیں۔ میں اپنی خیریت سے امی اور شازیہ کو تو مطمئن کر سکتا تھا مگر انکل اور آنٹی کو تو فرحانہ کی خیریت نیک مطلوب تھی۔ میں اس حوالے سے ان کو کیا جواب دیتا۔ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ابھی تک فرحانہ کا سراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

شہبازی اور عمران نے بڑی مہارت کے ساتھ گولی کی خون آلودہ لاش کو ایک بڑے ڈرم میں ڈال دیا۔ یہ خالی ڈرم راہداری سے باہر ایک کونے میں پڑا تھا۔ انہوں نے پہلے مذکورہ ڈرم کو زمین پر لٹایا تھا پھر

گولی کی لاش کو بہ مشکل تمام اس کے اندر ٹھونسنے کے بعد ڈرم کو کھڑا کردیا تھا۔ سردست میرے ہاتھوں انا للہ ہونے والے سکندر عرف گولی کی لاش ٹھکانے لگ گئی تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد شہبازی بنگلے کے گیٹ پر پہنچ گیا اور عمران ایک مرتبہ پھر اسی راہ داری میں غائب ہوگیا۔ جو اس بنگلے میں جائے وقوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

میرے ذہن میں یہ خیال چمکا کہ مجھے نیچے کی خبر لینا چاہیے۔ بنگلے کے اندرونی حصے میں میرے دو دشمن شیروانی اور بیگ موجود تھے۔ وہ شیطانی دماغ رکھنے والے میرے خلاف کوئی خطرناک پلاننگ کرسکتے تھے۔ میں کسی بھی موقع پر ان سے خیر اور بھلائی کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے چھت سے نیچے اترنے کا فیصلہ کیا تاکہ کسی محفوظ مقام پر رک کر اندرونی معاملات پر نگاہ رکھ سکوں۔

میں جس گھوڑی کی مدد سے چھت پر پہنچا تھا اسی گھوڑی نے مجھے واپس زمین پر پہنچا دیا۔ میں نے جیسے ہی زمین پر قدم رکھا ایک خوف ناک غراہٹ نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔

یہ غراہٹ کسی وحشی درندے کے حلق سے خارج نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ طاقتور جیپ کے انجن کی آواز تھی۔ انجن ایک دہشت ناک آواز کے ساتھ بیدار ہوا پھر جیپ کے بھاری ٹائروں کی مخصوص چرچراہٹ فضا میں گونجی۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ سیاہ شیشوں والی وہ طاقتور سیاہ جیپ بنگلے سے روانہ ہورہی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا شیروانی اور بیگ واپس جارہے تھے۔

میرے اعصاب تن گئے۔ رگ و پے میں بجلیاں سی بھر گئیں مگر میں کار پورچ سے اتنے فاصلے پر تھا کہ چشم زدن میں وہاں پہنچ نہیں سکتا تھا۔ اگر میں یہاں سے فائرنگ بھی کرتا تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرے اور کار پورچ کے بیچ بنگلے کی عمارت حائل تھی۔ جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا تو میں نے بے ساختہ بنگلے کے پہلو میں دوڑ لگادی۔ چند سیکنڈ بعد میں بنگلے کے پہلو سے نکل کر ایک ایسے مقام تک رسائی حاصل کرچکا تھا جہاں سے بنگلے کا گیٹ بڑے واضح انداز میں دکھائی دیتا تھا اور میں نے مذکورہ سیاہ جیپ کو گیٹ میں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ ریورس گیئر میں گولی کی رفتار سے بنگلے سے نکل گئی تھی۔ مجھے اتنا موقع نہیں مل سکا کہ اندھا دھند اس جیپ پر گولیاں برسا سکتا اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ بنگلے کے گیٹ اور اس مقام جہاں میں کھڑا تھا کے بیچ اتنا فاصلہ تھا کہ فائرنگ اپنے ٹارگٹ کو نہیں چھو سکتی تھی۔ پھر جیپ نے اتنی مہلت ہی کہاں دی تھی۔ وہ تو بس زن سے میری نگاہ سے گزر کر بنگلے کے باہر پہنچ گئی تھی۔ سیاہ شیشوں کے اس پار جیپ کے اندر جھانکنا ممکن نہیں تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ جو لوگ جیپ میں سوار ہو کر اس بنگلے تک پہنچے تھے وہی رخصت بھی ہوئے ہوں گے۔ شہبازی نے جیپ کے نکلتے ہی گیٹ کو بند کردیا تھا۔ اور اسی لمحے ایک اور سنسنی خیز واقعہ پیش آگیا۔

اپنے دشمنوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے خیال نے ایک لمحے کے لیے مجھے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ میں کچھ دیر کے لیے اپنی جگہ ساکت اور جامد ہو کر رہ گیا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب شہبازی گیٹ بند کرکے پلٹا تھا اور اس کی مجھ پر نظر پڑ گئی تھی۔

ہماری نگاہیں ملیں تو اس کی آنکھوں میں الجھن آمیز حیرت جاگ اٹھی تھی۔ گویا اس بنگلے میں میری موجودی کا راز کھل گیا تھا۔ یہ اچھا نہیں ہوا تھا مگر میں نے کوئی پروا نہیں کی کیونکہ اس سے پہلے کون سا اچھا

تھا۔ میں نے دل ہی دل میں شہبازی پر لعنت ...ی اور بنگلے کے عقبی حصے کی جانب دوڑ لگادی۔ ...اپنے عقب میں شہبازی کی آواز سنائی دی۔ وہ ...ساتھی کو پکار رہا تھا۔

"عمران، دیکھو ادھر بنگلے کے پچھلے حصے میں کوئی ...؟" خیریت گزری کہ اس کم بخت نے کوئی ہے کہ ...الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس کا یقینی مطلب یہی تھا کہ وہ اچٹتی سی نظر میں مجھے پہچان نہیں پایا تھا ورنہ وہ ...میرا نام لیتا یا میرے لیے قیدی کے الفاظ استعمال کرتا۔ وہ مجھے پہچان پایا تھا یا نہیں تاہم یہ امر تشویش ...کا تھا کہ میری موجودی سے ان لوگوں میں ...اضطراب پیدا ہوگیا تھا۔

"کون...... کدھر......؟" عمران کا استفسار میری ...سماعت تک پہنچا۔

"ادھر، بنگلے کے پہلو میں۔" شہبازی کی خوف ...میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ "میں نے ابھی وہاں کسی ...کو دیکھا ہے۔"

میری معلومات کے مطابق اس وقت بنگلے میں صرف چار افراد موجود تھے۔ شہبازی، عمران اور مراد تو زندہ تھے جبکہ چوتھے بندے کی لاش ایک ڈرم میں سکونت اختیار کیے ہوئے تھی۔ شہباز کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے گیٹ پر دیکھا تھا جبکہ عمران کی آواز ...کار پورچ کی سمت سے ابھری تھی۔ اس کا مطلب یہ ...تھا کہ مراد بنگلے کے اندرونی حصے میں تھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" عمران کی ...جھلائی ہوئی آواز آئی۔ "مجھے تو ادھر کوئی نظر نہیں آرہا۔ تم نے کس کو کہاں دیکھ لیا ہے۔"

"میری بات کا یقین کرو عمران! کوئی تھا۔" ...شہبازی کی آواز میں اگرچہ خوف شامل تھا تاہم وہ اپنی ...بات پر ڈٹا ہوا تھا۔ "تم میرے ساتھ آؤ، ہم بنگلے کے اس حصے کا جائزہ لیتے ہیں۔"

"آؤ......!" عمران نے مختصراً کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں یقیناً اب بنگلے کے پہلو میں پہنچنے والے تھے اور ان کی آمد سے قبل مجھے یہاں سے نکلنا تھا۔ اس دوران میں، میں دوبارہ بنگلے کے عقبی حصے میں پہنچ چکا تھا۔ عقبی داخلی دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں ایک مرتبہ پھر اندرونی راہداری میں داخل ہوگیا۔

راہداری خالی تھی، مراد یقیناً کسی کمرے کے اندر تھا۔ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا جلد ہی ایک نیم وا دروازہ میری نگاہ میں آگیا۔ پہلے جب اس راہداری سے میرا گزر ہوا تھا تو میں نے تمام دروازوں کو بند پایا تھا۔ اس نیم وا دروازے کا مطلب یہی تھا کہ کمرے کے اندر کوئی تھا۔ اغلب امکان مراد کی موجودی کا تھا۔

میں نیم وا دروازے کے نزدیک پہنچا تو اندر سے پانی گرنے کی آواز سنائی دی جیسے کوئی نل کھلا ہوا ہو۔ اگر مراد اسی کمرے میں تھا تو پھر میرے محتاط اندازے کے مطابق، اسے اس کمرے کے واش روم میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے دروازے کو نیم وا ہی رہنے دیا اور کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔

وہ ایک نارمل سائز کا بیڈ روم تھا جس میں ایک کے بجائے دو چھوٹے بیڈ لگے ہوئے تھے اور کمرے کی کنڈیشن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں یہی ملازم رہائش اختیار کیے ہوئے تھے۔ میرے اندازے کے عین مطابق واش روم کے اندر کوئی موجود تھا اور وہ مراد کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

اس بیڈ روم میں چھپنے کی باقاعدہ کوئی جگہ نہیں تھی لیکن کچھ دیر کے لیے میرا وہاں قیام کرنا بھی ضروری تھا۔ مراد کو لازماً واش روم سے باہر آنا تھا اور یہ بھی ظاہر

www.paksociety.com

تھا کہ آنے والے لمحات میں، میری تلاش میں ناکامیاب ہونے کے بعد شہبازی اور عمران کو بھی مراد ہی کے پاس آنا تھا لہٰذا چند لمحات کے بعد یہ بیڈروم ایک کانفرنس روم میں تبدیل ہونے والا تھا جہاں کسی پراسرار بندے کے حوالے سے سنسنی خیز اور گرما گرم بحث ہونے والی تھی چنانچہ میری وہاں موجودی انتہائی اہم اور ضروری تھی۔ ایک فوری خیال کے تحت میں ایک بیڈ کے نیچے گھس گیا۔

اس بیڈ کے نیچے اتنی گنجائش موجود تھی کہ میں پھنس کر لیٹ گیا اور آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگا۔ گن کو میں نے اس پوزیشن میں تھام رکھا تھا کہ بوقت ضرورت اس کے استعمال میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مجھے بیڈ کے نیچے پناہ لیے ہوئے زیادہ سے زیادہ ایک منٹ گزرا ہوگا کہ باہر راہداری میں قدموں کی مخصوص چاپ ابھری۔ یقیناً عمران اور شہبازی اس طرف آرہے تھے۔ نیم وا دروازے کے توسط سے کمرے کے اندر پہنچنے والی ان کے قدموں کی آواز میں ایک خاص قسم کی تیزی اور اضطراب پایا جاتا تھا۔ وہ اپنی تلاش میں ناکامیابی کا منہ دیکھنے کے بعد اب مراد کے پاس آرہے تھے تاکہ اسے صورت حال سے آگاہ کرسکیں۔

اگلے ہی لمحے وہ بیڈروم کے اندر تھے۔ میں نے سانس روک کر ٹریگر پر انگلی رکھ لی۔ مورچے میں رہتے ہوئے بآسانی فائرنگ کرکے وہاں موجود افراد کو چلنے پھرنے سے معذور بنا سکتا تھا۔

"مراد......!" عمران کی جھنجلاہٹ بھری آواز ابھری۔ "تم اندر کیا کررہے ہو؟"

عمران کے استفسار کے ساتھ ہی واش روم کے اندر سے پانی گرنے کی آواز بند ہوگئی۔ یقیناً مراد نے نل بند کردیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مراد کی برہمی آواز سنائی دی۔

"واش روم میں لوگ کیا کرتے ہیں تمہیں اتنا نہیں پتا؟"

"یار جلدی سے باہر نکلو۔" عمران نے پٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟" مراد نے پوچھا۔ "تم ا گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"یار کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔" عمران نے بتایا۔

"کیسی گڑبڑ؟" مراد کے لہجے میں الجھن شامل ہوگئی۔

"اندر بیٹھے بیٹھے ہی انٹرویو کرڈالو گے۔" عمرا نے بیزاری سے کہا۔ "باہر نکلو تو کچھ بتاؤں۔"

"ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔" مراد نے کہا۔

ان کے بیچ ہونے والی یہ گفتگو میں بیڈ کے نیچے دبکا سن رہا تھا اور اس بات چیت کے پس منظر سے بھی اچھی طرح آگاہ تھا۔ مراد نے اپنے ساتھیوں کو زیادہ انتظار نہیں کرایا اور ایک منٹ سے پہلے واش روم سے باہر نکل آیا۔

مجھے ان تینوں کی ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔ عمران اور شہبازی نے بیڈروم میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"ہاں اب بتاؤ ایسی کون سی نئی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ اس بنگلے پر۔" مراد نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ "تم دونوں کے چہروں پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"شہبازی نے بنگلے میں کسی کو دیکھا ہے۔" عمران نے بتایا۔

"کس کو؟" مراد کے لہجے میں حیرت نمودار ہوئی۔

"اسی سے پوچھ لو۔" عمران نے کہا۔ "مجھے تو لگتا

دماغی توازن ٹھکانے پر نہیں رہا۔"

"کیا ہوا ہے شہبازی۔" مراد نے شہبازی کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ "تم نے کس کو دیکھ لیا ہے؟"

"جب باس کی جیپ روانہ ہوئی اور میں گیٹ بند کرکے پلٹا تو میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔" شہبازی نے سہمے ہوئے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "وہ بنگلے کی سائیڈ والی دیوار کے پاس اچانک حرکت میں آیا تھا۔"

"مگر کون۔" مراد نے پوچھا۔ "کیا تم اسے جانتے ہو۔"

"یار مراد یہ اپنا شہبازی لگتا ہے پاگل ہوگیا ہے۔" عمران نے اکتاہٹ آمیز انداز میں کہا۔ "اس پراسرار آدمی کے بارے میں اس نے سب سے پہلے مجھے بتایا تھا اور میں نے اس کے ساتھ مل کر پورے بنگلے کو اچھی طرح چیک کرلیا ہے۔ یہاں ہم تینوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔"

"میں جھوٹ کیوں بولوں گا یار۔" شہبازی نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے اسے دیکھا ہے جبھی تو بتا رہا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے یہ باس کی ڈانٹ کا نتیجہ ہے۔" عمران نے کہا۔ "اس کے پہرا دینے کے باوجود بھی وہ قیدی گولی کو قتل کرکے اس بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ باس نے اس کوتاہی پر شہبازی کی جس بری طرح کھنچائی کی ہے یہ اسی کا اثر ہے۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے شہبازی سے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

"یار شہبازی وہ کہیں اس منحوس قیدی کا سایہ تو نہیں تھا جس کی وجہ سے تمہیں باس کی ڈانٹ سننا پڑی یا پھر گولی کی روح۔"

"تم لوگ میری بات کا یقین کرو یا نہ کرو مگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتیں۔" شہبازی نے بےبسی سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ بنگلے میں ہمارے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔"

"تم ایک جیتے جاگتے انسان کا تذکرہ کررہے ہو۔" عمران نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "وہ کوئی سوئی نہیں تھی جو دن دہاڑے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ مل کر پورے بنگلے کو تلاشا ہے نا اگر تمہاری بات کا یقین کر بھی لیا جائے تو پھر وہ کہاں ہے، وہ کوئی چھلاوا ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی ایسا شخص جس کے پاس سلیمانی ٹوپی ہو۔"

"ہمیں شہبازی کی باتوں کو اتنے سرسری انداز میں نہیں لینا چاہیے عمران" مراد کی گمبھیر آواز ابھری۔ "آج صبح سے بنگلے پر جس نوعیت کے واقعات رونما ہورہے ہیں ان کے پیش نظر ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"مثلاً......!" عمران نے جھجکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "ہمیں کس قسم کی احتیاط کرنا چاہیے؟"

"تم دونوں ادھر ہی رکو۔" مراد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ایک راؤنڈ لگاکر آتا ہوں۔"

"گن ہے نا تمہارے پاس۔" شہبازی نے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" مراد نے جواب دیا۔ "گن تو ہر وقت میرے لباس میں موجود رہتی ہے۔ کیا تم نے بنگلے کا گیٹ اچھی طرح بند کردیا تھا نا؟"

"بالکل کردیا ہے۔" شہبازی نے جواب دیا۔

"اب ہماری مرضی کے بغیر کوئی اس بنگلے میں داخل ہوسکتا ہے اور نہ ہی باہر جاسکتا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" مراد نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔ "ابھی پتا چل جائے گا تم نے جو کچھ دیکھا اس کی کیا حقیقت ہے۔"

"میں تو سمجھتا ہوں یہ شہبازی کے وہم کے سوا کچھ بھی نہیں۔" عمران نے بیزاری سے کہا۔ "یہ صرف اپنی خفت مٹانے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہے۔"

"کیسی خفت؟" شہبازی نے برہمی سے پوچھا۔

"وہ قیدی تمہاری اور گولی کی نگرانی میں تھا۔" عمران نے کڑوے لہجے میں کہا۔ "تم گیٹ پر ڈیوٹی دے رہے تھے اور گولی اس کے کمرے کے باہر موجود تھا۔ قیدی تم دونوں کو الو کا گوشت کھلا کر اس بنگلے سے فرار ہو چکا ہے نہ صرف فرار ہو چکا ہے بلکہ وہ جاتے جاتے گولی کا جھٹکا کر کے اس کی کلاشنکوف بھی لے گیا ہے۔ یہ تمہارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ شہبازی۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اسی ہزیمت اور باس کی طرف سے ہونے والی کھنچائی نے تمہیں عجیب عجیب واہموں میں مبتلا کر دیا ہے۔ تم تصور میں بھی اس کم بخت قیدی کو دیکھنے لگے ہو۔ میں تو سوچ رہا ہوں تم رات کو سو گے کیسے۔ ادھر آنکھ بند کرو گے ادھر وہ قیدی تمہاری بند آنکھوں کے پیچھے نمودار ہو جائے گا۔"

"یار فضول باتیں نہ کرو۔" شہبازی نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔ "میں نے کب اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ میں نے بنگلے کے پہلو میں ابھی اس قیدی کو دیکھا ہے۔"

"تو پھر تم نے کس کو دیکھا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا وہ کون تھا۔" شہبازی نے سادگی سے کہا۔ "مگر وہ کوئی تھا ضرور۔"

"میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ کوئی تھا ضرور۔" عمران ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "اور یہ بھی جانتا ہوں وہ کون تھا۔"

"کون تھا۔" بے ساختہ شہبازی پوچھ بیٹھا۔

"تمہارے دماغ کا فتور۔" عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم لوگوں کے آپس میں الجھنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔" مراد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جب تک میں دیکھ کر تسلی نہیں کر لوں گا، شہبازی کو چین نہیں آئے گا۔"

بات ختم کرتے ہی مراد بیڈ روم سے نکل گیا شہبازی نے عمران سے کہا۔

"یار! تم کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ میں تم سے خوامخواہ جھوٹ کیوں بولوں گا۔ میں نے واقعی بنگلے کے اس حصے میں کسی کو دیکھا تھا۔"

"اگر کوئی وہاں تھا تو پھر غائب کہاں ہو گیا۔" عمران نے تیز لہجے میں سوال کیا۔ "میں نے تمہارے ساتھ مل کر بنگلے کا چپا چپا دیکھا ہے نا۔ اس پراسرار بندے کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا عمران۔" شہبازی نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "مراد کو واپس آ جانے دو پھر پتا چل جائے گا کہ وہ میرے دماغ کا فتور تھا یا۔"

"یا تمہاری بزدلی۔" عمران اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"میری بزدلی کا یہاں کیا ذکر۔" شہبازی نے منہ بگاڑ کر پوچھا۔

"گولی کی عبرت ناک موت اور قیدی کے پراسرار فرار نے تمہارے عمل اور ہمت کو مفلوج کر کے

رکھ دیا ہے۔" عمران طنزیہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "تم پر ایک دہشت سی سوار ہے تم ایک خوف زدہ اور ڈرے ہوئے شخص لگ رہے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں عمران۔" شہبازی نے بے بسی سے کہا۔

"اگر ایسی کوئی بات نہیں اور تم بزدل نہیں ہو تو تمہیں مراد کے ساتھ اس پراسرار شخص کی تلاش میں جانا چاہیے تھا۔ تم اس بنگلے کے نگران اور پہرے دار بھی ہو۔ اس قسم کی کارروائی میں تو تمہیں پیش پیش رہنا چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو عمران۔" شہبازی ہتھیار پھینکتے ہوئے بولا۔ "وہ تو مراد نے یہاں رکنے کو کہا اور میں رک گیا۔ میں جاتا ہوں، ابھی جاتا ہوں۔"

"جاؤ، شاباش۔" عمران نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم ایک بہادر انسان ہو تو تمہیں ثابت کرنا ہوگا کہ گولی کی موت نے تمہارے اعصاب پر کوئی اثر نہیں ڈالا اور تم کسی پراسرار بندے کی اس بنگلے میں موجودی سے بھی خوف زدہ نہیں ہو۔ اگر واقعی کوئی یہاں ہے تو تم اسے ڈھونڈ کر گردن سے دبوچ لو۔" جب تک عمران کی جذباتی تقریب ختم ہوتی، شہبازی بیڈ روم سے باہر جا چکا تھا۔ اب اس کمرے میں صرف دو افراد تھے ایک میں اور دوسرا عمران۔ میں بیڈ کے نیچے گھسا ہوا تھا اور عمران کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ شہبازی اور مراد کی واپسی دس منٹ سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ میرے لیے اتنا وقت بہت کافی تھا۔ اس دوران میں، میں تسلی بخش انداز میں عمران سے نمٹ سکتا تھا۔ میں امید کر رہا تھا کہ شہبازی کے جانے کے بعد عمران بیڈ پر بیٹھ جائے گا لیکن اس نے میری توقع کے برعکس عمل کرتے ہوئے واش روم کا رخ کیا۔ عمران کی اس حرکت نے میرا کام اور بھی آسان کر دیا۔

وہ جیسے ہی واش روم میں گھسا اور اس نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی میں بیڈ کے نیچے سے باہر نکل آیا۔ پندرہ بیس منٹ تک بیڈ کے نیچے ایک مخصوص سکڑی ہوئی پوزیشن میں لیٹے رہنے سے ٹانگوں اور بازوؤں میں دکھن اور اکڑن بھر گئی تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں کی مخصوص حرکتوں کے ذریعے بدن میں چستی بھری اور صورت حال سے نمٹنے کے لیے چوکس ہو گیا۔ میں نے اس دوران میں ان تینوں کی باہمی گفتگو سے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ ان میں سب سے زیادہ اہمیت مراد کی تھی۔ وہ ایک طرح سے اس بنگلے کا ذمے دار تھا۔ شیروانی نے یہاں کے تمام تر معاملات مراد پر ہی چھوڑ رکھے تھے۔ گولی، شہبازی اور عمران اس کی ہدایات پر عمل کرنے کے پابند نظر آتے تھے۔ مراد کام کا بندہ تھا اور یقیناً میرے کام آ سکتا تھا۔ شیروانی اینڈ کمپنی یہاں سے جا چکے تھے۔ میں فی الحال ان کی گرد کو بھی نہیں چھو سکتا تھا اور یہ مجھے کسی قیمت پر گوارا نہیں تھا کہ یہاں سے خالی ہاتھ واپس چلا جاؤں۔ مراد میرے لیے مفید معلومات کا خزانہ ثابت ہو سکتا تھا۔

میں اپنے ہاتھ پاؤں کو مخصوص حرکت دینے کے بعد ایک دم فریش ہو چکا تھا۔ مراد سے تسلی بخش مذاکرات کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں عمران اور شہبازی کا معاملہ پہلے نمٹا لوں ورنہ یہ دونوں مجھے ڈسٹرب کر سکتے تھے۔

میں نے بیڈ روم سے باہر جھانک کر راہداری میں دیکھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ شہبازی اور مراد مجھے بنگلے کے کسی اور حصے میں تلاش کر رہے تھے۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ بنگلے کے پہلو کی طرف گئے ہوں گے جہاں میری اور شہبازی کی نگاہیں چار

www.Paksociety.com

ہوئی تھیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ میری ایک جھلک دیکھ کر وہ مجھے پہچان نہیں پایا تھا۔ پہچان کے مخصوص مدارج طے کرنے کا وقت ہی کہاں ملا تھا اسے وہ ایک لمحہ تھا یا لمحے کا دسواں حصہ جب اس کی مجھ پر نظر پڑی تھی۔ اگر وہ مجھے قیدی کی حیثیت سے پہچان چکا ہوتا تو اس بنگلے کا ماحول اس وقت اتنا پرسکون نظر نہ آرہا ہوتا‘ اس واقعے کی اطلاع سب سے پہلے شیروانی کو دی جاتی اور پھر جو بھی ہو جاتا کم تھا اور اس قسم کی صورت حال میں میں بھی کہاں نچلا بیٹھنے والا تھا۔ دوسری جانب سے جیسی کارروائی ہوتی میں بھی ویسا ہی ردعمل ظاہر کرتا۔ میری گن آگ اگلتی اور یہ بنگلا فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھتا۔

اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے یہ الگ بات کہ وہ مصلحت انسان کی سمجھ میں ذرا مشکل ہی سے آتی ہے جبھی وہ اپنے خلاف صورت حال کو دیکھ کر جھنجلا اٹھتا ہے اور اللہ سے گلہ شکوہ شروع کردیتا ہے اور ان لمحات میں اس حقیقت کو وہ یکسر فراموش کردیتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ عطا کر رکھا ہے اس کا شکر ادا کرنے کا تو کبھی خیال نہیں آیا۔ انسان بنیادی طور پر خود غرض اور مطلب پرست ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اللہ اس کی مرضی اور خواہش کے مطابق عمل کرے۔ اس فکری طرزِ عمل کے دوران میں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اگر اللہ انسانوں کی مرضی کے مطابق عمل کرے تو پھر وہ قادرِ مطلق اور ہمارا پروردگار خالق مالک اور رزاق کیسے ہوسکتا ہے افسوس ہم اللہ کو تو مانتے ہیں مگر اللہ کی نہیں مانتے۔

شہبازی اور مراد کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں بیڈ روم میں مصروف عمل ہوگیا۔ مجھ سے زیادہ قریب اس وقت عمران ہی تھا۔ لہٰذا پہلی باری بھی اسی کی تھی۔ میں نے ایک خاص قسم کی ذہنی تیاری کے بعد واش روم کے دروازے پر دستک دی۔

”کیا بات ہے؟“ عمران نے بیزاری سے پوچھا۔

میں اسے اپنی آواز سنانے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ اس کے استفسار پر میں نے دوبارہ دستک دی اس بار واش روم کا دروازہ بجاتے ہوئے میں نے قدرے زیادہ قوت صرف کی تھی۔ اندر موجود عمران جھنجلا اٹھا۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

”کچھ منہ سے بھی تو پھوٹو۔ دروازہ ہی بجاتے جا رہے ہو۔“

میں نے دروازے پر تیسری بار دستک دی۔

”مجھے پتا ہے تم شہبازی ہو۔“ عمران نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ”تم ایک ڈرپوک انسان ہو میں جانتا ہوں تم مجھے مطمئن کرنے کے لیے یہاں سے گئے تھے مگر مراد کے پاس نہیں پہنچے۔ ادھر راہداری ہی سے گھوم کر واپس آگئے ہو۔ ٹھہرو میں باہر آ کر تمہاری بھی سنتا ہوں۔“

عمران نے واش روم کے اندر بیٹھے بیٹھے صورت حال کا جو تجزیہ کیا تھا‘ ممکن ہے وہ شہبازی کی نفسیات اور فطرت سے مطابقت رکھتا ہو مگر یہاں کی سچویشن اس سے انتہائی مختلف تھی۔ کیا مختلف تھی۔ یہ تو اسے باہر نکلنے کے بعد ہی پتا چلنا تھا۔

میں گن کو کسی لاٹھی کے مانند پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ گن کی نال پر میرے ہاتھوں کی گرفت خاصی مضبوط تھی جبکہ گن کا دستہ (بٹ) آزاد حالت میں عمران کے سر کو چومنے کا انتظار کررہا تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ عمران واش روم سے باہر آتا اور......!

میرے پاس وقت بہت کم تھا لہٰذا میں کسی قسم کی کشمکش کو دعوت نہیں دے سکتا تھا شہباز اور مراد تلاشی سرگرمیوں کو نمٹا کر کسی بھی وقت واپس آسکتے

۔ مجھے جو بھی کرنا تھا آنِ واحد میں کرنا تھا اور میں نے کر ڈالا۔

عمران جیسے ہی واش روم سے باہر آیا۔ میرے ہاتھوں نے میکانکی حرکت کی۔ میں نے گن کو لٹھ کی طرح گھمایا۔ اگلے ہی لمحے گن کا دستہ عمران کے کھوپڑی پر پڑا۔

یہ ایک اچانک اور کاری وار تھا۔ عمران کی سمجھ میں نہ آسکا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ سب کچھ چشم زدن میں پیش آگیا تھا۔ میری گن کا بوسہ اپنی کھوپڑی پر لینے کے بعد وہ ڈگمگایا اور پھر تیورا کر کمرے کے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کارروائی کے دوران میں اسے ہونٹوں سے اوں یا آہ تک خارج کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ میں فرش پر اکڑوں بیٹھ کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔

اس معائنے میں سب سے پہلے اس کا سر میری نظر میں آیا۔

میں نے بغور اس کی کھوپڑی کا جائزہ لیا۔ کہیں سے خون کا اخراج نظر نہ آیا۔ وہ بڑے بے ڈھنگے انداز میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ عدم آباد روانہ نہ ہوگیا ہو......!

میں نے اس کی نبض اور ناک کے ساتھ ہاتھ رکھ کر سانس کی آمد و شد کو جانچنے کی کوشش کی۔ نبض بہت ہی سست رفتار سے چل رہی تھی۔ سانسیں بھی بہت دھیمی تھیں۔ سینے کی مخصوص حرکت سے بھی پتا چلتا تھا کہ وہ ابھی اسی دنیا میں موجود ہے۔ کھوپڑی پر لگنے والی اچانک ضرب نے فی الحال اسے دنیا و مافیہا سے بے گانہ کردیا تھا۔ وہ اس وقت گہری بے ہوشی میں تھا۔

مجھے اس کی بے ہوشی یا انتاغفیلی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی میں اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرسکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کے بے ہوش بدن کو کھینچ کر واش روم کے اندر پہنچا دیا۔ اس سلسلے میں مجھے اچھی خاصی محنت کرنا پڑی تھی۔ ایک جیتے جاگتے انسان کی بہ نسبت کسی بے ہوش یا مردہ شخص کو ٹھکانے لگانے کا کام قدرے مشکل اور دشوار ثابت ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے یہ کام کسی نہ کسی طرح کر ہی ڈالا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ایک گھنٹے سے پہلے اسے ہوش نہیں آنے والا تھا۔ مزید اطمینان کے لیے میں نے واش روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی۔ اب اگر وہ ہوش میں آ بھی جاتا تو اس وقت تک واش روم سے باہر نہیں آسکتا تھا جب تک دروازے کو کنڈی لگی ہوئی تھی۔

اس کمرے میں بیٹھ کر مراد اور شہبازی کا انتظار کرنا سراسر حماقت ہوتی۔ میں نے ہاتھ جھاڑے اور بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ راہداری ابھی تک ویران اور خالی تھی۔ میں دبے قدموں اس کمرے کی جانب بڑھنے لگا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں نے شیروانی اینڈ کمپنی کو بیٹھے اور باتیں کرتے سنا تھا۔ شیروانی کے تصور کے ساتھ ہی میرا دھیان فرحانہ کی طرف چلا گیا۔ یہ سارے ہنگامے اسی کے لیے جنم لے رہے تھے۔

شیروانی اور مرزا یاسین بیگ کی باہمی گفتگو اور ازاں بعد شیروانی کی فون کال سے مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ فرحانہ اس بنگلے میں نہیں بلکہ جنید خان نامی کسی شخص کی تحویل میں تھی۔ شیروانی نے جنید خان کو سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ فرحانہ کی کڑی نگرانی اور حفاظت کرے کم بخت شیروانی اس حقیقت سے واقف ہوچکا تھا کہ فرحانہ میری کمزوری ہے رہی سہی کسر بیگ نے اس کے کان بھر کے پوری کردی تھی۔

مجھے ایک بات کا اطمینان تھا کہ فرحانہ جہاں تھی

زندہ سلامت اور محفوظ تھی اور پتا نہیں کیوں' مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ مراد کو جنید خان کے بارے میں سب کچھ نہیں تو بہت کچھ معلوم ہوگا۔

میں مراد کو ٹارگٹ بنا کر قدم قدم محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ عمران کی جانب سے گھنٹے' دو گھنٹے کی بے فکری ہوگئی تھی۔ اب صرف شہبازی سے نمٹنا باقی تھا۔ جبھی مراد سے پرسکون ماحول میں مذاکرات ہوسکتے تھے۔

میں پیش آمدہ حالات کے بارے میں سوچتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے پہلو میں ایک دروازہ کھلا اور مراد میرے سامنے آ گیا۔ اس کے عقب میں مجھے شہبازی بھی دکھائی دیا۔ میں اس لمحے کی توقع کر رہا تھا کہ بنگلے میں کہیں بھی اور کسی بھی وقت ان سے ٹکراؤ ہوسکتا ہے لیکن انہیں مجھ سے ایسی اچانک ملاقات کی قطعاً امید نہیں تھی۔ مجھے گن بہ دست اپنے روبرو پا کر ایک لمحے کے لیے تو وہ دونوں ششدر رہ گئے۔

میرے لیے یہ ایک لمحہ ہی کافی تھا۔ اس سے پہلے کہ مراد اپنے پسٹل کا رخ میری جانب کرتا میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کے سینے پر ایک زوردار فرنٹ کک رسید کی۔

شہبازی' مراد کے عین عقب میں کھڑا تھا۔ مراد میری کک کھا کر پیچھے کو الٹا تو وہ شہبازی سے ٹکرا گیا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ دونوں کمرے کے فرش پر گرے۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں اچھل کر کمرے کے اندر پہنچا اور دروازے کو کنڈی لگادی۔

وہ دونوں فرش پر پڑے دہشت اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔ پسٹل ہنوز مراد کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کسی بھی لمحے اس آتشیں ہتھیار کا استعمال کرسکتا تھا لہٰذا میں نے پہلی فرصت میں پاؤں کی زوردار ٹھوکر مار کر پسٹل اس کے ہاتھ سے چھڑا دیا اور کلاشنکوف کا رخ ان کی طرف کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''کوئی غلط حرکت نہیں۔ شرافت سے اٹھ کر بیٹھ جاؤ اور اپنے ہاتھ سر سے اوپر اٹھالو۔ ہری اپ۔''

ان کے لیے یہی تعجب کی بات تھی کہ مجھے اپنے سامنے دیکھ رہے تھے کجا یہ کہ میرے دونوں ہاتھوں میں ایک مہلک گن بھی انہیں نظر آ رہی تھی۔ یہی نہیں بلکہ اس وقت میں ان پر حاوی بھی آ چکا تھا۔

ایک لمحہ تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت میں رہنے کے بعد وہ دونوں بہ آہستگی اٹھنے لگے۔ میں ان کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں تھا۔ وہ مجھے اپنا دشمن بلکہ شکار سمجھتے تھے۔ مجھے قابو کرنے کا کوئی لمحہ کوئی موقع ضائع نہیں کرسکتے تھے۔

''ہاتھ اوپر...... سر سے اوپر...... ہوا میں بلند۔'' میں نے خطرناک لہجے میں کہا۔ ''کوئی بھی ہوشیاری اور چالاکی تمہیں چشم زدن میں' موت کے منہ میں پہنچا سکتی ہے۔''

''کیا...... تم ابھی تک...... اسی بنگلے میں چھپے ہوئے تھے؟'' مراد نے بکھری ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''اس وقت تم میرے رحم و کرم پر ہو۔'' میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سفاکی سے کہا۔ ''لہٰذا پوچھ گچھ میں کروں گا۔ تم صرف میرے سوالوں کے جواب دو گے۔''

انہوں نے بہ یک وقت الجھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر میری ہدایت کے عین مطابق' وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھ ہوا میں بلند تھے اور وہ کمرے کے فرش پر حیران و پریشان براجمان تھے۔

وہ کمرا خاصا وسیع و عریض تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس پر جائزہ نگاہ ڈالی۔ اسے ہال کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ہال کی دیواروں کے ساتھ صوفے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ اس ہال میں اتنی گنجائش نظر آ رہی تھی کہ یہاں بہ یک وقت بیس افراد بیٹھ کر کسی بھی موضوع پر تبادلہ خیال کرسکتے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ شیروانی اسی ہال میں مجھے ذلیل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مزید تصدیق کی خاطر میں نے مراد سے پوچھا۔

''تمہارا باس اسی کمرے میں کوئی جشن وغیرہ منانے والا تھا نا؟''

''تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟'' مراد کی آنکھوں میں حیرت آمیز الجھن جھلکنے لگے۔

''میں نے کہا نا سوال نہیں۔'' میں نے دھمکی آمیز نظر سے اسے گھورا۔ ''مجھے کیا معلوم ہے اور کیا نہیں' یہ تمہارے جاننے کی باتیں نہیں ہیں۔ اس چکر میں اپنا سر اور میرا دماغ خراب نہیں کرو اور فوراً سے پیشتر وہ بتاؤ جو میں نے پوچھا ہے ورنہ تم دونوں کا حشر نشر بھی گولی اور عمران جیسا ہی ہوگا۔''

''ہاں...... باس اسی ہال میں جشن کا ارادہ رکھتا تھا۔'' اس نے سراسیمہ لہجے میں بتایا اور فطرت سے مجبور ہو کر سوال پوچھنے سے باز نہیں رہ سکا۔ ''عمران کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے۔ کہیں اسے بھی تو......؟''

''اب اگر تم نے کوئی سوال کیا تو میں کسی رعایت سے کام نہیں لوں گا۔'' میں نے قطع کلامی کی اور خطرناک انداز میں کلاشنکوف کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی اس فرش پر تم دونوں تڑپتے نظر آ ؤ گے۔''

وہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی کیفیت کا شکار دہشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے مراد سے پوچھا۔

''مراد! اگر تم چاہو تو زندگی کے باقی دن آرام و آسائش سے گزار سکتے ہو۔ میں تمہیں ایک تھپڑ بھی نہیں ماروں گا مگر اس کے لیے تمہیں میرے چند سوالوں کے بالکل ٹھیک اور درست جواب دینا ہوں گے۔ بتاؤ جواب دو گے یا حرام موت مرنا پسند کرو گے؟''

''تمہیں میرا نام بھی معلوم ہے۔'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ تم...... تم......''

''تم مراد ہو۔'' میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اور تمہارے پیچھے نظر آنے والا یہ کالا بھینسا شہبازی ہے۔ گولی اپنے منطقی' عبرت ناک انجام کو پہنچ چکا ہے اور عمران کو خود بھی کوئی خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ تمہارا باس شیروانی اپنے ملکی اور غیر ملکی دوست کے ساتھ یہاں سے دفع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ......!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تھوڑی دیر پہلے جب تم لوگوں کا باس ایک کمرے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا گفت و شنید کر رہا تھا تو اس کالے بھینسے شہبازی نے اس کلین شیو ہیرو عمران کے ساتھ مل کر گولی کی خون آلود لاش کو ایک ڈرم میں ٹھکانے لگایا تھا۔ اتنا کافی ہے کہ اور بھی کچھ بتاؤں؟''

مراد کے چہرے اور آنکھوں میں پہلے سے موجود الجھن میں کئی گناہ اضافہ ہوگیا جبکہ شہبازی کے سیاہ چہرے پر نمودار ہونے والی زردی بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ میری فراہم کردہ سنسنی خیز معلومات نے اسے بے حد خوفزدہ کر دیا تھا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

www.Paksociety.com

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دوران میں تم اسی بنگلے میں کہیں نہ کہیں موجود رہے ہو؟"

"بالکل اس کا یہی مطلب ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور میں اس وقت تک یہاں موجود رہوں گا۔ جب تک تمہاری زبان سے میری مطلوبہ معلومات مجھے حاصل نہیں ہوجاتیں۔"

"مم...... میں...... جاؤں۔" شہبازی منت ریز لہجے میں منمنایا۔

"نہیں۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ "مجھے تم سے بھی بہت کچھ پوچھنا ہے چپ چاپ شرافت سے بیٹھے رہو۔"

"نن...... نہیں بیٹھ سکتا۔" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

"کیوں نہیں بیٹھ سکتے۔" میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ "کیا اچانک فرش میں کانٹے نکل آئے ہیں جو تمہیں یہاں بیٹھنے میں دقت ہورہی ہے؟"

"کانٹے نہیں...... وہ۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"وہ کیا۔" میں نے تعجب خیز نظر سے اسے دیکھا۔

"مجھے واش روم جانا ہے۔"

"اوہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا۔ "یہ تمہاری کوئی چال تو نہیں؟"

"تم مجھ سے جس کی چاہو قسم لے لو۔" وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "مگر مجھے واش روم جانے دو۔ اگر میں ایک منٹ بھی رکا تو......!"

"اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ "یہاں پر تمہارا کچھ بھی خطا نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس حال کی فضا مکدر اور ماحول ناخوش گوار ہوجائے گا۔"

وہ جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے کہا۔ "اس ہال سے باہر قدم بھی نہیں نکالو گے۔ اس ہال میں بھی تو واش روم ہوگا۔" بات کے اختتام پر میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔

اگلے ہی لمحے واش روم کا دروازہ میری نگاہ میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی شہبازی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہاں ہے واش روم...... وہ اس طرف۔"

پھر اس نے اسی جانب اشارہ بھی کیا جہاں میں نے واش روم کا بند دروازہ دیکھا تھا۔ میری نگاہ شہبازی پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے تو یہی لگتا تھا کہ حوائج ضروریہ نے اس کی برداشت کا سوا ستیاناس مار رکھا ہے۔ اس کے باوجود بھی میں اس کی طرف سے کلی طور پر بے فکر نہیں ہوسکتا تھا اور یہی محتاط روی میرے کام آ گئی۔

شہبازی نے کھڑے ہونے کے بعد سیدھا واش روم کا رخ کیا تھا لیکن یہ ایک طرح کا دھوکا تھا۔ وہ واش روم والی کہانی سنانے سے پہلے ہی میری آنکھوں میں دھول جھونکنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ ابھی اس نے واش روم کی سمت آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ وہ بجلی کی سرعت سے پلٹا اور اس نے دوسری جانب دوڑ لگادی۔

اگلے ہی لمحے وہ پسٹل میری نظر میں آ گئی۔ جسے میرے پاؤں کی ایک طوفانی ٹھوکر نے مراد کے ہاتھ سے چھڑا کر ہال کی ایک دور افتادہ دیوار تک پہنچا دیا تھا۔

میرے اور مذکورہ پسٹل کے درمیان فاصلہ اتنا تھا کہ میں جست بھر کر وہاں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ شہبازی کو اس خطرناک پسٹل تک رسائی

روکنے کے لیے جسمانی چارہ جوئی ممکن نہیں تھی میں مجبور ہوگیا۔ گن کے استعمال کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔

میرے ہاتھوں نے بڑی سرعت سے میکانکی حرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی کلاشنکوف کی مخصوص گرج ہال کی محدود فضا میں پیدا ہوئی اگلے ہی لمحے شہبازی کی درد میں ڈوبی ہوئی خوف ناک چیخ بلند ہوئی یہ میری زندگی کی پہلی فائرنگ تھی۔

میں نے حتی الامکان کوشش کے ساتھ شہبازی کے پاؤں کو نشانہ بنایا تھا۔ میں کوئی ماہر نشانے باز یا تجربہ کار شوٹر نہیں تھا۔ جو پاؤں کا مطلب پاؤں ہی ٹھہرتا۔ یہ میری زندگی کا پہلا سنسنی خیز اور خوف ناک تجربہ تھا۔ لہٰذا ہاتھ بہک جانا لازمی تھا۔ کلاشنکوف کے دہانے سے خارج ہونے والی تیز رفتار گولیوں نے شہبازی کے پاؤں، ٹانگوں اور گھٹنوں تک کو چھید ڈالا اور وہ ایک وحشت ناک درد بھری چیخ کے ساتھ کسی ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند ہال کے فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

میرا وار ایسا مہلک بھی نہیں تھا کہ شہبازی زندگی کی بازی ہی ہار جاتا تاہم میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ اس وقت تکلیف کی انتہاؤں سے گزر رہا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے سناٹے میں آ گیا تھا۔ میں نے اگرچہ شہبازی کی جان لینے کی کوشش نہیں کی تھی، پھر بھی میرے اناڑی پن کے سبب وہ ایک طویل عرصے کے لیے محتاجی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہونے والا تھا اور اس کی جان بھی جاسکتی تھی اور پھر گولی چلانے کا احساس ہی مجھے ششدر کردینے کے لیے کافی تھا۔ ان لمحات میں بہ خدا مجھے بالکل یہ اندازہ نہیں تھا کہ میرے ہاتھ سے ہونے والی یہ فائرنگ اس ہنگامہ خیز زندگی کی ابتدا ثابت ہوگی۔ جس سے میں تاحیات نبرد آزما رہا۔

وقتی ندامت، پشیمانی یا احساسِ جرم کے باعث میں چند لمحات کے لیے اپنے گردوپیش سے بے گانہ ہوگیا تھا۔ اسی نازک موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مراد نے مجھ پر حملہ کردیا۔

اس کم بخت کو اندازہ ہوگیا تھا کہ میرا دھیان کہیں اور لگا ہوا ہے خود پر سے توجہ ہٹنے کا احساس ہوتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگادی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں صوفے پر اور مراد میرے اوپر لدا ہوا تھا۔

اس کی پہلی کوشش یہی تھی کہ میری گن پر قبضہ کرلے لیکن میں اس کی کوشش کو کسی بھی قیمت پر کامیاب ہونے نہیں دے سکتا تھا۔ اگر وہ میرے ہاتھوں سے گن چھین لیتا تو چشم زدن میں یہ بازی پلٹ جاتی۔ پھر میں مراد کے نشانے پر ہوتا اور وہ مجھ پر ویسے حکم چلا رہا ہوتا جیسا تھوڑی دیر پہلے میں ان پر چلا رہا تھا۔ بلکہ وہ احکامات صادر کرنے میں کمینگی کی ہر انتہا سے گزر سکتا تھا اور میں ایسا نہیں ہونے دیتا۔ جو بازی جان پر کھیل کر میں نے اپنے نام کی تھی اپنی آنکھوں کے سامنے اسے کیسے پلٹ جانے دیتا۔

مراد ایک ڈیل ڈول والا قوی الجثہ شخص تھا۔ اس کے بدن میں کسی سانڈ ایسی طاقت اور وحشت بھری ہوئی تھی اور کلاشنکوف کی چھینا جھپٹی والا یہ معاملہ اس کے لیے بھی زندگی موت کا کھیل تھا۔ وہ حیوانی کھینچا تانی کے دوران مجھے اتنا موقع نہیں دے رہا تھا کہ میں گن سیدھی کرکے اسے فائرنگ کا نشانہ بنا سکتا۔

ہم دونوں گتھم گتھا ہی تھے کہ مجھے ایک چانس مل گیا۔ یہ گن کے دوبارہ آزمانے کا چانس نہیں تھا۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو گھٹنوں پر سے فولڈ کیا اور دونوں پاؤں کو مراد کے پیٹ سے لگا کر ایک جرک کے ساتھ دونوں ٹانگیں کھول دیں۔

یہ ایک طوفانی دھکا تھا۔ میری گرفت کو توڑ کر مجھ سے گن چھیننے کی کوشش کرنے والے اس کے ہاتھ بے بسی کے ساتھ مجھ سے جدا ہوئے اور مراد توپ سے نکلنے والے کسی گولے کی مانند ہال کے فرش پر گرا پھر پھسل کر دیوار کے قریب پہنچ گیا۔
وہ کم بخت میرا دھکا کھانے کے بعد ہوفے پر سے پینتالیس ڈگری کے زاویے کے ساتھ فضا میں پرواز کرتے ہوئے فرش تک پہنچا تھا۔ یہ بہت ہی خطرناک زاویہ ہوتا ہے۔ جنگ کے دوران میں توپ کے گولے کو زیادہ سے زیادہ دوری تک پہنچانے کے لیے پینتالیس ڈگری کے زاویے ہی سے فائر کیا جاتا ہے۔ دور مار کرنے والی پینتالیس ڈگری کی خطرناکی اپنی جگہ میں اس سے بھی زیادہ خطرناک صورتحال کو دیکھ کر چونک اٹھا۔
مراد فرش پر گرنے کے بعد پھسل کر جس دیوار کے نزدیک پہنچا تھا۔ اس کا کھویا ہوا پسٹل وہاں سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ اگر مراد سنبھلنے کے بعد اس پسٹل کو دوبارہ اپنے قبضے میں کر لیتا تو وہ نامراد میرے لیے ان گنت مشکلات کھڑی کر سکتا تھا۔
میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے ایسا موقع فراہم کرنا الم ناک موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔ میں نے کلاشنکوف کو دوبارہ بستے کے مانند اپنے گلے میں ڈال کر پہلو میں لٹکا لیا اور آندھی اور طوفان کی رفتار سے اس کے سر پر پہنچ گیا۔
اس دوران میں مراد اس قدر سنبھل گیا تھا کہ اس نے پسٹل کو اپنی گرفت میں لانے کے لیے بازو کو آگے پھیلا دیا تھا۔ میں بھلا اس کی یہ کوشش کیسے کامیاب ہونے دیتا۔ میں نے جوگر ملبوس اپنے پاؤں کو پوری قوت کے ساتھ مراد کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر مارا۔ ایک تو جوگر او پر سے میرا غصیلا وار اور وہ بھی اس کے ہاتھ کے پشتے پر۔ مراد کے حلق سے ایک لرزہ خیز بلبلاہٹ خارج ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ کر اسے دوسرے ہاتھ سے دبانا شروع کر دیا۔ شاید اس طرح وہ تکلیف کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔
میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور پسٹل کو اٹھا لیا۔ پھر میں نے مذکورہ پسٹل کو اپنی جینز کی پاکٹ میں گھسا دیا۔ وہ ایک سلم ماڈل چھوٹا سا ہتھیار تھا، بڑی سہولت اور شرافت کے ساتھ وہ میری جیب میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں جیسے ہی پلٹا تو مراد کو اپنے پاؤں پر کھڑے پایا۔
اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بار بار اپنے گھائل ہاتھ کو جھٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے حد سے زیادہ نفرت اور عداوت دکھائی دی۔ اس وقت میرے پاس ایک چھوڑ دو دو گنیں تھیں۔ اس آتشیں اسلحے کے بل بوتے پر میں بآسانی مراد کو ہینڈل کر سکتا تھا لیکن اس کے تیور دیکھ کر مجھے بھی ہاتھ پاؤں کھولنے کا دل چاہا کیونکہ اس نے اچانک مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔
یہ ایک غیر محتاط اور افراتفری پر مبنی حملہ تھا۔ بس، وہ کسی جنگلی کے مانند مجھ پر جھپٹ پڑا تھا اور اس نے میری گردن دبوچنے کی کوشش کی تھی میں بیک فٹ پر اچھلا پھر میں نے اس کی یہ کوشش بارآور ہونے سے پہلے ہی اک لمبا اسٹیپ لے کر اس کی پسلیوں میں ایک سائیڈ کک جڑ دی۔ میری طوفانی کک کھا کر وہ پیچھے کو اچھلا اور دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ ایک مرتبہ پھر اس کے حلق سے زخمی چیخ خارج ہوئی۔
میں نے مارشل آرٹ کو باقاعدہ کہیں سے نہیں سیکھا تھا۔ یہ میرے ایک دوست کا احسان تھا میں

ں اس کلب میں باڈی بلڈنگ کرنے جاتا تھا وہ ماہر نامی ایک لڑکا بھی باڈی بلڈنگ کرنے آتا ماہر مارشل آرٹس میں بلیک بیلٹ تھا اور بیرون لک بھی مارشل آرٹس کے کئی ایک ٹورنامنٹس میں نہ ل حصہ لے چکا تھا بلکہ کامیابی حاصل کرنے کے مید یڈلز وغیرہ بھی جیت کر لایا تھا۔ ہم دونوں کے میان جب دوستی بڑھی تو میری دلچسپی کو دیکھتے ئے اس نے مجھے بھی یہ فن سکھانا شروع کر دیا تھا۔ وسا اسٹریٹ فائٹ کے گر وغیرہ جن میں سیلف فنس بھی شامل تھا۔ اب وہی ٹریننگ کام آ رہی تھی۔
مراد اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ بعض گوں کی کھال بہت موٹی اور ہڈی بہت ڈھیٹ ہوتی ہے۔ مراد کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا تھا۔ مجھ سے پٹنے کے باوجود بھی اسے چین نہیں آیا تھا اور ایک مرتبہ پھر وہ مجھ پر حملہ آور ہو گیا تھا۔
اب کی بار میں نے کسی بخل یا کنجوسی سے کام نہیں لیا اور حصہ بقدر جثہ کے مصداق اس کے طعام کا خصوصی اہتمام لگ بھگ دو منٹ تک جاری رکھا۔ اس قلیل مدت میں میرے پنچز اور ککس نے اس کے سارے بل کس نکال کر رکھ دیے۔ اس کا چہرہ لہولہان اور بدن ہلکان ہو چکا تھا۔ قدم اس طرح لڑکھڑا رہے تھے کہ جم کر کھڑا ہونا بھی اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ اس کی حالت افسوس ناک اور چہرہ خوف ناک ہو چکا تھا۔ اس مناسب خوراک کے بعد میں نے ہاتھ روک لیا۔ میں دراصل اسے ایسی حالت میں پہنچانا چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں نہ رہے تاکہ میں بڑے تسلی بخش انداز میں اس سے پوچھ تاچھ کر سکوں اور میں اپنے اس مقصد میں صد فی صد کامیاب رہا تھا۔
میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

alislampk.com
ملک کا منفرد دینی و اصلاحی رسالہ
ماہنامہ الاسلام کراچی
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیرادارت
قیمت: 20 روپے
دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوریؒ
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد
خوابوں کی تعبیر: حافظ عبدالقیوم نعمانی
دنیائے اسلام کے تمام مسالک سے متعلق علمائے کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل
سب کچھ جو آپ جاننا اور پڑھنا چاہتے ہیں
پتا: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی
فون: 35260771/2 فیکس: 35260773
alislamkhi@gmail.com

''اب تمہاری سمجھ میں اچھی طرح یہ بیٹھ گیا ہوگا کہ میں اپنا مقصد حاصل کیے بغیر یہاں سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ چپ چاپ شرافت سے میرے ساتھ تعاون جاری رکھو۔''

''کیا چاہتے ہو تم مجھ سے۔'' وہ بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''میری باری بعد میں آئے گی۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''پہلے جس کی بکنگ ہے اس کا کام پہلے ہونا چاہیے۔ اس کے بعد بتاؤں گا کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں۔''

''بکنگ؟'' وہ عجیب سی الجھن بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے شہبازی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے تھوڑی دیر پہلے مجھ سے ایک فرمائش کی تھی۔ اسے واش روم جانے کی حاجت محسوس ہو رہی تھی۔ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے لہٰذا حاجت روائی کے کچھ اوصاف اس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ تم کتنے بھی بدکردار ہی سہی، آخر ایک انسان بھی ہو۔ میں یہ نیک کام تمہارے ہاتھ سے ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''کون سا نیک کام۔'' اس کی الجھن آمیز حیرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

''شہبازی کو واش روم تک پہنچانے کا کام۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی حاجت روائی فی الحال تمہیں ہی کرنا ہے۔ دیکھ نہیں رہے یہ بے چارہ اپنے پاؤں سے چل کر واش روم تک جانے کے قابل نہیں رہا۔''

واقعی، ان لمحات میں شہبازی کی حالت خاصی ابتر اور قابل رحم ہو رہی تھی۔ اس کے بدن کا زیریں حصہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا اور اس کے گھائل جسم سے خارج ہونے والا خون ہال کے فرش کے اس حصے رنگین بنا رہا تھا جہاں وہ کسمپرسی کی حالت میں کراہ رہا تھا۔ اس کے حلق سے دردناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ تاہم ان آوازوں میں وہ ابتدا والی تیزی، بلبلاہٹ موجود نہیں تھی۔ ہال کے اندر میرے ہاتھوں بننے والی مراد کی درگت کو دیکھ کر شہبازی خاصا سہم گیا تھا۔ اسے اپنا انجام بھی مراد سے مختلف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی تصور نے گویا اس کی سٹی گم نہ سہی تو دکھی ڈھنڈلی ضرور کر دی تھی پھر خون کے مسلسل اخراج کی وجہ سے بھی اس پر ایک دہشت سی طاری ہو گئی تھی۔ وہ ہر گزرتے پل کے ساتھ نقاہت کے عمیق غار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا وہ تھوڑی دیر میں بے ہوش ہو جائے گا۔

''لیکن!'' مراد اپنے چہرے سے رسنے والے خون کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''شہبازی کو واش روم نہیں جانا تھا۔ وہ تو اس نے بہانہ کیا تھا۔''

''بہانہ دہانہ میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''وہ گھڑی قبولیت کی تھی جب شہبازی نے واش روم جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اس کو ضرورت ہے یا نہیں، واش روم تو اسے جانا پڑے گا اور یہ کام تم کرو گے۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''یہ چوائس میں تم پر چھوڑتا ہوں کہ اسے گھسیٹ کر واش روم کے اندر پہنچاؤ یا کندھے پر لاد کر۔ میں ٹھیک دو منٹ کے اندر شہبازی کو واش روم کے اندر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''مگر میرے ہاتھ میں سخت تکلیف ہے۔'' وہ میرے ستم کا نشانہ بننے والے اپنے ہاتھ کو دوسرے

ے دباتے ہوئے بولا۔ ''میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکوں گا۔ تم بھی میری مدد کرو۔''

''میں یہ کام بڑی آسانی سے خود بھی کر سکتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نہیں کرو گے تو میں کراؤں گا مگر اس صورت میں مجھے تمہارے دوسرے ہاتھ کو بھی ناکارہ بنانا ہوگا تاکہ تم جب کسی کام سے معذوری کا اظہار کرو تو یہ کوئی جھوٹ نہ ہو اور تمہارا ضمیر کسی دروغ گوئی پر تمہیں ملامت نہ کرے۔''

''کرتا ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

اور فرش پر پڑے بے یار و مددگار شہبازی کی ہے قدم بڑھا دیے۔

میں جانتا تھا کہ وہ خون کے گھونٹ پی کر میرے ام کی تعمیل پر راضی ہوا تھا۔ جب کسی انسان کو اس ل مرضی کے خلاف جبراً کسی کام کے لیے مجبور کیا ہے تو اپنی فطرت کے مطابق، وہ ایسے جابر حاکم ے بارے میں انتہائی منفی اور منتقمانہ انداز میں سوچتا پھر جیسے ہی اسے کوئی موقع ملتا ہے وہ جوابی روائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا میں مراد کسی بھی ردعمل کے لیے ہر لحہ ذہنی طور پر تیار تھا۔

اس نے شہبازی کو بازوؤں سے تھام کر بادل ناخواستہ دھیرے دھیرے ہال کے چکنے فرش پر گھسیٹنا شروع کر دیا تو میں نے وارننگ دینے والے انداز میں کہا۔

''تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔ یہ وقت ختم ہونے سے پہلے شہبازی واش روم کے اندر ہونا چاہیے۔''

مراد نے طوعاً و کرہاً میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دو منٹ سے پہلے ہی زخمی شہبازی کو واش روم کے اندر پہنچا دیا۔ اس دوران میں شہبازی کا واویلا بھی جاری رہا تھا۔ اس کی بتدریج کمزور ہوتی ہوئی آواز سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ چند منٹ بعد وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ مجھے جلد از جلد اپنا کام نمٹا کر اس بنگلے سے نکلنا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں شہبازی کی کسی میڈیکل ٹریٹمنٹ کے بارے میں سوچتا۔ اس کا بے ہوش ہو جانا ہی اس کے لیے اور ہم سب کے لیے بہتر تھا۔

جب شہبازی تسلی بخش انداز میں واش روم کے اندر منتقل ہو چکا تو میں نے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی اور مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹیلی فون کی سہولت کس کمرے میں ہے؟''

''وہ...... اس طرف۔'' وہ راہداری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ادھر ایک کمرے میں فون سیٹ موجود ہے۔ تم کس کو فون کرنا چاہتے ہو؟''

''تمہارے باپ کو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اسی کمرے میں چلو جہاں ٹیلی فون رکھا ہے۔ باقی کی باتیں وہیں پر ہوں گی۔ چلو۔''

وہ میری ہدایت کے مطابق میرے آگے چلنے لگا۔ ہال کے باہر آ کر اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''تم باس کو کیوں فون کرنا چاہتے ہو۔''

''کون باس۔'' میں نے بدستور اسے گن کے اشارے پر رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں شیروانی صاحب کی بات کر رہا ہوں۔''

''میں نے تو تمہارے باپ سے بات کرنے کا ذکر کیا تھا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے نہیں پتا تھا کہ شیروانی تمہارا باپ ہے۔ تمہاری ماں نے کب شیروانی سے عقد ثانی کیا ہے؟''

نتائج کی پروا کیے بغیر وہ اچانک پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میرے الفاظ نے اس کے تن بدن میں زہر بھر دیا تھا۔ وہ ان لمحات میں بے بسی اور بے چارگی کی انتہا سے گزر رہا تھا۔ اس کی یہ عاجلانہ حرکت مرتا کیا نہ

www.Paksociety.com

کرتا کی عکاس تھی۔
میں چونکہ اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ لہٰذا اس کے حملے کا شایانِ شان استقبال یا۔ وہ جس تیزی اور تندی سے مجھ پر پلٹا تھا میں نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سائیڈ مود کی اور اس کے ٹارگٹ کی جگہ خالی کردی۔

وہ اپنی ہی جھونک میں فضا میں آگے کو لڑھکا پھر دھڑام کی آواز کے ساتھ اس کے بھاری بدن نے راہ داری کے فرش کو بوسہ دیا اور چند فٹ تک چکنے فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ میں تیزی سے اس کے سر پر پہنچا پھر اس کی گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے خوفناک لہجے میں کہا۔

''مراد کسی نامراد کی اولاد۔ میں کہیں آرام سے بٹھا کر تم سے چند سوالات کرنا چاہتا تھا مگر میں دیکھ رہا ہوں یہ عزت تمہیں راس نہیں آ رہی۔ لگتا ہے تمہیں بھی کسی واش روم کی فرش نشینی کا شوق چرا رہا ہے۔''

''پاؤں ہٹاؤ میری سانس رک رہی ہے۔'' وہ التجا آمیز لہجے میں بولا۔ ''اب میں تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''شاباش یہ ہوئی نا بات۔'' میں نے اپنا پاؤں اس کی گردن کے اوپر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ آئندہ مجھے کسی چھوٹی بڑی شکایت کا موقع نہ دو ورنہ...... ابھی تو تمہاری سانس ہی رک رہی تھی۔ میں اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر تمہاری سانس کی آمد و شد کا سلسلہ منقطع بھی کر سکتا ہوں۔''

وہ شرافت سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر کسی جنگی قیدی کی طرح میرے آگے چلتے ہوئے مجھے ایک ایسے کمرے میں پہنچا دیا جہاں اس کے مطابق ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔

یہ وہی کمرا تھا جہاں چند گھنٹے پہلے میں شیروانی اینڈ کمپنی کو میٹنگ کرتے سنا تھا۔ ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اس ڈرائنگ روم نما کمرے میں پہنچ گئے۔ میں نے وہ صوفہ سنبھال لیا جہاں قریب ہی ایک چھوٹی میز پر ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ فون کے قریب ہی ایک رف پیڈ اور پین بھی رکھا تھا۔ مراد میرے سامنے کھڑا تھا میں نے ڈرائنگ روم کے دوسرے کونے میں بچھے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تم ادھر جا کر آرام سے بیٹھ جاؤ اور ہاں اب کوئی شاطر پنا نہیں کرنا۔ اگر تم نے کسی ہوشیاری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو میں اسٹریٹ فائرنگ کرتے ہوئے تمہارے سینے کو چھلنی بنا دوں گا۔''

وہ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ صوفے پر جا بیٹھا۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ موجود تھا کہ اس دوری سے مراد اچانک مجھ پر حملہ آور نہیں ہو سکتا تھا۔ اور پھر میں نے کلاشنکوف کو دوبارہ الرٹ انداز میں تھام لیا تھا۔ اس کی مہم جوئی کی کوئی بھی کوشش اس کی زندگی کے پاس پورٹ پر جہنم کا ملٹی پل ویزا ثبت کر سکتی تھی اور یہ حقیقت اس کی سمجھ میں بھی آ گئی تھی۔

میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر اپنے گھر کے نمبرز ڈائل کیے۔

میرے حالات جو بھی تھے اور میں اپنے مشن میں کس حد تک کامیاب ہوا تھا ان باتوں کی پروا کیے بغیر اپنے گھر والوں کو خیریت کی اطلاع دینا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں کل سہ پہر میں گھر سے روانہ ہوا تھا اور اب بھی لگ بھگ سہ پہر ہونے والی تھی۔ چوبیس گھنٹے تک میری گمشدگی سے میرے گھر والوں پر خاصا گہرا اور منفی اثر پڑا ہوگا۔ خاص طور پر امی کی طرف سے مجھے

گہری تشویش تھی۔ وہ دمے کی دائمی مریضہ تھیں اور ان کی صحت بھی خاصی مخدوش تھی۔

دوسری جانب بیل جا رہی تھی مگر فون اٹینڈ نہیں ہو رہا تھا۔ اس بات پر مجھے سخت حیرت بھی ہوئی۔ شاذ یہ ادھر اُدھر ہو سکتی تھی مگر امی اپنی صحت کے پیش نظر گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی تھیں۔ اس خیال سے کہ کہیں میں نے غلط نمبرز نہ ڈائل کر دیے ہوں میں نے دوبارہ۔ بارہ اور چہار بارہ نمبر ڈائل کیے مگر ہر مرتبہ نتیجہ وہی رہا۔ دوسری جانب گھنٹی بجتی رہی مگر فون اٹینڈ نہیں ہوا بے ساختہ میرا ہاتھ جینز کی جیب کی طرف چلا۔

اگلے ہی لمحے مجھے مایوسی کا جھٹکا لگا دراصل میں نے بے اختیار اپنی جیب سے سیل فون نکالنے کی کوشش کی تھی اور یہ بھول گیا تھا کہ میرا سیل فون تو اس مشن کے ابتدائی مراحل ہی میں مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔ جب قید سے مجھے ہوش آیا تھا اور میرے جسم پر لباس تھا۔ شیروانی کے بندوں نے میری جیبوں کو مکمل طور پر خالی کر دیا تھا۔ میرے سارے کانٹیکٹ نمبرز اسی سیل فون بک میں محفوظ تھے یا گھر میں رکھے ٹیلی فون انڈیکس میں رقم تھے۔ نہایت ہی افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس وقت مجھے اپنے گھر کے نمبرز کے سوا اور کسی کے نمبرز یاد نہیں آ رہے تھے۔

جب تک سیل فون کا استعمال عام نہیں ہوا تھا بیس پچیس نمبر تو ہر انسان کو زبانی یاد ہوا کرتے تھے مگر سائنس کی اس سہولت نے انسان کو بہت نکما کر دیا ہے۔ خاص طور پر سیل فون اور کیلکولیٹر نے انسان کی یادداشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ان لمحات میں میں فرحانہ کے گھر فون کرنا چاہتا تھا خوش دلی کے گھر والوں سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ عاطف صاحب کو اور وحید صاحب کو اپنے حالات سے باخبر کرنا چاہتا تھا لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا جب میرا سیل فون میرے ہاتھ میں ہوتا۔ میں نے پیش آمدہ سچویشن کی روشنی میں سائنس کی ایجاد سیل فون پر دل ہی دل میں لعنت بھیجی ٹیلی فون کے ریسیور کو کریڈل پر پٹخا اور مراد کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تمہارا باپ تو فون اٹینڈ نہیں کر رہا پہلے تم سے نمٹ لیتا ہوں۔ اس سے بعد میں حساب کر لوں گا۔''

''پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے میز سے رف پیڈ اور قلم اٹھا لیا اور مراد کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''نمبر ایک مجھے شیروانی کا پرسنل سیل نمبر چاہیے۔ نمبر دو اس کے گھر کا ایڈریس بھی درکار ہے۔ نمبر تین جنید خان کا پتا ٹھکانا اور اس کے رابطہ نمبروں کی بھی مجھے ضرورت ہے اور یہ تمام چیزیں تم مجھے فراہم کرو گے...... کرو گے نا؟''

اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر دہشت کے سایے سے لہرائے پھر اس نے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔ کک...... کیا تم...... جنید خان کو بھی جانتے ہو؟''

''میں تمہارے ہر سرکاری اور پرائیویٹ باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''چاہے وہ شیروانی ہو جوزف ہو مرزا یاسین بیگ ہو یا پھر...... جنید خان ہو۔''

''باس کے کئی ٹھکانے ہیں مگر میں ان میں سے کسی کا ایڈریس نہیں جانتا۔'' وہ بتانے لگا۔ ''مجھے کبھی وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور باس کے موبائل فون کا نمبر بھی مجھے معلوم نہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کے اعتماد میں اضافہ کرنے کی غرض سے کہا تاکہ مطلوبہ معلومات بہ آسانی مجھ تک پہنچ جائیں۔ ''میں

www.Paksociety.com

تمہاری بات پر یقین کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤ شیروانی تم سے کیسے رابطہ کرتا ہے؟"

"باس نے کبھی ڈائریکٹ مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔" اس نے بتایا۔

"پھر اس کے احکامات تم تک کیسے پہنچتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"کل رات تک شیروانی کا یہی پروگرام تھا کہ وہ آج رات کو کسی وقت میری بے بسی کا مذاق اڑانے اور جشن منانے یہاں آئے گا لیکن آج صبح گولی کی زبانی پتا چلا کہ وہ کل کے بجائے آج ہی یہاں پہنچ رہا ہے۔ یہ اطلاع تم لوگوں تک کیسے پہنچی تھی؟"

"شہزاد کے ذریعے۔" اس نے جواب دیا۔ "شہزاد باس کا بہت خاص بندہ ہے۔ ہمارا رابطہ اسی سے رہتا ہے۔ تم نہیں جانتے شہزاد کتنا خطرناک بندہ ہے۔"

"جانتا ہوں۔" میں نے اسے مزید متاثر کرنے کی غرض سے کہا۔ "شہزاد بظاہر شیروانی کا ڈرائیور بنا نظر آتا مگر مجھے پتا ہے وہ شیروانی کا بہت ہی قابل اعتماد اور وفادار ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ شہزاد باس کا ڈرائیور ہے؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"بات بات پر حیران ہونا چھوڑ دو مراد۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں تمہارے باس اور اس کے بندوں کو بہت دور تک جانتا ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"چند گھنٹے پہلے شہزاد ہی تو سیاہ جیپ کو ڈرائیو کر کے یہاں لایا تھا۔ وہ دبلا پتلا اور ہاتھ پاؤں کا مضبوط ایک دراز قامت شخص ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "وہی شہزاد ہے۔"

"گولی نے مجھے بتایا تھا کہ آج رات شیروانی جوزف کے ساتھ ملک سے باہر جا رہا ہے۔" میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ "کہاں جا رہا ہے تمہارا باس۔"

"مجھے اس بارے میں کچھ نہیں پتا۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ باس ملک سے باہر جانے والا ہے۔ ہو سکتا ہے باس کا پروگرام تبدیل ہو جانے کی وجہ سے گولی نے ایسے ہی یہ بیرون ملک والا شوشہ چھوڑ دیا ہو۔"

"یہ شوشہ ہے یا..... شو+ شاہ میں جلد ہی اس کا پتا لگا لوں گا۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ تمہارا باس ایسا کون سا دھندا کرتا ہے غیر ملکیوں سے اس کی دوستی بڑے عروج پر ہے اگر میں غلطی پر نہیں تو جوزف کا تعلق امریکہ سے ہے۔"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جوزف امریکی ہے اور کاروباری دورے پر باس سے ملنے پاکستان آتا رہتا ہے۔"

"ہوں۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہارا باس کس قسم کا کاروبار کرتا ہے۔"

"جب تم باس اور اس کے بندوں کے بارے میں اتنی تفصیل سے جانتے ہو تو پھر تمہیں یہ بھی پتا ہونا چاہیے کہ اس کا بزنس کیا ہے۔" مراد نے مجھ پر چوٹ کی۔

"مجھے تو شیروانی کے سارے سفید اور کالے کرتوتوں کی پوری خبر ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "لیکن میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

"میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ باس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے جو پاکستان سے باہر بھی کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی کبھی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں تمہارے اس بیان پر بھی یقین کر لیتا ہوں۔" میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "اب ہم جنید خان کی طرف آتے ہیں۔ اس بندے کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟"

"جنید خان کا تعلق شوبز سے ہے۔" اس نے بتایا۔ "وہ مختلف ٹی وی چینلز کے لیے ڈرامے پروڈیوس کرتا ہے اور ڈائریکٹر کہلاتا ہے۔"

"گویا جنید خان ڈراما پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہے۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "تمہارے باس سے جنید خان کا کیا تعلق ہے؟"

"میری معلومات کے مطابق، باس کے جنید خان کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں۔" مراد نے جواب دیا۔ "باس نے اس کے ایک آدھ پراجیکٹ میں پیسے بھی لگائے ہیں۔"

"اوہ۔" میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور پوچھا۔ "یہ پروڈیوسر جنید خان کس چینل کے لیے کام کرتا ہے؟"

میں نے چند گھنٹے پہلے اسی کمرے میں شیروانی اور جنید خان کی باہمی گفتگو سنی تھی جس کے مطابق فرحانہ کو شیروانی نے جنید خان کی کسٹڈی میں دے رکھا ہے اور اسے کڑی نگرانی کی ہدایت بھی تھیں۔ اس گفتگو سے (جو یقیناً فون پر ہوئی تھی) میں نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ جنید خان کی حیثیت شیروانی کی نظر میں ایک ملازم کی سی تھی۔ شیروانی نے اسے، جنید خان کو تاکید کی تھی کہ وہ اپنے اسٹیشن پر ہی رہے جس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ بھی شیروانی کے قماش ہی کا کوئی بندہ ہے۔ لیکن مراد اس کی ذات اور حیثیت کے حوالے سے کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ بہرحال اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"وہ کسی خاص چینل کے لیے کام نہیں کرتا، جہاں سے بھی پراجیکٹ مل جائے وہ شروع ہو جاتا ہے۔ چینل ہو یا پروڈکشن ہو، وہ سب کا کام کرتا ہے۔ اس نے باس کی طرح دو تین موٹی اسامیاں گھیر رکھی ہیں۔ ان کے پیسے سے وہ پروڈکشن کرتا ہے اور شوبز کی دنیا میں ایک کامیاب پروڈیوسر کہلاتا ہے۔"

"جنید خان کا فون نمبر اور گھر کا ایڈریس مجھے نوٹ کراؤ۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ "میں بھی اس سے ایک پراجیکٹ ڈائریکٹ کراؤں گا۔"

"ان دونوں میں سے میں کسی سے واقف نہیں۔" وہ بے بسی سے گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ گلشن اقبال میں رہتا ہے۔"

"گلشن اقبال میں کہاں؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

"اگر مجھے اس کی رہائش کا ایڈریس پتا ہوتا تو ضرور بتا دیتا۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

"بس اتنا پتا ہے کہ وہ سائنس کالج کے عقب میں وہیں، کسی بنگلے میں رہتا ہے۔ ویسے وہ خاصا مشہور آدمی ہے تم کسی چینل پر جا کر بھی اس کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہو۔ ویسے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم ہاتھ دھو کر جنید خان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ تمہاری دشمنی تو باس سے ہے۔ جنید خان سے تمہارا کیا لینا دینا۔"

مراد کی باتیں ظاہر کرتی تھیں کہ اسے اس حقیقت سے آگاہی نہیں کہ اس کے باس نے فرحانہ کو جنید خان کی تحویل میں دے رکھا ہے۔ میں نے بھی اس کی

www.Paksociety.com

معلومات میں اضافہ کرنا ضرور نہیں سمجھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
"جنید خان کے فون اور پتے ٹھکانے پر لعنت بھیجو، شہزاد کا نمبر تو تمہارے پاس ضرور ہوگا۔ وہی بتادو۔"
اس کے چہرے پر تذبذب نمودار ہوا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ مراد میرے سوال کے جواب سے اچھی طرح واقف تھا مگر مجھے بتانے میں ہچکچاہٹ محسوس کررہا تھا۔ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔
"مراد! میں نے تمہیں زندہ سلامت چھوڑنے کا وعدہ اس شرط پر کیا ہے کہ تم مجھ سے کوئی غلط بیانی نہیں کرو گے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کسی گڑبڑ کے بارے میں سوچ رہے ہو۔"
"لکھو۔" وہ سپر ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں شہزاد کا سیل نمبر بتارہا ہوں۔"
"شاباش۔" میں نے سراہنے والی نظر سے اسے دیکھا۔
وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک ڈیجٹ بتاتا چلا گیا۔ میں نے شہزاد کا سیل نمبر نوٹ کرلیا پھر ٹٹولتی ہوئی نگاہ مراد کے چہرے پر ڈالی۔ وہ جلدی سے بولا۔
"اگر تم میری نیت پر شک کررہے ہو تو ابھی یہ نمبر ڈائل کرکے دیکھ لو۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا۔"
"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہاری بات کا بھروسا ہے۔"
"تمہیں اور بھی کچھ پوچھنا ہے۔" وہ سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "جانے سے پہلے یہ بتادینا کہ عمران کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے، وہ کہاں ہے۔"
"عمران بھی شہبازی کی طرح اس بنگلے کے ایک واش روم میں بند ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے اس پر جادو کرکے اسے بے ہوش کردیا ہے۔ وہ وہاں بڑے آرام سے سو رہا ہے۔"
"کون سے واش روم میں؟" اس نے میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی سوال کرڈالا۔
"جہاں تم ان کے آنے سے پہلے موجود تھے۔" میں نے بتایا۔ "عمران اور شہبازی نے تمہارے پاس آکر بتایا تھا کہ بنگلے میں کوئی موجود ہے۔ یہ شہبازی کا دعویٰ تھا اور عمران اسے شہبازی کے دماغ کا فتور سمجھ رہا تھا۔ تم انہیں اس بیڈ روم میں چھوڑ کر اس پراسرار بندے کی تلاش میں نکلے تھے بعد میں شہبازی بھی تمہارے پاس آگیا تھا۔ عمران اسی بیڈ روم کے واش روم میں سکون کی نیند سو رہا ہے۔"
"اوہ۔" مراد نے تشویش ناک نظر سے مجھے دیکھا۔
میں نے کہا۔ "اب میں یہاں سے جاؤں گا۔ تم ایک منٹ میں سوچ کر بتادو کہ جاتے جاتے تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں۔ تم جب تک کوئی فیصلہ کرو، میں ایک فون کرلوں۔"
میں اس بنگلے سے نکلنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر اپنے گھر فون کرنا چاہتا تھا۔ اس بنگلے پر اب میرا کوئی کام نہیں رہا تھا۔
مراد جو کچھ مجھے بتاچکا تھا، اس سے مزید کچھ معلوم ہونے کی توقع نہیں تھی۔ جنید خان کی رہائش کی لوکیشن کا پتا چل گیا تھا اردو سائنس کالج کے عقب کا سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ ازیں علاوہ، جیسا کہ مراد نے بتایا تھا جنید خان ایک معروف آدمی تھا اس تک رسائی حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔
میں نے اپنے گھر کا نمبر ایک بار پھر ٹرائی کرنے

کے لیے جیسے ہی ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ ایک اسپیکر والا فون تھا اور سی ایل آئی کی سہولت بھی موجود تھی۔
فون کی گھنٹی بجتے ہی مراد چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے ریسیور اٹھانے سے پہلے سی ایل آئی ڈسپلے پر نگاہ ڈالی تو وہاں ابھرنے والا نمبر مجھے دیکھا بھالا محسوس ہوا اگلے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ یہ نمبر تو میں نے ابھی کاغذ پر نوٹ کیا ہے۔ میں نے رف پیڈ پر نگاہ ڈالی اگلے ہی لمحے تصدیق ہوگئی۔
دونوں نمبرز سیم تھے گویا وہ شہزاد کی کال تھی۔ میں نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"شہزاد کا فون ہے میں اسپیکر آن کررہا ہوں۔ کال تم اٹینڈ کرو گے اور نارمل انداز میں بات کرو گے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اس بنگلے میں "سب ٹھیک" ہے اگر تم نے کسی قسم کی چالاکی یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میں تمہارے بدن میں اتنے سوراخ کروں گا کہ تمہاری لاش کو سمیٹنا مشکل ہوجائے گا۔ چلو، شاباش آگے بڑھو۔"
میں اس بنگلے سے جانے کا فیصلہ کرچکا تھا لیکن شہزاد کے فون نے میرے پاؤں میں گویا زنجیری ڈال دی تھی۔ میرے اندر ایک تجسس انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا کہ دیکھوں شہزاد نے کس لیے فون کیا ہے۔
مراد فون کے قریب پہنچا تو میں نے ریسیور اٹھا کر اسے تھما دیا اور فون کا اسپیکر آن کردیا پھر میں مراد سے محفوظ فاصلے پر جاکر کھڑا ہوگیا۔
مراد نے ریسیور کان سے لگا کر نارمل انداز میں کہا "ہیلو۔"
اسپیکر میں شہزاد کی آواز ابھری۔
"ہاں مراد سب ٹھیک ہے نا۔"
میں نے کلاشنکوف کا بیرل عین مراد کے سینے کی جانب اٹھا رکھا تھا۔ دھمکی آمیز نظر سے اسے گھور بھی رہا تھا۔ ان لمحات میں وہ جسم و جان سے میری گرفت میں تھا۔ اسے اس امر کا یقین ہوچکا تھا کہ اگر اس نے میری مرضی کے خلاف ایک سانس بھی لی تو ایک خطرناک برسٹ مار کر میں اس کے تنومند بدن کو قیمے کے ڈھیر میں بدل دوں گا۔
"جی سب ٹھیک ہے۔" مراد نے مختصر جواب دیا۔
"وہ الو کا پٹھا دوبارہ تو اس طرف نہیں آیا؟" شہزاد نے پوچھا ایک منحوس پرندے کا فرزند ارجمند وہ مجھے کہہ رہا تھا۔
مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ شہزاد کا اشارہ میری جانب تھا۔ مراد نے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔
"نہیں، اس نے ادھر آنے کی کوشش نہیں کی اور مجھے یقین ہے، وہ ایسی غلطی کرے گا بھی نہیں۔ گولی کو اس نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ وہ اس طرف آکر کسی مصیبت میں گرفتار ہونا پسند نہیں کرے گا۔"
"ہمارا بھی یہی خیال ہے مگر پھر بھی تم لوگوں کو اس کی طرف سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" شہزاد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "پتا نہیں، وہ کم بخت کہاں غائب ہوگیا ہے۔ وہ ابھی تک اپنے گھر بھی نہیں پہنچا۔"
"گھر نہیں پہنچا تو پھر کہاں چلا گیا۔" مراد نے میری طرف دیکھتے ہوئے شہزاد سے سوال کیا۔
"یہی تو پتا نہیں چل رہا۔" فون کے اسپیکر پر شہزاد کی جھنجلائی ہوئی آواز ابھری۔ "مگر جہاں بھی ہے، اسے لوٹ کر تو گھر ہی جانا ہے اور وہ جیسے ہی اپنے محلے میں پہنچے گا، دھرلیا جائے گا۔"
"کیا مطلب۔" مراد نے پوچھا۔
"باس نے دو تین مستعد بندوں کو اس کے علاقے

www.Paksociety.com

میں تعینات کردیا ہے۔" شہزاد نے بڑے فخر سے بتایا۔ "وہ جیسے ہی اپنی گلی میں داخل ہوگا' اسے چھاپ لیا جائے گا۔ باس گولی کی موت کو بھولا نہیں۔ اب کی بار جو وہ ہتھے چڑھا تو پھر موت ہی اسے باس کے چنگل سے آزاد کراسکے گی خیر۔" اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس وقت میں نے فون تمہیں ایک خاص مقصد سے کیا ہے۔ میری بات دھیان سے سنو۔ ابھی تھوڑی دیر کے بعد جنید خان پورے یونٹ کے ساتھ تمہارے بنگلے پر پہنچ رہا ہے۔ اسے ہال کے اندر دو تین سین شوٹ کرنا ہیں۔ میل اور فی میل آرٹسٹ بھی اس کے ساتھ ہوں گے۔ وہ رات گئے تک ہال میں شوٹنگ کریں گے۔ تم لوگ ان کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا۔ جنید خان کو کسی شکایت کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے آپ فکر نہ کریں۔" مراد نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "باس کو پہلے ہی ہم سے کافی شکایت پیدا ہوچکی ہے۔ ہم تلافی کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"ویری گڈ۔" شہزاد نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

"غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اس کا فوری ازالہ کردینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ ایک بات اور۔" شہزاد نے ڈرامائی توقف کیا تو مراد نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "اور کون سی بات۔"

"آدھی رات کے بعد ایک گاڑی بنگلے پر پہنچے گی۔" شہزاد نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔ "اس گاڑی کی ڈکی میں ایک لاش پہلے سے موجود ہوگی ایک لاش تم لوگ اس میں ڈالو گے گولی کی لاش۔ پھر وہ گاڑی خاموشی کے ساتھ بنگلے سے روانہ ہوجائے گی۔ ان دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگانے۔"

"گاڑی کی ڈکی میں۔" مراد نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "پہلے سے کس کی لاش رکھی ہوگی؟"

"ایک مرد کی لاش۔" شہزاد نے سفاکی سے بتایا۔

"میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاسکتا۔ ٹیک کیئر۔" شہزاد کی بات ختم ہوتے ہی ٹیلی فونک رابطہ بھی منقطع ہوگیا۔ مراد نے ریسیور کریڈل کرنے کے بعد متوحش نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں متعدد سوالات ہلکورے لے رہے تھے جن میں سے سب سے زیادہ نمایاں سوال یہ تھا۔ "کیا تم اب ہماری جان چھوڑ دو گے یا ہمارا بینڈ بجانے میں کوئی کسر باقی ہے؟"

"چلو واپس اسی صوفے پر جاکر بیٹھو جہاں پہلے بیٹھے ہوئے تھے۔" میں نے کلاشنکوف کو خطرناک انداز میں لہراتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی پھر بولا۔ "خدا کے لیے اب تم یہاں سے چلے جاؤ۔" اس کی زبان سے وہی ادا ہورہا تھا جو چند لمحے پہلے میں نے اس کی آنکھوں میں پڑھا تھا۔ "شہزاد سے ہونے والی ساری گفتگو تم نے سن لی ہے۔ جنید خان تھوڑی دیر کے بعد اپنے یونٹ کے ساتھ یہاں پہنچنے والا ہے۔ مجھے یہاں کے معاملات کو فوراً سے پیش تر سیٹ کرنا ہے تاکہ ان لوگوں کو کسی گڑبڑ کا احساس نہ ہو اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے اگر تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ پتا نہیں عمران اور شہبازی کا کیا حال ہوگا۔"

میں جس شخص تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہورہا تھا وہ اپنے پورے یونٹ کے ساتھ گھنٹے دو گھنٹے میں اس بنگلے پر پہنچنے والا تھا۔ میری فرحانہ اسی شیطان کے قبضے میں تھی۔ میں جنید خان سے ایک بھرپور ملاقات کیے بغیر اس بنگلے سے کیسے چلا جاتا۔ پھر میرے لیے

ایک چونکا دینے والی خبر یہ بھی تھی کہ کوئی گاڑی آدھی رات کے بعد کسی مرد کی لاش لے کر اس بنگلے پر پہنچنے والی تھی۔ وہ بدقسمت مرد کون تھا؟ یہ سب جاننے کے لیے اس بنگلے پر میری موجودی بہت ضروری تھی۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دس ویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ اس دوران میں مراد یک ٹک سوالیہ مگر منت ریز نظر سے مجھے دیکھے جارہا تھا۔ میں نے اسے چکر دینے کی غرض سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں اس بنگلے کو چھوڑ دیتا ہوں مگر اس کے لیے تمہیں میری ایک شرط ماننا ہوگی۔"

میں نے اپنے ذہن میں ایک فوری منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ مراد کی تسلی کے لیے میں بظاہر اس بنگلے سے چلا جاتا مگر پھر رات کی تاریکی میں مجھے وہاں آنا تھا۔ بھرپور تیاری کے ساتھ۔

"کیسی شرط۔" مراد نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا۔ اس سے پہلے کہ میں مراد کے سوال کا جواب دیتا' ایک آواز نے ہم دونوں کو چونکنے پر مجبور کردیا۔ وہ کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز تھی اور یہ آواز اسی بنگلے کے اندر سنائی دی تھی۔

میری تازہ ترین معلومات کے مطابق' اس وقت بنگلے کے کارپورچ میں گرے کلر کی ایک سوزوکی ہائی روف کھڑی تھی۔ تاہم اس کے اسٹارٹ ہونے کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ میری طرح مراد کی آنکھوں میں بھی الجھن کے آثار تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر اگلے ہی لمحے میں ڈرائنگ روم سے باہر تھا۔

صورت حال کا جائزہ لینا بہت ضروری تھا۔ میں راہداری میں تیزی سے چلتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے سے باہر نکل آیا۔ اب کارپورچ میری نگاہ میں تھا اور وہاں سے بنگلے کا گیٹ بھی بڑا واضح نظر آرہا تھا۔ میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔

گرے سوزوکی ہائی روف بنگلے کے کھلے ہوئے گیٹ میں سے طوفانی رفتار کے ساتھ نکل کر جارہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ میری نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔

مجھے اپنے عقب میں مراد کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کون تھا وہ ہماری گاڑی کیوں لے گیا؟"

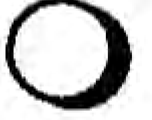
یہی سوال میرے ذہن میں بھی شور مچارہا تھا لیکن یہ سب کچھ اتنی تیزی سے پیش آیا تھا کہ ہم نہ تو ہائی روف ڈرائیو کرنے والے کی شکل دیکھ سکے تھے اور نہ ہی پشت سے دیکھ کر کوئی اندازہ قائم کرنے کی پوزیشن میں تھے کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔

بنگلے میں اس وقت صرف چار افراد تھے۔ عمران اور شہبازی کو میں نے دو مختلف واش رومز میں مقید کر رکھا تھا۔ جبکہ میں اور مراد حیران پریشان کھڑے بنگلے کے کھلے ہوئے گیٹ کو دیکھ رہے تھے۔

یہ تو ممکن نہیں تھا کہ کوئی جن گرے ہائی روف کو اڑا لے گیا ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھا ایک انسان ہی تھا۔ تو کیا...... ہم چاروں کے علاوہ کوئی پانچ واں بھی اس بنگلے میں موجود تھا۔ مگر کون۔

کون تھا وہ......؟

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)





راحت وفا

احسان ایک قرض کی مانند ہوتا ہے جو اگر ادا نہ کیا جائے تو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ایک پہاڑ کی مانند آپ کی راہ میں ضرور کھڑا ہوجاتا ہے۔ اس کے نزدیک اس قرض کی بہت اہمیت تھی اور وہ سر خرو ہونا چاہتا تھا اس دنیا میں بھی اور اگلی دنیا میں بھی اس لیے وہ طنز کے تھپیڑے بڑی استقامت کے ساتھ برداشت کررہا تھا۔

نازک جذبات واحساسات کے گرد گھومتی ایک نازک سی تحریر

رات کے نو بجے تھے......

سُرخ چمکیلے فرش کے سینے پر سفید ٹویوٹا نے قدم جمائے تو ارمغان مرزا نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور گھر کے اندرونی داخلی دروازے سے باہر نکل کر خونخوار نظروں سے گاڑی لاک کرتے ارسلان مرزا اور اُس کے ساتھ کھڑی اپنی بیٹی ریشم مرزا کو دیکھا اور گرجدار آواز میں پوچھا۔

"رات کے نو بج رہے ہیں' کہاں سے آرہے ہو؟"

"وہ بابا! میری......"

"تم زبان بند رکھو' مجھے اس آوارہ گرد سے پوچھنے دو۔"

"چچا جان! میں آفس سے نکل رہا تھا ریشم نے فون کیا کہ مجھے میری سہیلی عترت کے گھر سے پک کرلو۔"

"اور تم خدمت گار بن کر میری بیٹی کو لینے پہنچ گئے۔" ارمغان مرزا کے لہجے میں بجلیاں کڑک رہی تھیں...... ارسلان کے چہرے کا رنگ متغیر ہونا شروع ہوگیا۔ ریشم بی بی بے چارگی کے عالم میں ہونٹ چبا رہی تھی......

"بابا! ارسلان سے تو میں نے ریکویسٹ کی تھی۔"

"کیونکہ ڈرائیور چھٹی پر چلا گیا تھا یا اور ملازمین مر گئے تھے' تمہاری تو خیریت میں اندر چل کر دریافت کرتا ہوں، چلو اندر......" ریشم نہ چاہتے ہوئے بھی اندر کی طرف چلی گئی اب صرف ارسلان کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

جانے تم کس مٹی سے بنے ہو ایک بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔" انہوں نے بالکل قریب ہو کر دانت کچکچائے۔ ارسلان چند قدم پیچھے ہوگیا اس ڈر سے کہ کہیں چچا ارمغان مرزا سچ مچ کچا نہ چبا ڈالیں۔

"چچا جان! میرا قصور کیا ہے؟"

"خبردار جو مجھے چچا جان کہا' تم ہمارے بڑے بھائی کی کم فہمی سے تو رشتہ بنا سکتے ہو ہم سے نہیں۔"

"جانے آپ کس جرم کی سزا دے رہے ہیں؟"

وہ دھیرے سے بولا۔

"تمہیں جرم بھی معلوم ہے اور سزا بھی۔ بس آئندہ میں تمہیں ریشم کے ساتھ نہ دیکھوں۔"

"جبکہ آپ جانتے ہیں کہ ریشم اور میں ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں۔"

"اگر بھائی جان اور بھابی جان کا خیال نہ ہوتا تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔"

"چچا جان! آپ اب مجھے نکلوا دیں' میں پلٹ کر کبھی نہیں آؤں گا۔" وہ اپنے مزاج کے مطابق سر سے پاؤں تک کڑوا ہوگیا۔ اس بات کو محسوس کرکے ارمغان مرزا نے آخری جملہ کہا اور بھاری قدموں سے اندر چلے گئے۔

"تم رہو یا جاؤ مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا' ریشم کا نام

بھی تمہاری زبان سے نہیں سننا چاہتا۔"

وہ کچھ دیر کھڑا آسمان کی وسعتوں میں گھورتا رہا...... اس وقت آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے' چاند مسکرا رہا تھا...... وہ بھی دکھ سے مسکرایا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ حالانکہ آفس جاتے ہوئے اور آتے ہی وہ پہلے ہال کمرے میں بابا جان کو مل کر انہیں مکمل تفصیل سے آگاہ کرتا تھا۔ بی بی جان بھی زیادہ تر اصفہان مرزا کے پاس ہال کمرے میں ہی ہوتی تھیں' یا یوں کہہ لیجیے کہ ہال کمرہ ہر طرح کی میٹنگ کا مرکز تھا...... مگر اس وقت میدان جنگ کا منظر پیش کررہا تھا۔ ارمغان مرزا باہر سے پھنکارتے ہوئے سیدھے وہیں آئے تھے اور اپنی بیوی رابعہ پر برس رہے تھے۔

"میرے کہنے میں کمی ہے یا تمہارے سننے میں کسر ہے رابعہ بیگم۔"

"کیا ہوگیا ہے ایسا۔" سب کی موجودگی میں اس طرح مخاطب کرنے پر رابعہ نے سبکی محسوس کی۔

"بلاؤ اپنی لاڈلی کو اور پوچھو تم سے ایک بیٹی کی تربیت نہیں ہوسکتی تو اپنے گھر چلی جاؤ......"

"ارے ہائے ہائے! کیسی خرافات بک رہے ہو ارمغان' کیا قیامت آگئی' بی بی جان کا نرم و نازک حساس سا دل کانپ اٹھا۔ دیورانی کی حمایت میں دیور کو للکارا۔

"میں ٹھیک کہہ رہوں اب اگر ریشم ارسلان کے ساتھ کہیں گئی تو رابعہ بیگم کو اپنے گھر جانا ہوگا۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولے۔

"ارمغان! ہوش میں تو ہو۔" اصفہان مرزا نے مداخلت کی...... تو وہ سنجیدگی سے بولے۔

"بھائی جان! مجھے ریشم کے ساتھ ارسلان کا بات کرنا بھی گوارہ نہیں۔"

"ارسلان ہمارا بیٹا ہے' کچھ خیال کرکے بات کرو۔"

"بیٹا ہے نہیں آپ سمجھتے ہیں' مجھے آپ کے سمجھنے پر کوئی اعتراض نہیں' بس آپ اسے سمجھا دیں کہ ریشم سے دور رہے۔" وہ نظریں چراتے ہوئے کہہ گئے۔ بی بی جان کی جان پر بن آئی انہیں اگر ارسلان پیارا تھا تو ریشم بھی جان تھی' ماں سے زیادہ وہ ان کے پاس ہی رہتی تھی وہ تو حواس باختہ ہوگئیں۔

"یہ سمجھنے کی خوب کہی تم نے وہ ہمارا بیٹا ہے' ریشم ہماری بیٹی ہے وہ دونوں' ہمیں پیارے ہیں نئی بات کیا ہے اس میں۔" بی بی جان کی آواز میں حیرت کے ساتھ غصہ محسوس ہورہا تھا جسے ارمغان کے ساتھ ساتھ رابعہ نے بھی محسوس کیا۔

"بھائی جان! ارسلان کی حقیقت آپ تسلیم کریں یا نہ کریں مگر ہماری بیٹی کا معاملہ ہے' جب تک ارسلان امریکہ رہا گھر میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہوئی اب جبکہ وہ تعلیم مکمل کرکے مستقل آگیا ہے تو ہمیں فکر ہوئی ہے۔" رابعہ نے اپنے مخصوص دھیمے سے لہجے میں اپنا خیال پیش کردیا...... اصفہان بھونچکا سے رہ گئے۔

"ارسلان تعلیم مکمل کرکے اپنے گھر میں آیا ہے' ریشم کے لیے غیر اور اجنبی کب سے بنا دیا تم دونوں نے، ہم ان کی شادی کا سوچ رہے ہیں اور تم......"

"پلیز بھائی جان! آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی ارسلان کو تسلیم نہیں کیا ولدیت کے خانے میں اپنا نام لکھ دینے سے آپ اس گمنام کے والد نہیں بن سکتے۔ جانے کس کا خون ہے؟ آپ نے اپنا وارث بنا لیا۔" ارمغان نے زہر افشانی کی۔

ارمغان! اتنے سفاک نہ بنو بچے معصوم ہوتے ہیں' جس ماحول میں رہیں ویسے ہوجاتے ہیں' ہم نے ارسلان کو حقیقی بیٹا سمجھ کر اپنے سینے سے لگایا تھا وہ ہمارے سونے آنگن کی بہار بن کر آیا تھا' ہمارے جگر

کا ٹکڑا ہے۔'' اصفہان مرزا نے کہا تو ارمغان نے طنزیہ ہنس کر دیکھا اور کہا۔

''ٹھیک ہے آپ کا ظرف وسیع ہے جس کا چاہیں اپنی وراثت میں نام لکھیں پر یاد رکھیں ریشم کے لیے جیسا آپ چاہتے ہیں وہ کبھی نہیں ہوگا۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ بی بی جان نے باقاعدہ رونا شروع کردیا۔

''طاہرہ! ذہن پر بوجھ نہ ڈالو ارمغان جذباتی ہے وقت آنے پر سمجھ جائے گا۔''

''معاف کرنا بھائی جان! ریشم ہماری اکلوتی اولاد ہے اسے کسی ایسے نوجوان سے ہم نہیں بیاہ سکتے جس کے باپ دادا کے نام نسب کا ہمیں پتہ نہیں۔'' رابعہ نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

''رابعہ! اتنی کٹھور نہ بنو ریشم اور ارسلان ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔'' بی بی جان نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

''آپ ارسلان کو سمجھائیں' ہم ریشم کو سمجھا لیں گے۔'' رابعہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ اصفہان مرزا اور بی بی جان دونوں گہری سوچ میں غرق ہوگئے۔

بی بی جان کا دل بیٹے کے لیے مٹھی میں آ گیا......

دروازہ کھلا تھا' کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ بیڈ پر بیٹھا وہ سامنے رکھے ٹی وی کو ریموٹ سے کبھی آف کر رہا تھا اور کبھی ٹی وی آن ہونے پر جو روشنی پیدا ہو رہی تھی اس میں اس کے چہرے پر پھیلا کرب واضح دکھائی دے رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اجنبی سا احساس تھا...... اُن کا دل دکھی ہوگیا لاڈلے بیٹے کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی یہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں اس کو اس وقت سنبھالنا بڑا کٹھن کام تھا پھر بھی انہوں نے ہمت کرکے کمرے کی لائٹ آن کی تو اپنی بھی آنکھیں ذرا دیر کو چندھیا گئیں۔ وہ بھی ریموٹ رکھ کے آنکھیں ملنے لگا۔

''میرے گھر کی روشنی اندھیرے میں کیوں ہے؟'' وہ محبت سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں تو وہ ٹال گیا۔

''آپ ابھی تک سوئی نہیں۔''

''میرے بیٹے نے کھانا نہیں کھایا' اپنے بابا جان اور بی بی جان کو شب بخیر نہیں کہا' میں کیسے سو جاتی؟''

''بی بی جان! آپ کو نہیں لگتا کہ آپ خود فریبی میں مبتلا ہیں۔''

''کیسی خود فریبی؟''

''یہی کہ آپ کا کوئی بیٹا نہیں۔''

''اللہ نہ کرے' میرا بیٹا تو میرے پاس ہے کیسی دل دہلانے والی بات کردی تم نے۔'' وہ کانپ اٹھیں۔

''بی بی جان! خدارا آپ حقیقت کی دنیا میں آئیں' میں جانے کس راہ چل کر آپ تک پہنچا ہوں' چچا جان سچ کہتے ہیں کہ میں گمنام ہوں' میری پیشانی پر گھر سے بھاگنے والے بچے کا لیبل لگا ہے' آپ میرے محسن ہیں پر میں آپ کا بیٹا نہیں۔''

''ارسلان! کیا کبھی ہماری محبت میں کوئی کمی محسوس کی تم نے' کسی دوسرے کے کہنے سے اتنا بدل گئے ہو۔''

''وہ دوسرے نہیں ہیں بابا جان کے سگے بھائی ہیں' ریشم کے بابا ہیں۔''

''وہ جو بھی ہیں' ہمارے بیٹے تو تم ہو' جب ہم نے ستائیس سال کسی کی پروا نہیں کی تو تم کیوں سوچتے ہو؟'' ان کی آواز میں سنجیدگی آ گئی۔

''بی بی جان! بابا جان اور آپ چچا جان سے بہت محبت کرتی ہیں میری وجہ سے گھر میں بدمزگی ہو یہ میں نہیں چاہتا' چچا جان نے آج جو کیا وہ ناقابل برداشت ہے۔''

''مجھے اندازہ ہے' مگر بیٹا اس میں ریشم کا کیا قصور؟ وہ تو تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے' ارمغان بھی دھیرے دھیرے مان جائے گا۔''

''نہیں بی بی جان! چچا جان کی آنکھوں میں میرے لیے شدید نفرت رہی ہے۔ میں ان کی مرضی کے خلاف ریشم سے نہیں بات کروں گا۔''

''اچھا دیکھیں گے فی الحال چلو اٹھو چل کر کھانا کھاؤ' ہم بوڑھے لوگوں سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔''

......☆☆☆......

''یہ بات ریشم بٹیا کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ بی بی جان اونکا بھی تم ہی سمجھاؤ ہماری اور رابعہ بی بی کی تو ایک نہیں مانت...... رو رو کے اپن موٹی موٹی آنکھیں کرت ہے۔'' بُوا نے اسی لمحے کمرے میں داخل ہو کر اونچی آواز میں شور مچا دیا۔ بی بی جان نے مسکرا کر گردن ہلائی۔

''لو! دیکھ لو وہ دیوانی کیا کر رہی ہے تمہاری خاطر۔''

''سمجھا دیں اسے کہ لاوارث ان جان شخص کے لیے کچھ نہ کرے' سوسائٹی ایسے افراد کو جینے کا بھی حق نہیں دیتی' وہ......''

''اچھا! بس کرو ایسا کچھ نہیں سوچتے سب ٹھیک ہو جائے گا' اصفہان مرزا کے بیٹے کو کسی چیز کی کمی نہیں۔'' بی بی جان نے کہا تو بوا نے فوراً تائید کی۔

''ارے اور نہیں تو کیا ارسلان باوا! یوں ہمت نہیں ہارت سب اچھا ہوئیں گا۔''

''اب اٹھو کھانے کے کمرے میں اپنے بابا کو لے کر پہنچو میں ریشم کو لے کر آتی ہوں۔'' بی بی جان یہ کہہ کر کمرے سے چلی گئیں۔ ان کے ساتھ ہی بوا بھی نکل گئیں۔ وہ بادل نخواستہ اٹھا اور ہاتھ منہ دھونے کی غرض سے واش روم میں گھس گیا۔

ناشتے کی میز پر غیر معمولی خاموشی تھی۔ سب چپ چاپ ناشتہ کرنے کی بھرپور اداکاری کر رہے تھے۔ رات کی بات کے اثرات بڑے واضح تھے۔ ایسے میں ارسلان چائے کا کپ رکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اصفہان مرزا نے بارعب آواز میں اُسے مخاطب کیا۔

''ارسلان! ریشم کو یونیورسٹی چھوڑتے ہوئے جاؤ۔''

''بھائی جان! ریشم ارسلان کے ساتھ نہیں جائے گی۔'' ارمغان نے سختی سے کہا۔

''ایسا پہلی بار ہو رہا ہے اور نہ آخری بار' ریشم ارسلان کے ساتھ جائے گی یہ میرا حکم ہے۔'' اصفہان مرزا نے ان سے بھی زیادہ سختی سے کہا۔

''بھائی جان! آپ بلاوجہ ضد کر رہے ہیں۔''

''اور تم بلاوجہ اختلاف کر رہے ہو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم نے تمہیں کتنے لاڈ پیار سے پالا ہے' بے اولاد ہو کر بھی تمہیں اپنی اولاد سمجھا' اللہ نے ارسلان دیا تب بھی تمہاری محبت میں کمی نہیں آنے دی۔ آج تمہیں ہمارے بیٹے سے اختلاف ہو رہا ہے۔'' اصفہان مرزا حد درجہ دکھی ہوگئے۔

''ارسلان اور ریشم تم دونوں جاؤ۔'' بی بی جان نے انہیں جانے کو کہا تو رابعہ اور ارمغان جز بز سے ہو کر چپ رہے۔

''میرے ارسلان میں کیا خرابی ہے؟ ہماری ہر چیز کا مالک ہے۔''

''بس ایک ہی خرابی ہے کہ وہ گھر سے بھاگا ہوا بچہ ہے جس کے باپ دادا سے آپ ناواقف ہیں' ایسے بچے کو میں اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے پسند نہیں کر سکتا۔'' ارمغان مرزا نے کہا تو بی بی جان بولیں۔

''ارمغان! گھر سے بھاگنے والے بچوں کی بھی کوئی مجبوری ہوتی ہے' جن گھروں میں بچوں پر بے جا تشدد ہوتا ہے' جبراً مشقت لی جاتی ہے وہاں بچے اس راستے کا انتخاب کرتے ہیں' بہت سے برے ہاتھوں کا شکار ہو جاتے ہیں' اکا دکا ہوتے ہیں جنہیں کوئی اولاد بنا تا ہے' خود سوچو! اگر معصوم بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا

www.Paksociety.com

جائے تو ان کا مستقبل کیا ہو؟ ان کی منزل کیا ہو؟"

"ایسے بچوں کے لیے یتیم خانے اور چھتیس سو فلاحی ادارے کام کر رہے ہیں' ضروری نہیں کہ گھروں کو یتیم خانے بنایا جائے...... پھر اولاد بنانا تو سراسر حماقت ہے۔" ارمغان مرزا کی سوچ میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ آئی۔

"بچے معصوم ہوتے ہیں' اپنے ہوں یا پرائے' اگر اللہ نے اس نعمت سے محروم رکھا ہو تو انہیں کلیجے سے لگانا چاہیے۔ ہمارے ہاں یہی تو سفاکی ہے کہ ایک طرف معاشرے میں ظالم جابر باپ ہیں جو بچوں پر تشدد کرتے ہیں دوسری طرف ظالم افراد پر مشتمل معاشرہ ہے جو ایسے بچوں کو ذلیل و خوار ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہے' ان معصوم بچوں کو تحفظ دیں' اپنائیں تو مجرم بننے کا عمل رک سکتا ہے۔" اصفہان مرزا نے سمجھانا چاہا تو وہ رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"آپ جو چاہیں سوچیں بات اپنے اپنے خیال کی ہے' پھر بات ہوگی' آفس سے دیر ہو رہی ہے۔" وہ یہ کہہ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اصفہان مرزا بھی چلے گئے' تب بی بی جان نے رابعہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

رابعہ! گھر میں اس طرح کے خیالات کے بعد ارسلان متنفر ہو کر کہیں چلا نہ جائے' اس لیے اس خیال کو بدلو' پلیز ارمغان کو سمجھاؤ ہم بے اولاد ہیں ارسلان ہماری زندگی ہے وہ کہیں چلا گیا تو ہم جیتے جی مرجائیں گے۔"

"آپ لوگ بھی پھر اس بات کا خیال رکھیں کہ ریشم اور ارسلان کا رشتہ نہیں ہو سکتا۔"

"ریشم کی ماں ہو کر بھی کیسی بات کرتی ہو؟ کبھی بیٹی کی آنکھوں میں اترتے جگنو دیکھے ہیں اس کے لبوں پر کھلے گلاب دیکھے ہیں...... یہ محبت کے جگنو اور گلاب ہیں' ریشم کے جذبات کا خیال کرو۔"

"بی بی جان! مجھے تو ریشم کا خیال ہے لیکن کیا آپ ارمغان کو نہیں جانتیں؟" رابعہ بے بسی سے بولی۔

"تم سمجھانے کی کوشش تو کرو'

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی۔" رابعہ نے کسی حد تک یقین دلایا مگر دوسری طرف ارسلان گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ریشم کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے یہ باتیں مت سمجھاؤ' تمہارے بدلے میں کچھ بھی منظور نہیں۔" وہ رقت آمیز لہجے میں چلا پڑی۔

"ریشم! میرا خواب حقیقت نہیں بن سکتا۔ تم اپنے بابا کے مزاج سے واقف ہو' میرا جرم وہ معاف نہیں کر سکتے' پھر کیوں زندگی مشکل بنا رہی ہو' مجھے بھول جاؤ......" یونیورسٹی کی کار پارکنگ میں گاڑی روکتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا تو وہ رو دی۔

"قسم کھا کر کہو کہ یہ تم دل سے کہہ رہے ہو' مجھے بھول سکتے ہو بولو۔"

"یہ تو سراسر میرا ذاتی مسئلہ ہے۔" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

"میں اور میری محبت تمہارا مسئلہ نہیں بتاؤ۔"

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی احمقانہ باتیں کر رہی ہو' یقین کر لو کہ ہم مل نہیں سکتے۔" اس نے دانستہ لہجے میں سختی پیدا کی تاکہ ریشم دور ہو سکے...... مگر وہ تو ہچکیوں سے رونے لگی ارسلان بوکھلا گیا۔ دائیں بائیں رکنے والی گاڑیوں سے اترنے والی لڑکیاں اور لڑکے ذومعنی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

"اوا چھا بابا! اس وقت تو چپ ہو جاؤ اور اب اترو تمہارا لیسن شروع ہو گیا ہوگا۔" اس نے نرمی سے کہا۔

"آئندہ کبھی ایسا مت سوچنا' میں تمہارے سوا کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" وہ آنکھیں صاف

کر کے گاڑی کا دروازہ کھول کے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ارسلان نے ایک سرد لمبی آہ بھری اور واپسی کے لیے گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ اسے کیسے سمجھاتا کہ اس کی کوئی منزل نہیں' کوئی پہچان نہیں وہ ان جانے راستوں کا مسافر ہے......

ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔

گھر کے سب افراد اپنی اپنی ذات کے خانوں میں بند اندر ہی اندر جنگ لڑ رہے تھے۔ ایسے میں بوا تن تنہا سب کی الجھن پر پریشان تھیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس کو سمجھائیں کوئی بھی تو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا...... اصفہان مرزا اور بی بی جان کو زیادہ فکر اپنے بیٹے کی تھی۔ وہ کسی قیمت پر ارسلان کی دل شکنی نہیں چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ اگر ارمغان ریشم کا رشتہ نہیں دینا چاہتا تو نہ دے ارسلان کو کسی نہ کسی طرح سمجھا لیں گے۔ یہ سوچ کر وہ کسی حد تک مطمئن تھے مگر دوسری طرف رابعہ کو ریشم کی فکر تھی ارمغان تو اس فکر سے بھی آزاد تھے جبکہ رابعہ ادھیڑ بن میں گرفتار تھی۔ ارمغان کتاب سے نظریں ہٹا کر بیوی کو دیکھ چکے تھے۔ جب کافی وقت گزر گیا تو کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں......"

"کچھ تو ہے' جس کی پردہ داری ہے۔" وہ شرارتی انداز میں بولے۔

"آپ اتنے ان جان بھی نہیں ہیں' گھر میں پھیلی خاموشی سے آپ واقف نہیں ہیں کیا؟"

"وہ بھائی جان اور بی بی جان کی ضد ہے۔" وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

"آپ ریشم کی بھی تو فکر کریں' ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔" رابعہ اٹھ کر ان کے سامنے آ بیٹھی۔

"کیوں کیا ہوا ریشم کو؟"

"جو ابھی نہیں ہوا وہ آپ کی بے جا ضد کی وجہ سے ہو جائے گا۔"

"ایک اجنبی لاوارث نوجوان کو داماد بنا لوں یہ چاہتی ہو۔" وہ بھڑک اٹھے۔

"ارسلان ہمارے گھر میں ہماری نظروں کے سامنے پلا بڑھا ہے اس میں کوئی کمی نہیں سوائے اس کے کہ اس نے باپ کے تشدد مار پیٹ سے تنگ آ کر گھر چھوڑا...... خود سوچئے ایک بچہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔"

"معاشرے میں ایسے بچوں کی یا افراد کی عزت نہیں ہوتی' میں لوگوں کو کیا جواب دوں گا کہ میری بیٹی کے لیے اعلیٰ خاندانی رشتوں کی کمی تھی اس لیے میں نے لاوارث بچے کا انتخاب کیا۔"

"ارمغان! تم جو چاہو فیصلہ کرو مگر ہمارے بیٹے کو آئندہ لاوارث مت کہنا۔ بی بی جان اچانک کمرے میں آئیں اور سخت غصیلے انداز میں کہہ کر نکل گئیں۔

"ارمغان! بھائی جان اگر اسے اپنا وارث بنا چکے ہیں تو آپ بھائی جان کے حوالے سے اسے تسلیم کریں گے۔ کیا لوگ نہیں جانتے کہ ارسلان بھائی جان کا اکلوتا بیٹا ہے۔"

"مگر حقیقت تو یہ نہیں ہے۔"

"بہر کیف! میری ریشم کی خوشی میری خوشی ہے۔ مجھے بی بی جان اور بھائی جان کا دل بھی دکھانا اچھا نہیں لگ رہا۔"

"اس معاملے میں خاموشی اختیار کرو' میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے' تم صرف ریشم کو لگام دو۔ میں نے اپنے دوست انیس احمد کو اس کے بیٹے توصیف کے لیے رضامندی دے دی ہے' ایک دو روز میں وہ لوگ آئیں گے۔" ارمغان مرزا نے حتمی فیصلہ سنایا

اور موبائل فون اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ رابعہ افسردہ سی بیٹھی رہ گئیں۔

اس وقت وہ فائلوں کے ڈھیر میں محو تھا۔

ریشم نے کمرے میں داخل ہو کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور سہمی ہوئی سی اس کے سامنے آ گئی۔

اس نے اداس چہرے کو غور سے دیکھا پھر بند دروازے کو دیکھا۔ ''جب خوف دروازے بند کرنے پر مجبور کر دے تو ارادہ بدل لینا چاہیے۔''

''مجھے تمہارا ساتھ دینے کا یقین آ جائے تو میں ہر خوف سے ٹکرا سکتی ہوں۔''

''میں ساتھ دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'' اس نے نظریں جھکائے جھکائے جواب دیا۔

''میری طرف دیکھ کر بات کرو' کیا محبت بزدل بناتی ہے؟''

''بات گھر کی ہے' اپنے بزرگوں کے سامنے بہادری نہیں دکھا سکتا۔''

''بات غلط ہو تو بہادری دکھانی پڑتی ہے۔''

''نہیں! اس گھر کے بہت احسانات ہیں مجھ پر' اس گھر کی آن پر میں اپنی جان قربان کر سکتا ہوں، محبت بھلا کیا معنی رکھتی ہے۔''

''ارسلان! بابا میرا رشتہ کہیں طے کر رہے ہیں اور تم......'' وہ دبے دبے لہجے میں چلائی۔

''اچھی بات ہے' میں خوش ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔'' وہ سسکیاں لینے لگی۔

''ایسا ہی ہوگا۔'' وہ دھیرے سے بولا تو وہ پھٹ پڑی۔

''تمہیں کیا حق تھا میرے ساتھ کھیل کود کے جوان ہونے کا' میرے دکھ درد میں شریک ہونے کا' مجھ سے گھنٹوں میٹھی میٹھی باتیں کرنے کا...... کیوں کرتے تھے ہزار ہا فون امریکہ سے؟''

''ریشم! چھوٹی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟ میں کچھ بھی نہیں ہوں تمہارے بابا کی نظر میں۔ وہ مجھے اس گھر میں دیکھنا پسند نہیں کرتے' کیا قدموں میں گر کے بھیک مانگوں' بولو کیا محبت میں خیرات لی جاتی ہے۔ اپنی انا اور خودداری اگر مٹی میں ملا بھی دوں تب بھی اپنا حسب نسب میں انہیں نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ میں اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ میرا نشئی باپ پیسوں کے لیے مجھے روئی کی طرح دھنکتا تھا۔ ورکشاپ میں استاد میرے ہاتھ جلاتا تھا...... میری بیمار ستم رسیدہ ماں میرے حصے کی مار بھی اپنی کمر پر سہتی تھی...... اس کی کمر کی ہڈیاں رات بھر درد سے پکارتی تھیں' میں اگر اور کچھ دن رہتا تو وہ مر جاتی' میرے بعد شاید ابا اسے نہ مارتا ہو...... یہ سب میرا ماضی ہیں۔ دھندلی پرچھائیاں ہیں اور مجھے کچھ معلوم نہیں۔

''میرا کیا قصور ہے؟ تم پھر اس گھر میں کیوں آئے؟ کیوں آئے؟''

''ہاں! یہ بہت بڑا گناہ ہے' مگر اب کیا کروں ایک طرف میں ہوں اور دوسری طرف بابا جان اور بی جان......'' وہ سرد لمبی سانس بھر کے بولا۔

''اور میں' میں کہیں بھی نہیں۔''

''کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو؟''

''پلیز! تم بابا سے بات کرو۔''

''یہ نہیں ہو سکتا' جس نفرت کا وہ اظہار کر چکے ہیں اس کے بعد لاحاصل ہے ہر بات' ویسے بھی مجھے اپنے سے زیادہ اپنے والدین کی عزت عزیز ہے' اب تم جاؤ ورنہ اور فساد ہوگا۔''

''تم بدل گئے ہو بالکل وہ نہیں رہے۔'' وہ روتے ہوئے کہہ کر کمرے سے بھاگ گئی اور وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر خود سے گویا باتیں کرنے لگا۔ ''تمہیں کیسے دلاؤں کہ میں وہی ہوں' تمہاری چاہت میں ہر پور ڈوبا' تمہاری محبت میں گرفتار ایسا بے بس ہوں کہ تم سے دور ہونے کے تصور سے کانپتا ہوں۔ پر کیا کروں پیاری! یہ دنیا ہے' محبت کی ازلی دشمن' تمہیں اس دنیا کے فیصلے کے سامنے سر جھکانا ہے۔ میں تم سے خود سے شرمندہ ہوں کاش! میں اس طرح ٹھکرایا نہ جاتا۔''

وہ اور جانے کتنی دیر اسی کیفیت میں کھویا رہتا کہ موبائل فون کی بیل نے اسے چونکا دیا۔

ارسلان نے صبح جلدی جانا اور رات دیر سے گھر آنا معمول بنا لیا۔ یہ بات خاص کر بی جان اور بابا جان نے محسوس کی۔ چند ہی روز میں وہ کمزور کمزور بجھا بجھا دکھائی دینے لگا تھا بہت زیادہ باتونی تو وہ پہلے بھی نہیں تھا۔ بس خوش مزاج اور بے تکلف سا انسان تھا اس کی ذہانت گفتگو سے صاف نمایاں ہوتی تھی مگر اب تو یہ حالت ہو چکی تھی کہ بات کرنے پر بھی صرف ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا...... اصفہان مرزا اور بی جان اپنے کمرے میں سر جوڑے اس سے متعلق ہی بات چیت کر رہے تھے کہ وہ آ نکلا...... خلاف توقع آج وہ ذرا جلدی آ گیا تھا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! میرا بیٹا آ گیا......'' اصفہان مرزا نے پرتپاک لہجہ اختیار کیا۔

''جی بابا جان!''

''اور دن بھر کیا مصروفیت رہی؟''

''معمول کی مصروفیت تھی اور کچھ خاص نہیں۔''

''چلو مصروفیت نکال لیتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ بیٹا جی! کراچی آفس بھی جا کر دیکھو' ملازمین لاکھ قابل اعتبار سہی ہم سے بہتر خیال نہیں رکھ سکتے...... اس لیے ہفتے دو ہفتے کراچی لگا آؤ......'' وہ دانستہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

''اور یہاں......''

''یہاں میں جایا کروں گا' یہاں تو ارمغان بھی ہے۔''

''جیسے آپ چاہیں۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

''جیتے رہو' اور بیٹا ذہن پر کسی قسم کا بوجھ نہ ڈالو' تمہیں پریشان دیکھ کر تمہارے بوڑھے ماں باپ درد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔''

''اللہ نہ کرے کہ آپ تک کوئی دکھ درد آئے۔'' وہ ان کا نحیف سا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولا تو سچ مچ اصفہان مرزا کو جیسے کسی نے گلوکوز کی بوتل لگا دی۔ بی جان مسکرا کر اٹھیں۔

''میں کھانا لگواتی ہوں آپ دونوں باپ بیٹا آ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے آج کافی دنوں بعد بہت شدید بھوک کا احساس جاگا ہے۔'' اصفہان مرزا بولے...... تو ارسلان دھیرے سے مسکرا دیا...... اس کی مسکراہٹ میں چھپی تکلیف اصفہان مرزا نہ دیکھ سکے یا شاید دیکھ کر برداشت کر گئے۔

''بابا جان! آپ میرے لیے فکر مند نہ ہوں۔''

''میں فکر مند نہیں رنجیدہ ہوں' ارمغان کے رویے پر دکھی ہوں' تمہیں بچپن سے دیکھتا آیا ہے پھر بھی بیٹی کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہے مجھے تو ریشم کا بہت دکھ ہے چھوٹا سا منہ نکل آیا ہے' اس کا ہنسنا مسکرانا بھول گئی ہے۔ رات دن اپنے کمرے میں بند روتی رہتی ہے' مگر ارمغان کا دل نہیں پسیجتا۔'' وہ افسردگی سے بولے۔

''آپ چھوڑیں اس ذکر کو' ریشم کو چچا جان کی بات مان لینی چاہیے۔ مجھے اگر آپ کا خیال نہ ہو تو میں چچا جان کے ایک بار کہنے پر یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جاتا۔''

www.paksociety.com

''خبردار! جو اس طرح کی بات سوچی۔ ارمغان کے لیے زیادہ مسئلہ ریشم کا ہے۔ جہاں چاہے بیاہے تمہارے لیے رشتوں کی کمی نہیں' ہمارے گھر کا چراغ تم ہو' اولاد صرف وہی نہیں ہوتی جو حقیقی ہو بلکہ اولاد وہ بھی ہوتی ہے جسے اولاد سمجھ کر پالا جائے...... تم بھی اگر ایسا سوچنے لگے ہو تو اپنا خیال بدل لو۔'' وہ رعب دار انداز میں بولے۔ ارسلان نے چپ سادھ لی......

یوں چند دن مزید خاموشی میں گزر گئے آخر وہ دن آ گیا جب ارمغان مرزا کے دوست انیس احمد اپنی فیملی کے ساتھ آئے اور ایک نظر میں ریشم کو پسند کر کے انگوٹھی پہنا گئے...... گھر میں خوب گہما گہمی کا سماں رہا۔ مٹھائی کے ٹوکرے ٹی وی لاؤنج میں دیکھ کر ارسلان جان گیا کہ اصل بات کیا ہے؟ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں گیا کیونکہ اس کی نو بجے کراچی کی فلائٹ تھی ضروری پیکنگ بی بی جان نے کرادی تھی صرف چند ضروری فائلیں لینی تھیں وہ انہیں ہی بریف کیس میں رکھ رہا تھا کہ بی بی جان ہانپتی کانپتی روتی پیٹتی آ گئیں......

''ارسلان! ارسلان! وہ وہ ریشم نے دروازہ بند کرلیا ہے' رو رہی ہے وہ کچھ کر نہ لے چل کے دروازہ کھلواؤ۔''

''بی بی جان! میں دروازہ کھلواؤں' کس تعلق سے؟ وہ بولا۔

''بیٹا! اس وقت یہ بات بھول جاؤ' چلو چل کر اسے سمجھاؤ۔''

''نہیں بی بی جان! میں اسے کوئی خوش فہمی نہیں دینا چاہتا' اسے سمجھوتہ کرنا چاہیے۔ آپ جا کر سمجھائیں' مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ عجلت میں بریف کیس اٹھا کر نکل گیا اور بی بی جان گھبرا کر پھر ریشم کے کمرے کی طرف آ گئیں۔

''ریشم! ریشم! میری بچی دروازہ کھولو......'' رابعہ رونے لگی۔

''ریشم! ریشم بیٹا! بی بی جان کے کہنے پر دروازہ کھول دو۔''

''ارے ریشم بیٹا! ہم مر جائیں گے دروازہ کھولو ہمارا دل بیٹھتا ہے۔'' بوا نے گریہ کیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اسی وقت اصفہان مرزا آ گئے۔

''ریشم! کن سفاک لوگوں کے سامنے تم احتجاج کر رہی ہو' یہ تمہیں مار سکتے ہیں لیکن تمہاری خوشی کا خیال نہیں رکھ سکتے۔''

''نہیں بھائی جان! ایسا نہ کہیں' میں اپنی بچی کی خوشی چاہتی ہوں' ارمغان ہی سفاک اور ظالم ہیں۔'' رابعہ فوراً وضاحت کرنے لگی۔

''خیر! ہماری بیٹی اپنے تایا جان کی عزت رکھے گی' دروازہ کھولے گی اور والدین کے فیصلے پر رضامند ہو جائے گی۔ اصفہان مرزا کی بات سچ ثابت ہوئی ریشم نے دروازہ کھول دیا۔

دو ہفتے پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ ارسلان کے واپس آنے کا دن آ گیا مگر وہ نہیں آیا سب متفکر تھے خاص کر اصفہان مرزا اور بی بی جان یا پھر ریشم کی اداس نظریں گیٹ پر لگی تھیں' کان آہٹ پر لگے تھے کسی اور کی انگوٹھی پہننے کے بعد بھی وہ اس کی منتظر کیوں تھی؟ وہ جو اجنبی بن کر چلا گیا پلٹ کر خبر تک نہیں لی تھی وہ آخر اس کے لیے بے قرار کیوں تھی؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی...... انگلی میں پڑی انگوٹھی سے کھیلتے ہوئے وہ مسلسل ارسلان کے لیے ہی سوچ رہی تھی کہ ارمغان مرزا کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی وہ سخت اشتعال انگیز تیور لیے اندر آئے۔ ریشم جلدی سے راستے سے ہٹ کر ہال کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہاں اصفہان مرزا' بی بی جان اور رابعہ پہلے سے موجود تھے۔ ریشم گھبرائی گھبرائی سی اندر داخل ہوئی تو اصفہان مرزا نے بانہیں پھیلا دیں۔

''ارے میرا بچہ آیا ہے اس قدر گھبرایا ہوا کیوں ہے؟'' وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔ کچھ نہ کہہ سکی کہ ارمغان مرزا ہاتھ میں اخبار لیے وہیں آ گئے۔ ان کی آنکھیں جھکی تھیں' چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

''بھائی جان! ارسلان کہاں ہے؟''

''کراچی' پر خیریت' کیا بات ہے؟'' اصفہان مرزا بوکھلا گئے۔

''اسے تو آنا تھا۔''

''ہاں! پر بات کیا ہے؟''

''میں اس کے لیے بے قرار ہوں' اسے بلائیے بھائی جان!'' ارمغان مرزا گلوگیر لہجے میں کہہ کر بھائی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

''ارمغان! کیا بات ہے......؟'' اب بی بی جان کے پریشان ہونے کی باری تھی۔

''میں آپ دونوں کا' ارسلان کا گنہگار ہوں' مجھے معاف کردیں۔''

''کیا بات ہو گئی......؟'' رابعہ بھی بول ہی پڑی۔

''انیس احمد اور توصیف احمد دس کروڑ کا فراڈ کر کے ملک سے فرار ہو گئے ہیں۔''

''ہائے میرے اللہ!'' بے اختیار ہی رابعہ کے منہ سے نکلا۔

''حسب نسب اعلیٰ خاندان والے ہیں' تمہیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟'' اصفہان مرزا نے طنز کیا۔

''بی بی جان! میں غلطی پر تھا' میری ریشم تباہ ہونے سے بچ گئی۔''

''چلو اللہ کا شکر ادا کرو۔'' بی بی جان نے کہا۔

''ہاں! ارمغان بعد میں حقیقت کھلتی تو ہم کیا کر لیتے؟''

''بھائی جان! ارسلان کو بلائیے میں اس سے شرمسار ہوں۔''

''ارمغان! سب کچھ ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم چاہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ارسلان اب وہ چاہے جو تم چاہتے ہو۔'' کچھ سنجیدگی سے کہا۔

''میرا ارسلان پاؤں کی جوتی نہیں جسے جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ انیس احمد کی حقیقت جانتے ہی تمہیں ارسلان یاد آ گیا۔ یاد کرو کیسے کیسے تضحیک کی ہے تم نے۔ اس کا دل دکھایا۔ ہمیں رنجیدہ کیا۔''

''آپ کی سب باتیں بجا مگر آپ اعلیٰ ظرف ہیں مجھے معاف کردیں۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''ارسلان کی مرضی کے بنا میں فیصلہ نہیں کرسکتا' میں تو آج ویسے بھی اس کی طرف سے پریشان ہوں جانے کیوں نہیں آیا؟''

''انشاء اللہ آ جائے گا آپ فکر نہ کریں......'' بی بی جان نے سمجھایا۔ عین اسی وقت گیٹ پر رکشہ رکا کچھ ہی دیر میں وہ سب حیرت سے پھٹی نگاہوں سے ارسلان کو دیکھ رہے تھے جس کی ٹانگوں سے لپٹا گورا چٹا بھوری بھوری آنکھوں والا بچہ سہمی سہمی نگاہوں سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ تقریباً چھ سالہ بچے کی معصوم صورت پر سب ہی کو پیار آ رہا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ سب الجھن کا شکار تھے کہ یہ بچہ کون ہے؟''

''بابا جان! یہ اسفند ہے جو میری طرح گھر کا راستہ بھول چکا ہے۔ اسے بھٹکنے سے بچانے کے لیے میں پولیس اسٹیشن سے لے آیا ہوں' آپ نے مجھے منزل دی اور میں اسفند کو منزل کا راستہ دکھاؤں گا۔''

''شاباش! مجھے تم پر فخر ہے۔'' اصفہان مرزا کی بوڑھی نگاہوں میں فخریہ آنسو جگمگانے لگے۔ انہوں نے بازو پھیلا کر اسفند کو بانہوں میں بھر لیا۔

❁

www.paksociety.com

www.paksociety.com

کانچ کے رشتے

اسماء قادری

اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کے اپنے قوانین اور حدود ہوتی ہیں۔ جو بھی ان قوانین اور حدود کو پھلانگتا ہے اسے اس کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ اس نے بھی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی کی تھی اور اب پچھتاوے کی آگ میں پل پل سلگ رہا تھا۔

کانچ کے ان رشتوں کا احوال جو ٹوٹنے کے بعد کبھی نہیں جڑتے

"مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمت میں فرق نہ آنے دیں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں۔ سوائے اس کے جو ظاہر ہے اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہیں اور اپنی آرائش کو کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں سوائے اپنے خاوندوں کے یا اپنے والد کے یا اپنے خسر کے یا اپنے لڑکوں کے یا خاوند کے لڑکوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنے میل جول کی عورتوں کے یا غلاموں کے یا ایسے نوکر چاکر مردوں کے جو شہوت والے نہ ہوں یا ایسے بچوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے مطلع نہیں اور اس طرح زور زور سے پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی پوشیدہ زینت معلوم ہو جائے۔ اے مسلمانو! تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم نجات پاؤ۔"
(سورۃ النور آیت 31)

جوں جوں الفاظ اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ آنسو قطار در قطار اس کے صبیح رخساروں پر بہہ رہے تھے ایک پچھتاوا اور احساس ندامت تھا جس نے اس کی ذات کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

"اے میرے رب! یہ میں نے کیا کیا؟ میں کیوں غفلت کی زندگی گزارتی رہی۔ تو نے تو سب کچھ بہت واضح لفظوں میں اپنی اس مقدس کتاب میں لکھ دیا تھا پر میں ہی نادان تھی جو تیرے احکامات سے غافل رہی کیا کروں؟ کس سے کہوں؟ دل ہے کہ جیسے کسی گہری کھائی میں گرا جا رہا تھا۔ ہر سو گھپ اندھیرا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ ایسے میں کروں تو کیا کروں؟ گناہوں کی دلدل میں ڈوبے شخص کے پاس ایسا کو راستہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے نجات حاصل کر سکے اس نے بہت مضطرب ہو کر اپنے رب کو پکارا تھا۔

"اے مسلمانو! تم سب کے سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم نجات پاؤ۔" جواباً بہت قریب سے صدا سنائی دی تھی۔ یہ لفظ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کے ایک دھارے کی صورت اس کے دل تک پہنچے تھے اور ڈوبتے دل کو ڈھارس دی تھی۔

"ہاں! ابھی توبہ کا در کھلا ہے۔ ابھی بہت دیر نہیں ہوئی۔ ابھی نجات ہو سکتی ہے۔" اس خیال کے آتے ہی وہ سجدے میں گر گئی اور گڑگڑا کر اللہ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنے لگی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ شدت گریہ سے اس کا پورا وجود ہچکولے کھا رہا تھا۔

......☆☆☆......

"آہ! یہ میں نے کیا کیا! میں کس طرح اپنے مقام سے اتنا گر گیا؟ میں بصیر رضا جسے اپنے کردار کی پختگی پر بے پناہ بھروسہ تھا۔ کیسا کچا ثابت ہوا۔ اتنی بلندی سے گرا ہوں کہ لگتا ہے پوری ہستی کانچ کے ٹکڑوں کی طرح بکھر کر رہ گئی ہو۔ میں جو خود اپنے آپ سے نظر ملانے ... رہا کسی اور کے سامنے کس طرح سینہ تان ... ہو سکوں گا۔ اور وہ، جس کے دل میں نگاہوں ... ے لیے صرف پیار ہی پیار تھا۔ عزت ہی ... ی اس کی نفرت بھری نگاہوں کا سامنا کس طرح ... گا' اس کا دل جو کسی آبگینے کی طرح تھا۔ اس ... ے ٹکڑوں کو کس طرح سمیٹ سکوں گا؟ وہ تو مریم ... مقدس، پاکیزہ اور معصوم، اور میں ...... میں بصیر ... کے لیے کیا ثابت ہوا؟" "شیطان!" صرف اور ... شیطان جس کے نزدیک کسی بھی شے اور رشتے ... اپنے نفس کی خاطر پامال کر ڈالنا کوئی معنی نہیں ... وہ نازک سی گڑیا جو انگلی کٹ جانے پر بھی چیخ چیخ ... اٹھتی تھی۔ اتنا بڑا زخم کیسے سہہ سکی ہوگی؟ ایسی چوٹ ... بھی پتھر کو لگے تو وہ بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ ... مجھ سے بھی نازک لڑکی نے کیسے اس چوٹ کو ... ہا ہوگا؟ میں جو کبھی اس کے ہر درد کی دوا ہوا کرتا تھا۔ ... چاہوں بھی تو اس کا یہ درد نہیں بانٹ سکتا۔ وہ جس ... سب کچھ نثار کر دینے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتا ... اب چاہوں کہ اپنے جسم کا ایک ایک ریشہ جدا ... کر کے بھی اس کے ہونٹوں پر پہلی سی معصوم ہنسی لوٹا ... دوں تو نہیں لوٹا سکتا۔" بے بسی کی انتہا پر کھڑا بصیر رضا ... اپنے ہی ضمیر کی عدالت میں مجرموں کی طرح ... سر جھکائے موجود تھا۔

......☆☆☆......

"لو بیٹا! منہ میٹھا کرو۔" دس سالہ بصیر ابھی اسکول سے گھر پہنچا ہی تھا کہ اماں نے ایک بڑا سا گلاب جامن اس کے منہ میں ڈال دیا۔ خوشی ان کے چہرے سے روشنی کی کرنوں کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ بصیر حیرت سے ماں کا چہرہ تکنے لگا۔ اتنا خوش تو اس نے ماں کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ تو عموماً بڑی چپ چپ رہا کرتی تھیں۔ ہاں بصیر کے رزلٹ والے دن خوشی کی ایک ہلکی سی کرن ضرور ان کے چہرے پر چمکتی تھی لیکن آج تو عالم ہی کچھ اور تھا۔ خوشی کا اتنا بے ساختہ اظہار کرتا ان کا چہرہ بصیر کو حیرت سے گنگ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اماں جو اپنی خوشی میں مگن تھیں اس کا حیرت زدہ چہرہ دیکھ کر ایک دم ہی ہنسنے لگیں پھر بولیں۔

"بیٹا! تم یونیفارم بدل کر منہ ہاتھ دھولو میں تمہارے لیے کھانا نکالتی ہوں پھر ہم اسپتال چلیں گے۔ وہاں اللہ نے تمہارے لیے ایک ننھی بہن بھیجی ہے۔" لیکن وہ اب بھی چپ چاپ کھڑا تھا۔ اچانک کسی ننھی بہن کی آمد کی اطلاع اس کے لیے بہت زیادہ حیرت انگیز تھی۔ تب ہی اماں نے اس کی حیرت دور کرتے ہوئے بتایا کہ "اللہ نے تمہارے ناصر ماموں کو بیٹی کی دولت سے نوازا ہے۔ بڑے برسوں میں ہزاروں دعاؤں کے بعد یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اللہ میرے بھائی کی اس خوشی کو سلامت رکھے اور بچی کی خوشیاں دیکھنا نصیب فرمائے (آمین)۔" وہ ساتھ ہی ساتھ بھائی کے لیے دعائیں بھی کرتی جا رہی تھیں اور کیوں نہ کرتیں آخر یہی بھائی تو تھا جس نے اس کڑے وقت میں جب ان کے شوہر رضا احمد ایک کار ایکسیڈنٹ میں دنیا سے منہ موڑ گئے تھے اور سسرالی عزیزوں نے عدت کی مدت پوری ہوتے ہی سب کچھ چھین کر اپنے گھر سے نکال دیا تھا اسی بھائی نے انہیں سہارا دیا تھا۔ بصیر اس وقت صرف دو سال کا تھا۔ بھری جوانی میں بیوگی اور سسرال سے ٹھکرائے جانے کا دکھ دل میں سمیٹے رخشندہ کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر وہ تن تنہا اس معصوم جان کی پرورش کس طرح کریں گی۔ کسی قسم کا زیور یا روپیہ پیسہ ان کے پاس نہ تھا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھیں اور میکے کی دہلیز پر لوٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس بری گھڑی میں ان کے بھائی ناصر حسین نے انہیں تھاما اور امان دی۔ ماں باپ تو ان کے عرصہ ہوا فوت ہو چکے تھے۔ کوئی اور بہن بھائی بھی نہ تھا۔ لے دے کر ان سے عمر میں سات سال بڑے ناصر حسین ہی تھے جن کی شادی ان سے

پانچ سال پہلے ہی ہو چکی تھی لیکن خدا کی نہ جانے کیا مصلحت تھی کہ وہ ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ جوان بیوہ بہن کا غم ناصر حسین کو خون کے آنسو رلاتا تھا۔ ادھر ان کی بیگم نور جہاں تھیں جنہیں نند کا یوں اپنے گھر آ کر رہنا ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ انہیں یہ خدشہ تھا کہ رخشندہ جو اپنے بھائی کی بہت چہیتی ہے۔ ان کی راج دھانی پر اپنا قبضہ جمالے گی۔ وہ گھر جس کی وہ بلا شرکت غیرے مالک ہیں اس پر ان کے سوا بھی کوئی اور راج کرنے لگے گا۔ دراصل اولاد سے محرومی نے انہیں عدم تحفظ کا شکار کر دیا تھا اور ناصر حسین کی تمام تر توجہ اور محبت کے باوجود ہر دن ان کا یہ خدشہ بڑھتا جا رہا تھا کہ ناصر اب ان سے پہلی سی محبت نہیں کرتے۔

ناصر حسین نے جب یہ حالات دیکھے تو پڑوس کا گھر جو ان دنوں برائے فروخت تھا بصیر کے نام سے خرید کر رخشندہ کو اس میں شفٹ کر دیا۔ گو کہ پیسے کے اس زیاں پر ان کی بیگم نے بڑا شور مچایا تھا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر ان کی زبان بند کر دی کہ "یہ مکان میں نے اپنے پیسے سے نہیں بلکہ ابا میاں کی چھوڑی ہوئی رقم سے خریدا ہے جس پر رخشندہ کا بھی پورا پورا حق ہے۔"

وقت دھیرے دھیرے ہی سہی آگے بڑھا تھا۔ ناصر حسین اولاد کی کمی کو بصیر کے وجود سے پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اکثر اس کے لیے کتابیں کپڑے اور کھلونے وغیرہ لاتے رہتے تھے جو ان کی بیگم کو ناگوار گزرتا اور وہ میاں کو تو کچھ نہیں نند کو ہی باتوں باتوں میں طنزیہ انداز میں کچوکے لگاتی رہتیں۔ رخشندہ بھی کوئی ناسمجھ نہیں تھیں۔ سب کچھ سمجھتی تھیں اور چاہتی تھیں کہ کوئی ملازمت کر کے اپنا بوجھ خود اٹھالیں اور بھائی کو ان سب نوازشات سے روک دیں لیکن ہر بار ہی بھائی کی پرخلوص محبت کے آگے ہار جاتی تھیں۔

آج اسی پیارے اور مہربان کو اللہ نے اولاد کی نعمت سے نوازا تھا تو ان کا پورا وجود اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز تھا۔ اتنے برسوں کے بعد جب ایک طرح سے سب مایوس ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ناصر حسین کے آنگن میں خوشی اتاری تھی۔ خوشی کے مارے رخشندہ بیگم قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

رخشندہ ایک ہاتھ میں ٹفن اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے بصیر کی انگلی تھامے اسپتال کے پرائیویٹ روم میں داخل ہوئیں۔ ٹفن میز پر رکھا۔ کاٹ میں لیٹی بھتیجی کو جھک کر پیار کیا اور پھر بھاوج کی خیر خیریت پوچھتے ہوئے ان کے لیے پیالے میں سوپ نکالنے لگیں۔ بصیر ابھی تک دور ہی کھڑا تھا۔ تب ہی ماموں جان کی نظر اس پر پڑی۔

"ارے بصیر بیٹا! آؤ اپنی بہن کو دیکھو۔ بتاؤ کیسی ہے؟" ماموں جان کے کہنے پر وہ جھجکتا ہوا بے بی کاٹ تک آیا تھا۔

"ارے! یہ تو کوئی پری ہے۔ گلابی گلابی ہتھیلیوں سرخ و سفید رنگت اور عنابی ہونٹوں والی۔" اسی پل بچی نے آنکھیں کھولیں۔ "اُف! اس کی آنکھیں کتنی سیاہ ہیں اور بال...... یہ کتنے نرم ملائم اور چمکیلے ہیں۔" بے اختیار ہی اس کا دل چاہا کہ وہ اسے ڈھیر سارا پیار کرے۔ ننھی پری اسے بہت زیادہ اپنی اپنی سی محسوس ہوئی تھی اور یہ سارے لوگ بھی تو اسے اس کی بہن کہہ رہے تھے۔

"ہاں، سچ مچ یہ میری بہن ہے۔ اب میں اس کے ساتھ کھیلا کروں گا۔ اسے بہت ساری اچھی اچھی چیزیں لا کر دوں گا۔ خوب سیر کراؤں گا۔" وہ دل ہی دل میں پلاننگ کر رہا تھا۔

"بصیر بیٹا! بتاؤ تمہاری بہن کا کیا نام رکھیں۔" ماموں جان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"مریم" بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ سب لوگوں کو اس کا تجویز کردہ نام پسند آیا۔ یہاں تک کہ ممانی جان، جن کی تیوریوں پر ہر وقت بل پڑے رہتے تھے۔ وہ بھی بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ خوشی تھی ہی اتنی بڑی کہ ان کی ساری بداخلاقی اور لہجہ کی بیزاری اڑن چھو ہو گئی تھی۔ اس پر رخشندہ کی دن رات کی خدمت نے بھی ان کے مزاج پر خوشگوار اثرات مرتب کیے تھے۔

ممانی جان گھر آ چکی تھیں۔ بصیر جو پہلے ان کے ڈر سے ماموں کے گھر کم کم ہی جاتا تھا۔ مریم سے ملنے اسے دیکھنے اور پیار کرنے کی خاطر اسکول سے آتے ہی ماموں کے گھر کی طرف دوڑتا۔ کبھی وہ مریم کے ننھے منے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتا۔ کبھی اس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کرتا۔ اکثر اسے ممانی سے ڈانٹ بھی پڑ جاتی لیکن مریم کے وجود میں اس کے لیے جانے کیسی کشش تھی کہ وہ ہر کڑوی بات ہنس کر سہہ جاتا۔ دوسری طرف مریم کا حال بھی مختلف نہ تھا۔ جتنا بصیر اس سے پیار کرتا وہ اس سے کہیں بڑھ کر اس کی عاشق تھی۔ اسے دیکھ کر مریم کی کالی کالی چمکیلی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ جاتی تھی۔ مریم کے بیٹھنا سیکھنے سے اس کا پہلا قدم اٹھانے اور پھر دوڑنے تک کے ہر مرحلے میں بصیر اس کا محافظ بنا اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ مریم نے جب پہلا قدم اٹھایا تو گرنے کے ڈر سے جن ہاتھوں نے تھاما وہ بصیر کے تھے۔ بچے عموماً پہلا لفظ "ماں" ادا کرتے ہیں۔ لیکن مریم نے پہلا لفظ بائی (بھائی) پکارا تھا۔ بصیر اس لمحے بہت خوش ہوا تھا اور بار بار اس سے یہ لفظ بلواتا تھا اور وہ بھی اپنی توتلی زبان سے "بائی بائی" (بھائی بھائی) کی گردان کیے جاتی۔ دونوں گھروں کے بیچ وہ دروازہ جو ناصر حسین نے بہن کی سہولت کے لیے بنوایا تھا لیکن نور جہاں بیگم کی تند مزاجی کی بناء پر اکثر بند ہی رہتا تھا۔ مریم اور بصیر کی معصوم محبت کے آگے زیادہ عرصہ بند نہ رہ سکا کیونکہ مریم وقت بے وقت بصیر سے ملنے اس کے گھر کی طرف دوڑتی تھی۔ یوں اس کی سہولت کی خاطر وہ دروازہ کھل گیا۔

مریم نہ صرف بصیر بلکہ اپنے امی، ابو اور پھوپو کی بھی آنکھ کا تارا تھی۔ ناصر حسین گو بہت زیادہ امیر آدمی نہ تھے۔ لیکن انہوں نے بھانجے اور بیٹی کی ہر خواہش کو ہر ممکن حد تک پوری کرنے کی کوشش کی۔ بصیر خود کو ملنے والا جیب خرچ اپنے آپ پر خرچ کرنے کے بجائے مریم کی چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کو پورا کرنے میں لگا دیتا۔ یہی چاہتیں تھیں جنہوں نے مریم کو کبھی کسی بری گھڑی سے آشنا نہ ہونے دیا۔ وہ چاہتوں کے ہنڈولے میں جھولتی بڑی ہو گئی۔ گزرتے وقت نے اس کے حصے میں آنے والے لاڈ پیار میں کوئی کمی نہیں آنے دی بلکہ ایک طرح سے پیار کا یہ ساگر اس کے لیے وسیع ہی ہوتا گیا۔ گو اس لاڈ پیار نے اسے بگاڑا نہیں لیکن اس کے مزاج میں سنجیدگی نہ آ سکی۔ وہ بہت لاپروا تھی اور اپنی ذات کو سنبھال سنبھال کر رکھنے کا جو گر لڑکیوں کے اندر ہوتا ہے وہ اس میں پیدا نہ ہو سکا۔ جب دیکھو بصیر کے کاندھوں سے جھول رہی ہوتی۔ کبھی رات گئے آئسکریم کی فرمائش کر ڈالتی۔ کبھی بے وقت ہی اسے گھومنا یاد آ جاتا۔ بصیر بھی اس کا ایسا والہ و شیدائی تھا کہ کبھی اس کی کسی فرمائش کو رد نہیں کیا۔ بڑے ان دونوں کو سمجھاتے رہ جاتے۔ پر وہ اپنے من کی ہی کرتے۔

جن دنوں مریم نے انٹر کیا ان ہی دنوں بصیر جس نے حال ہی میں ایم بی اے (MBA) کیا تھا اور ایک فرم میں بہت اچھی جاب کر رہا تھا کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ مریم اس وقت تک ایک بڑی خوب صورت نوخیز دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی۔ لیکن اپنی اس خوب صورتی اور بانکپن سے بالکل ہی لاپروا تھی اور عمر کی اس اسٹیج پر جب لڑکیاں نئے نئے سپنے بننا شروع کر دیتی ہیں بالکل بچوں ہی کی طرح کھلنڈری اور لاابالی تھی۔ بصیر سے اس کا عشق اول روز جیسا ہی تھا۔ رخشندہ جب اپنی اس معصوم اور پریوں کا سا روپ رکھنے والی بھتیجی کو دیکھتیں، بے اختیار ان کا دل اسے اپنے بصیر کی دلہن بنانے کے لیے مچل جاتا لیکن بھاوج کے مزاج، دونوں کی عمروں کے درمیان موجود فرق اور سب سے بڑھ کر ایک دوسرے کے لیے سگے بہن بھائیوں جیسی محبت کو دیکھتے انہوں نے اپنی زبان کو بند رکھا۔ اور اپنے دور

www.Paksociety.com

پڑے کے رشتے داروں میں سے صبا کو بصیر کے لیے منتخب کرلیا۔

بصیر نے اپنے سسرال والوں کو بھی مریم کی حیثیت سے آگاہ کردیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اسے میری سگی بہن جیسا ہی پروٹوکول دیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے ہر ہر موقع پر اسے خصوصی توجہ دی۔ دولہا والوں کے لیے پہناؤنیاں آئیں تو اس میں مریم کا جوڑا سب سے خوب صورت اور قیمتی تھا۔ خود بصیر نے اسے ہر تقریب کے لیے اپنی جیب سے کپڑے، جیولری اور دیگر میچنگ کی چیزیں دلائی تھیں۔ اس موقع پر مریم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ان دنوں اس کی مصروفیات اپنے عروج پر تھیں۔ کبھی بصیر کے کمرے کی سیٹنگ کروا رہی ہے تو کبھی دلہن کے کپڑے خریدنے بازار جارہی ہے۔ کبھی بری کے جوڑوں کی پیکنگ کررہی ہے تو کبھی بصیر کو چھیڑنے کے لیے چپکے چپکے اسے بیوٹی ٹپس بتارہی ہے۔ اس کی ان حرکتوں پر بصیر چڑتا تو خوب ہنستی اور کہتی۔

"کیا کروں، میں تو اس لیے ایسا کہہ رہی ہوں کہ صبا بھابی بہت خوب صورت ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ شادی والے دن میرے پیارے راج دلارے بھائی ان سے بڑھ کر حسین لگیں۔" بصیر اس کی اس معصوم خواہش پر بھی ہنس کر رہ جاتا۔ مریم نے شادی سے مہینہ بھر پہلے ہی سے اپنی دوستوں کے ساتھ مل کر پھوپو کے گھر میں ہلا گلا کررکھا تھا۔ وہ اور اس کی سہیلیاں رات گئے تک ڈھول پیٹتیں اور گانے گاتی تھیں۔ اور کون تھا جو انہیں روکتا۔ گھر کی پہلی خوشی تھی اور اس خوشی میں بھی مریم کی خوشی کا بھرپور خیال رکھا جارہا تھا۔

دلہن رخصت ہوکر گھر آئی تو راستہ رکائی کی رسم میں بھی نیگ کے نام پر بصیر نے اسے خوب تنگ کرنے کے بعد اپنا پورا والٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس پل دلہن بنی صبا کو بصیر کی زندگی میں مریم کی اہمیت کا اندازہ خوب اچھی طرح ہوگیا تھا۔ وہی عورت کا ازلی جلاپا اس کے دل میں سر اٹھا رہا تھا۔ پھر بصیر نے بھی اپنی زبان سے اس کے سامنے مریم سے اپنی محبت کو بڑے واضح الفاظ میں بیان کرڈالا اور کہہ دیا کہ...... "دیکھو صبا! مریم میری زندگی ہے۔ تم ہم دونوں بہن بھائی کے درمیان آنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ اس ایک بات سے ہٹ کر میں تمہارا پورا خیال رکھوں گا۔ اور تمہیں زندگی کی ہر آسائش مہیا کرنے کی کوشش کروں گا۔"

یوں اول شب ہی مریم کے خلاف ایک گرہ صبا کے دل میں پڑ گئی تھی۔

مریم کے لاڈ پیار بصیر کی شادی کے بعد بھی جاری تھے۔ اب وہ بی۔ اے کی طالبہ تھی لیکن بصیر کے ساتھ بالکل ننھی بچیوں والا ہی برتاؤ کرتی۔ صبا اسے دیکھ دیکھ کر کڑھتی۔ وہ جو سمجھتی تھی کہ بصیر اکلوتا ہے اور بصیر کے گھر میں اس کی محبتوں کو شیئر کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔ اس صورت حال پر دل ہی دل میں بہت برہم ہوئی لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی کیونکہ اس نے بصیر کے مزاج اور اس کی مریم سے دیوانگی کی حد کو چھوتی محبت کو بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ایسے کسی دیوانے سے ٹکرانا اپنے آپ کو نقصان پہنچانے کا باعث بن سکتا تھا۔

دوسری طرف مریم تھی جو اب بھی وقت بے وقت بصیر کے پاس گھسی رہتی۔ کبھی کہتی بھائی بازار جانا ہے، کبھی کسی سہیلی کے گھر اور بصیر اس کی فرمائش پر یہ بھی بھول جاتا کہ ابھی کچھ دیر قبل صبا نے اس سے اپنی امی کے گھر چلنے کو کہا تھا یا اسے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے جانا ہے۔ مریم معصوم تھی اور لاپروا بھی۔ وہ اس بات کو سمجھتی ہی نہیں تھی کہ اس کا یہ حد سے بڑھا ہوا لاڈ پیار صبا کے دل میں اس کے لیے نفرت کا الاؤ بھڑکا رہا ہے۔ وہ تو خود صبا سے بھی بہت پیار کرتی تھی کہ وہ اس کے پیارے بھائی کی بیوی تھی۔ اس کے دل میں دور دور تک بھی یہ خیال نہ تھا کہ وہ اپنی بھائی کے حقوق غصب کررہی ہے۔ البتہ رخشندہ اس بات کو محسوس کرتی

تھیں مگر لاڈلی بھتیجی کو کچھ نہ کہہ پاتیں۔ کبھی کبھی بصیر کو سمجھانے کی کوشش کرتیں لیکن وہ فوراً ہی بھڑک اٹھتا کہ شادی ہوجانے کا یہ مطلب نہیں کہ میں بیوی کا غلام بن جاؤں اور مریم کو بھلا بیٹھوں۔ مریم سے میری یہ چاہت اور محبت کوئی آج کی بات تو نہیں ہے۔ وہ تو اپنی پیدائش کے دن سے مجھے بہت عزیز ہے۔ میں صبا کو تو چھوڑ سکتا ہوں۔ مریم کو نہیں۔ اس کے یہ الفاظ صبا نے بھی سنے تھے اور اس کے دل میں مریم سے نفرت کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔

بصیر کے گھر بیٹا پیدا ہوا تھا اور مریم نے بصیر کی خواہش پر اس کے لیے ابتہاج نام تجویز کیا تھا۔ اس وقت صبا دل میں کڑھ کر رہ گئی کیونکہ وہ اپنے بیٹے کا نام اپنی مرضی سے رکھنا چاہتی تھی لیکن اب اس خواہش کے اظہار کا کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مریم کا رکھا نام ہرگز بدلا نہ جائے گا۔ سو اس نے چپ سادھ لی۔ اتنی بڑی خوشی کے موقع پر اس کی یہ خاموشی سب کو بہت عجیب لگی تھی۔ خود مریم نے بھی اس سے سبب پوچھا تھا۔ لیکن اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے ٹال دیا۔ اسے مریم جو اس وقت اس کی خدمت میں پیش پیش تھی اور ابتہاج کو بار بار پیار کررہی تھی۔ زہر لگ رہی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے ناصر حسین اور نور جہاں بیگم بھی بچے کو دیکھ کر گئے تھے۔ ان کے روانہ ہوتے وقت بصیر نے مریم سے کہا بھی کہ "تم تھک گئی ہوگی گھر چلی جاؤ۔" لیکن وہ نہ مانی اور کہنے لگی۔ "بھائی! بھابی پہلے ہی اتنی ویک ہورہی ہیں اکیلی منے کو سنبھال نہ پائیں گی اور ویسے بھی میں اپنے شہزادے کو لیے بغیر گھر نہیں جاؤں گی۔ میرا دل اسے اپنی نظروں سے ایک پل بھی جدا کرنے کے لیے راضی نہیں۔" اور یہ حقیقت تھی بس یہی کہ وہ ابتہاج کو اپنی نظروں سے اوجھل کرنے کو بالکل تیار نہ تھی۔ ورنہ خدمت کے لیے رخشندہ پھوپو موجود ہی تھیں۔ مریم جیسی ناتجربہ کار لڑکی بھلا ایسے وقت میں کیا کرسکتی تھی۔

گھر آکر بھی مریم کا وہی حال تھا۔ وہ پروانہ وار ابتہاج کے اردگرد گھومتی رہتی اسے دیکھ کر بصیر کو اپنا بچپن یاد آتا۔ وہ خود بھی تو مریم کا ایسا ہی دیوانہ تھا۔ بلکہ اب بھی جبکہ مریم جوان ہوچکی تھی اور وہ بھی شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ تھا' اس کے دل میں مریم کے لیے محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ آج بھی اس کا دل یہی چاہتا تھا کہ صبح آنکھ کھولے تو سب سے پہلے مریم کو دیکھے اور رات آنکھیں بند کرنے تک وہ اس کے آس پاس موجود ہو۔

"تم آدمی نہیں پتھر ہو بصیر رضا! تنگ آگئی ہوں میں تم سے۔ تھکا ڈالا ہے مجھے تمہارے ساتھ نے۔ آخر تم کب تک یوں میرے ضبط کو آزماتے رہوگے۔ تمہیں بیوی کی ضرورت ہی نہ تھی تو کیوں کی تھی مجھ سے شادی۔ اپنی ساری عمر اپنی اس لاڈلی کے لاڈ اٹھاتے۔ تمہاری نظروں میں بیوی کی کوئی اہمیت ہے اور نہ بیٹے کی۔ بس تمہارے لیے جو کچھ ہے مریم ہے۔ مریم' مریم' مریم...... کان پک گئے ہیں میرے اس نام کی گردان سنتے سنتے۔" آج صبا سارا ضبط بھول چکی تھی اور اپنی چپ کا روزہ توڑ کر بے تحاشہ چیخ رہی تھی۔ آج حد بھی تو ہوگئی تھی۔ صبح سے ابتہاج کو بخار تھا۔ اس نے بصیر کو فون کرکے آفس سے گھر بلایا کہ ابتہاج کو ڈاکٹر کے ہاں لے کر جانا ہے۔ بصیر ابھی گھر میں داخل ہی ہوا تھا کہ فون کی بیل بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا تو دوسری طرف مریم تھی۔ وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔ بصیر کی آواز سنتے ہی کہنے لگی۔

"تھینک گاڈ بھائی! آپ گھر پر ہیں۔ میری کالج وین خراب ہوگئی ہے۔ میں پی سی او سے فون کررہی ہوں۔ پلیز! آپ مجھے لینے آجائیں آپ کو پتہ ہے کہ میں پبلک بس سے بالکل بھی نہیں آسکتی۔" اتنا کہتے کہتے اس کی آواز روہانسی ہونے لگی اور بصیر سب کچھ

www.Paksociety.com

بھول گیا۔ یہاں تک کہ اپنا بیمار بیٹا بھی۔

"تم میرا انتظار کرو گڑیا! میں ابھی پانچ منٹ میں تمہیں لینے پہنچ رہا ہوں۔" مریم کو تسلی دے کر اس نے فوراً ہی بائیک کی چابی اٹھائی اور صبا سے جو کہ ابتہاج کو گود میں لیے چادر اوڑھے تیار کھڑی تھی صرف یہ کہہ کر کہ "میں مریم کو لینے کالج جا رہا ہوں۔" باہر نکل گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر یہ دیکھنے کی زحمت بھی نہ کی تھی کہ صبا کا اس پل غصے سے کیا حال ہو رہا ہے۔

جب وہ مریم کو کالج سے لے کر گھر پہنچا تو صبا گھر پر موجود نہیں تھی وہ اکیلی ہی بچے کو لے کر ڈاکٹر کے کلینک جا چکی تھی۔ بصیر کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا لیکن پھر الٹا اسے صبا پر غصہ آنے لگا کہ وہ تھوڑی دیر انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ ظاہر ہے میں مریم کو وہاں کالج کے گیٹ پر کھڑا رہنے کا مشورہ دے نہیں سکتا تھا۔ مریم تو سیدھی اپنے گھر جا چکی تھی جبکہ وہ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا صبا کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ صبا ابتہاج کو کون سے ڈاکٹر کے کلینک لے گئی ہوگی ورنہ خود بھی پیچھے پہنچ جاتا۔ صبا تقریباً پون گھنٹے بعد واپس لوٹی اور بصیر کو بستر پر لیٹے دیکھ کر غصے سے کھول اٹھی۔ انتہائی کیفیت میں جو اس کے منہ میں آیا بولتی گئی۔ غصے میں اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ

"تمہارا بہن بھائی کا رشتہ ڈرامہ بازی ہے۔ وہ تمہاری بہن نہیں محبوبہ ہے جب ہی تم ہر وقت اس کے ناز اٹھاتے رہتے ہو۔ جاؤ اور جا کر اپنی اس محبوبہ دل نواز کو اپنی بیوی بنا لو۔" اتنا کچھ وہ بھی مریم کے خلاف سننا بصیر رضا کی برداشت سے بہت زیادہ تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور صبا کے چہرے پر پانچوں انگلیاں چھاپ گیا۔ صبا یوں بھی غصے میں تھی اور اپنی اس تذلیل کو سہہ نہ سکی اور بچے کو اٹھا کر روتی ہوئی گھر سے نکل گئی۔ جاتے جاتے وہ کہہ گئی تھی کہ جب تک مریم سے اپنے تعلقات ختم نہیں کر لیتے میں اس گھر میں لوٹ کر نہ آؤں گی۔

رخشندہ اس دن صبح سے اپنی کسی جاننے والی خاتون سے ملنے گئی ہوئی تھیں اور دیوار کے اس پار ماموں ممانی اور اپنے کمرے میں آرام سے سوتی مریم کو اس سارے ہنگامے کی کچھ خبر نہ ہو سکی۔ جب شام میں رخشندہ واپس گھر آئیں تو بصیر کی زبانی صبا کے یوں اچانک بغیر بتائے میکے جانے کا سن کر حیران تو ہوئیں لیکن کوئی اعتراض نہ کیا کہ وہ جانتی تھیں صبا بہت کم، کبھی کبھی ہی اپنے میکے رہنے جاتی ہے۔

......☆☆☆......

صبا کے گھر چھوڑ کر چلے جانے، اس کی مریم کے لیے نفرت اور اپنے بیٹے کی جدائی تینوں نے مل کر بصیر رضا کو بہت اداس کر دیا تھا۔ وہ سارا وقت مرجھایا مرجھایا سا رہتا۔ مریم اس کی اس کیفیت کو دیکھ کر اسے چھیڑتی کہ

"اوہو! بھابی کے جانے سے کیا اداس شکل نکل آئی ہے۔ بالکل مجنوں کے جانشین بنے بیٹھے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو فون کر کے بھابی کو واپس بلا لوں۔" لیکن وہ اسے ٹال جاتا۔ فون کرنے سے بھی اس نے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ صبا کے میکے کا فون خراب ہے۔ صبا کو میکے گئے تقریباً پندرہ دن ہو چکے تھے۔ رخشندہ بصیر سے کئی بار کہہ چکی تھیں کہ بہو اور بچے کو لے آؤ۔ گھر ان کے بغیر سُونا سُونا لگ رہا ہے۔ لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا۔ حالانکہ اسے خود بھی ابتہاج کی فکر تھی کیونکہ وہ یہاں سے بیماری کی حالت میں ننھیال گیا تھا لیکن انا اجازت نہ دیتی تھی کہ صبا سے رابطہ کرے جو کچھ وہ مریم کے متعلق کہہ کر گئی تھی وہ نہایت ناقابل معافی تھا۔

یہ اتوار کی ایک شام تھی۔ مریم کے لیے ان دنوں کوئی رشتہ آیا ہوا تھا لڑکے کو اس کے گھر بار کو دیکھنے کی خاطر رخشندہ، ناصر حسین اور نور جہاں بیگم سرِ شام گھر سے نکل پڑے تھے۔ بصیر کے سر میں شدید درد تھا اس لیے اس نے ان کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی۔

"لیجیے جناب! گرم گرم چائے کے ساتھ یہ گولی کھائیے اور دیکھیے کیسے سر کا درد منٹوں میں غائب ہوتا ہے۔" سب لوگوں کے جانے کے بعد مریم سر درد کی گولی اور چائے کا بھاپ اڑاتا کپ ٹرے میں رکھے اپنے مخصوص انداز میں بولتی بصیر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کھڑکیوں پر گرے ہوئے پردوں کی وجہ سے کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ مریم نے پردے ہٹا کر لائٹس آن کرنا چاہیں تو بصیر نے منع کر دیا۔ روشنی اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ مریم کی لائی ہوئی چائے کے ساتھ سر درد کی گولی کھا کر وہ خلاف معمول مریم سے کوئی بات کیے بغیر خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ مریم اس خیال سے کہ سر میں درد شاید زیادہ ہے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔

"اور بھئی، گھر سے جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" بصیر نے اسے چھیڑا۔

"آپ سے کس نے کہا؟ میں تو کہیں نہیں جا رہی۔" مریم جو کہ بے خبر تھی حیرانی سے بولی۔

"ارے! تمہیں نہیں معلوم یہ جو آج ہمارے بزرگ بڑی شان سے تیار ہو کر گئے ہیں تو تمہارے متوقع سسرال ہی تو گئے ہیں۔ حد ہے ملکہ عالیہ کو ان کی سلطنت سے نکالنے کے لیے سازشیں کی جا رہی ہیں اور نادان ملکہ بے خبر بیٹھی ہیں۔" مریم بصیر کے الفاظ سن کر اس کا سر دبانا بھول گئی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ لوگ کسی رشتے دار سے ملنے گئے ہیں۔ پوچھا اس لیے نہیں کہ عموماً اسے کسی بات کی کھوج لگانے کی فکر نہ ہوتی تھی لیکن جو کچھ اس نے ابھی جانا تھا۔ اس کو سن کر وہ ہونق ہو گئی تھی۔ آنسو بڑی سرعت سے آنکھوں میں جمع ہوئے تھے اور ٹپاٹپ گرنا شروع ہو گئے تھے۔

"ارے! ارے تم رو کیوں رہی ہو گڑیا! میں نے کوئی تمہیں رلانے کے لیے تو یہ سب نہیں بتایا تھا۔ ویسے بھی ہر لڑکی کی زندگی میں ایک دن تو ایسا آتا ہی ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر نئے گھر جانے کی تیاری کرتی ہے۔" اس کے رونے نے بصیر کو بوکھلا دیا تھا اور وہ اپنی تکلیف بھول کر اٹھ بیٹھا تھا۔

"نہیں بھائی! پلیز ایسا مت کہیں۔ میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی، میرا آپ کے بغیر کہیں دل نہیں لگے گا۔" وہ بے اختیار ہی اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی تھی۔

بصیر نے بازو پھیلا کر اسے اپنے آپ سے مزید قریب کر لیا اور ہولے ہولے اس کی پشت سہلانے لگا۔ خود اس کے اپنے دل میں بھی یہ درد جاگ اٹھا تھا کہ وہ ننھی سی پری جو اب سے اٹھارہ سال پہلے اس کی زندگی میں آئی تھی اسے چھوڑ کر کسی دوسرے دیس جا بسے گی۔ پھر اس کا ہنسنا ہنسانا، لاڈ اٹھانا سب خواب ہو جائے گا۔ وہ کبھی یہاں آئے گی بھی تو چند گھنٹوں کے لیے مہمانوں کی طرح یوں بھی ہمارے معاشرے میں کزنز کی اس درجہ بے تکلفی اور محبت کو کشادہ دلی سے قبول کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی سب سوچتے اس کے ذہن میں صبا کے الفاظ گونجے۔

"وہ تمہاری بہن نہیں محبوبہ ہے۔" شیطان جو اتنے سالوں کی ہزاروں ساعتوں میں ان کے درمیان نہ آیا تھا اچانک بصیر رضا کے دل میں آ بیٹھا اور یک دم ہی اس کی ذہنی رو پلٹ گئی۔

"واقعی یہ میری سگی بہن تو نہیں، یہ تو صرف میری کزن ہے۔ ایک نامحرم لڑکی۔ اور یہ میرے اتنے قریب بیٹھی ہے۔" شیطان پوری طرح اس کے حواسوں پر چھانے لگا تھا۔ صحیح کہا گیا ہے کہ ایک تنہا مرد اور عورت کے درمیان تیسرا فرد شیطان ہوتا ہے۔ وہ بصیر رضا نہیں شیطان تھا جس کی گرفت لمحہ بہ لمحہ مریم کے گرد مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے اس نے مریم کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔ مریم اپنے جذبات کی رو میں

بصیر رضا کے جذبات کی رو کو بدلتے محسوس نہ کرسکی۔ یوں بھی پیشانی پر بوسہ لینا تو بصیر کی بہت پرانی عادت تھی۔ جو مریم کے لیے کچھ ایسی نرالی بھی نہ تھی کہ وہ چونک جاتی۔ اس کی گرفت مریم پر کچھ اور مضبوط ہوگئی تھی اس کا یہ انداز نیا بھی تھا اور کچھ عجیب بھی جس نے مریم کے اندر کی لڑکی کو ٹھٹکا دیا۔ اب مریم پوری طرح حواسوں میں آ چکی تھی۔

''میرے ساتھ کچھ غلط ہو رہا ہے۔'' اس خیال پر اس نے بصیر کا ہاتھ جھٹکا اور اسے دھکا دیتی ہوئی بیڈ سے اتر کر کمرے سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ بصیر رضا جواب تک اس کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت نہ ہونے کو اس کی رضامندی سمجھ بیٹھا تھا اس اچانک دھکے کو سہہ نہ سکا اور بستر پر گر گیا۔ مریم پوری قوت سے بھاگتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔ بھاگتی مریم کا صرف دوپٹہ ہی اس کے ہاتھ آسکا تھا۔

......☆☆☆......

یہ میں نے کیا کردیا؟ یہ سب کیسے ہوا؟ یہ دوپٹہ جو میں نے ہی اس کی سالگرہ پر تحفہ میں دیا تھا۔ میں ہی اس کی عزت کو تار تار کرنے چلا تھا۔ وہ لڑکی جسے میں نے مریم کا نام دیا تھا' میں ہی اس کے تقدس کو پامال کرنے چلا تھا۔ وہ کہ جس کے آنچل پر فرشتے نماز پڑھیں' میں اس ہستی کو داغدار کرنے چلا تھا۔ آخر یہ مجھے کیا ہوا تھا؟ میں تو اسے بہن کہتا تھا......بہن......آہ! کتنا مقدس لفظ ہے جسے ادا کرتے اپنے ارد گرد روشنیوں کی برسات محسوس ہوتی ہے۔ آج میں نے اس لفظ کے تقدس کو پامال کرڈالا۔ کوئی ہے جو مجھے اس جرم کی سزا دے۔ مجھے سنگسار کرے' مجھے بصیر رضا کو...... جو نہایت گہری اور تاریک کھائی میں گرا جارہا ہے۔ کوئی ہے جو مجھے پاتال تک کا سفر کرنے سے روک سکے۔ لیکن نہیں......شاید مجھ جیسے ذلیل شخص کی کوئی بھی صدا اس کھائی سے باہر کھڑے لوگوں کی سماعتوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اب اپنے ریزہ ریزہ وجود اور مردہ روح کے ساتھ ہمیشہ مجھے اس کھائی کی تاریکیوں میں رہنا ہوگا جہاں تک پہنچتے پہنچتے روشنی کی کرن بھی دم توڑ جاتی ہے۔

......☆☆☆......

گھر والے واپس آئے تو مریم اپنے کمرے میں بے سدھ سو رہی تھی۔ بصیر اماں کو صبا کے گھر جانے کا بتا کر باہر نکل گیا۔ اس نے رات وہیں رکنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ مریم کو کسی نے سوتے سے جگانا مناسب نہ سمجھا اور سب لوگ خود بھی سو گئے۔ صبح جب نور جہاں بیگم اسے کالج جانے کے لیے جگاتے اس کے کمرے میں آئیں تو اس کو چھوتے ہی چونک پڑیں۔ اس کا پورا وجود بخار میں پھنک رہا تھا۔ انہوں نے اسے کئی آوازیں دیں لیکن وہ بالکل بے سدھ پڑی رہی۔ گھبرا کر انہوں نے ناصر حسین کو بلوایا۔ وہ اسے فوراً اسپتال لے گئے۔ بخار اتنا شدید تھا کہ اسے وہاں ایڈمٹ کرلیا گیا۔

بصیر شام میں صبا کو لے کر واپس آیا تو اسے مریم کی بیماری کی اطلاع ملی۔ اس نے صبا کو بہت مشکلوں سے منایا تھا۔ وہ بھی اس شرط پر کہ اب ہم اس گھر میں نہیں رہیں گے۔ میں اپنا ٹرانسفر ایک ہفتے کے اندر اندر اسلام آباد کروالوں گا۔ صبا اس شرط پر راضی ہوگئی تھی اور اس کا غصہ بھی کم ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب اسے مریم کی بیماری کی اطلاع ملی تو اس نے بصیر کو اسپتال چلنے کو کہا۔ جس وقت وہ دونوں وہاں پہنچے مریم دواؤں کے زیر اثر گہری نیند سو رہی تھی۔ بصیر کی نگاہیں خود بخود ہی جھک گئیں۔ وہ خود میں اس کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ وہ سارا وقت خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سب اس کی خاموشی کا سبب مریم کی بیماری کو سمجھ رہے تھے لیکن یہ تو وہ ہی جانتا تھا کہ اس سے کیسا جرم سرزد ہوا ہے۔ یہ تو شکر تھا کہ مریم کی آنکھیں بند تھیں ورنہ وہ ایک پل بھی اس کے کمرے میں نہ رک پاتا۔

مریم ایک ہفتے بعد گھر واپس آگئی تھی۔ ایک ہفتے کے بخار نے اسے بالکل نچوڑ کر رکھ دیا تھا اسے چپ سی لگ گئی تھی۔ سب سمجھتے تھے کہ بیماری اور کمزوری کی وجہ سے یہ حال ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ کیسا گھن اس کی ذات کو لگا ہے۔ کیا غم ہے جو اندر ہی اندر اسے ختم کر رہا ہے۔ اس پورے عرصے میں اس کا سامنا بصیر سے نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کی طرف آتا ہی نہیں تھا۔ گھر والوں کو اس نے اپنے اسلام آباد ٹرانسفر کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ سارا دن گھر سے باہر رہتا اور رات گئے جب سب سو جاتے تو واپس آتا۔ رخشندہ اور صبا کے پوچھنے پر اس نے بہانہ بنا دیا تھا کہ جانے کی تیاریوں میں لگا ہوا ہوں۔ یہاں کے آفس کا کام سمیٹ رہا ہوں اور جانے سے پہلے یار دوستوں سے بھی آخری بار ملنا چاہتا ہوں اس لیے ان کی محفل میں رات گئے تک بیٹھا رہتا ہوں۔

جس دن ان لوگوں کی اسلام آباد روانگی تھی ماموں ممانی نے ان کی دعوت کرنی چاہی لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ''آپ لوگ پہلے ہی مریم کی وجہ سے پریشان ہیں اس لیے کسی زحمت کی ضرورت نہیں۔'' روانگی سے قبل اماں اور صبا مریم سے جاکر مل آئیں جبکہ ماموں ممانی تو خود انہیں الوداع کہنے کے لیے ان کے گھر موجود تھے۔

''آپ بھی جاکر مریم سے مل آئیں۔'' روانگی سے چند لمحے پہلے صبا نے اس سے کہا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی وجہ سے بصیر مریم سے ملنے سے گریز کر رہا ہے۔

صبا کے کہنے پر بصیر اپنے اور ماموں کے گھر کا درمیانی دروازہ پار کرکے مریم کے کمرے کی طرف بڑھا۔ لیکن اس کی ہمت نہ تھی کہ وہ اس سے نظر ملا سکتا۔ وہ اس کے کمرے کے بند دروازے کے سامنے چند لمحے کھڑا رہا۔ دو آنسو ندامت بن کر اس کی آنکھوں سے ٹپکے اور مریم کی دہلیز پر گر کر خاک میں مل گئے۔

......☆☆☆......

مریم کی طبیعت بہتر ہوگئی تھی لیکن اس کے مزاج میں بہت بڑا انقلاب آگیا تھا۔ وہ سارا وقت سر پر دوپٹہ اوڑھے رہتی' پانچوں وقت نماز پابندی سے ادا کرتی۔ اس کا زیادہ وقت قرآن پاک کی تلاوت اور ترجمہ و تفسیر پڑھنے میں گزرنے لگا تھا۔ سدا کی لاابالی مریم بہت سنجیدہ اور رکھ رکھاؤ والی ہوگئی تھی۔ ناصر حسین اور نور جہاں بیگم اس کی طبیعت کے اس انقلاب کو بصیر اور اس کی فیملی کی جدائی سے تعبیر کرتے تھے۔

ادھر مریم تھی جوں جوں قرآن پاک کا ترجمہ پڑھتی اس پر اپنی کوتاہیوں کو جان کر ندامت طاری ہونے لگتی۔ وہ حادثہ جو اس دن رونما ہوا تھا گو بہت بڑا تھا لیکن اس کی لاعلمی اور غلطیوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا بے حد احسان تھا کہ وہ پوری طرح ڈوبی نہیں تھی۔ اس مالک کل نے اس کو بچالیا تھا۔ وہ جتنا اپنی کوتاہیوں پر معافی طلب کرتی اس سے بھی زیادہ رب کریم کی شکر گزار ہوتی کہ اس نے اسے دنیا کی نظر میں بے عزت نہ ہونے دیا تھا۔ اس کی عزت کا آبگینہ پوری طرح محفوظ تھا۔

مریم عصر کی نماز سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ نور جہاں بیگم اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

''آیئے امی! بیٹھیے۔'' اس نے ادب سے انہیں مخاطب کیا۔ نور جہاں بیگم اسے ساتھ لے کر اس کے بیڈ پر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔

''بیٹی! تمہاری بیماری سے پہلے تمہارے لیے ایک رشتہ آیا تھا۔ لڑکا سول انجینئر ہے۔ شکل صورت' قد قامت اور عمر کے لحاظ سے تمہارے لیے بہت موزوں ہے۔ اس دن ہم لوگ ان کے گھر گئے تھے تو ہمیں ان کے گھرانے کا رکھ رکھاؤ اور وضع داری بھی بے حد پسند آئی۔ اس رشتے کی واحد خامی جسے خامی قرار دینا بھی مسلمان ہونے کے ناتے ہمیں زیب نہیں دیتا ان کے گھر کا مذہبی ماحول ہے۔ ان کے گھر کی تمام خواتین

www.Paksociety.com

نہایت باپردہ ہیں اور اپنی بہو کے لیے بھی ان کی یہی شرط ہے۔ اس مسئلے کی وجہ سے شاید ہم انکار کر دیتے لیکن اب جس طرح تم دین میں دلچسپی لینے لگی ہو مجھے اور تمہارے ابو کو مناسب معلوم ہوا کہ تم سے اس رشتے کو ڈسکس کرلیا جائے۔ میرے خیال میں اس رشتے کو نبھانے میں واحد رکاوٹ تمہاری اور بصیر کے درمیان بے تکلفی ہے۔ تم دونوں جس طرح بچپن سے ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلف رہے ہو شریعت میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ غلطی ہماری بھی ہے کہ ہم نے تمہیں کبھی اس بات کا احساس نہیں دلایا۔ بہر حال اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے جو تم کہوگی ہمیں منظور ہوگا۔"

اور مریم جو اس رشتے کو اپنے لیے ایک نعمت سمجھ رہی تھی۔ فوراً بول اٹھی۔

"امی! آپ ان لوگوں کو ہرگز انکار نہ کریں۔ ماضی میں جو کچھ ہو چکا اور میں جیسی زندگی گزار چکی اب اسے فراموش کر دینا چاہتی ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ زندگی کے آئندہ سال اسلامی اصولوں اور قرآن و سنت کی روشنی میں گزاروں۔ میں نے ان چند دنوں میں قرآن پاک کا جتنا مطالعہ کیا ہے اس سے اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میری اب تک کی زندگی غفلت میں گزری ہے اور وہ رشتے جو اب تک میں بے تکلفی سے نبھاتی رہی۔ درحقیقت کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔" بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ ایک نامحسوس سے درد کی ٹیسیں تھیں جو نور جہاں بیگم اس کے لہجے میں آنچ دیتی محسوس کر رہی تھیں۔ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

"ٹھیک ہے بیٹا! جیسی تمہاری مرضی ہمیں تو یوں بھی حسان علی کا رشتہ بہت پسند آیا تھا اور اب جبکہ تم خود اپنی زندگی کا انداز بدل کر نئے راستے پر چلنا چاہتی ہو تو ہم کون ہوتے ہیں تمہیں اس راہ پر چلنے سے روکنے والے۔" وہ ماں تھیں بنا اس کے بتائے بھی سمجھ سکتی تھیں کہ اس کی زندگی کسی حادثے سے دوچار ہو چکی ہے ایک حادثہ بھی ایسا جس نے اس کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔

......☆☆☆......

پیاری مریم!

میں تمہارے مقدس نام کو اپنی زبان سے ادا کرنے کے لائق تو نہیں ہوں لیکن اگر ہو سکے تو تم اپنے اس گناہ گار بھائی کو (جو اب بھائی کہلانے کا حقدار بھی نہیں رہا) معاف کر دینا۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ لڑکی جسے میں نے ہمیشہ کسی کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھا۔ اسے یوں کرچی کرچی کر دوں گا۔ جس کے چہرے پر پڑنے والی ایک تیز نظر بھی مجھ سے برداشت نہ ہوتی تھی۔ اس کو اپنی غلیظ نظروں سے داغدار کر دوں گا۔ کاش! وہ سیاہ شام میری زندگی میں کبھی نہ آئی ہوتی۔ جس کے بعد میں کسی کے سامنے نظر اٹھا کر بات کرنے کا حوصلہ بھی خود میں نہیں پاتا۔ بہت غور کیا اور سوچا کہ آخر ایسا کیسے ہو گیا؟ ایک ایسا گناہ جو کبھی میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھا کس طرح سرزد ہوا؟ اور پھر ایک ہی بات سمجھ میں آئی کہ تمہیں اور مجھے جس گناہ کی سزا ملی ہے وہ گناہ ہماری مذہب سے دوری ہے۔ ہم نے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے احکامات کی خلاف ورزی کی اور اپنے آپ کو احکامات کا پابند نہ کیا۔ لہٰذا یہ منحوس وقت ہماری زندگیوں میں آ گیا کہ آج میں تم سے نظر ملانے کے لائق بھی نہیں رہا۔ تمہاری شادی کا کارڈ اور تمہارے سسرال والوں کے متعلق تمام اطلاعات مجھے مل چکی ہیں۔ میں بہت افسردہ ہوں کہ اپنا یہ داغدار وجود لے کر تمہاری خوشیوں میں شریک ہونے نہیں آ سکتا۔ لیکن ساتھ ہی مجھے بے حد خوشی بھی ہے۔

مریم! تم نے اپنی زندگی کے متعلق بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ یقیناً حسان علی تمہاری زندگی کو ایک نیا عنوان

دے گا۔ اس کی کہی باتوں پر عمل کرنا۔ وہ رشتہ جو تمہارا اس کے ساتھ قائم ہونے جا رہا ہے بہت مقدس اور پاکیزہ ہے۔ اب کبھی تم کسی جھوٹے رشتے کے فریب میں نہ آنا۔ زبانی رشتے کو اہمیت نہ دینا۔ یہ خود سے جوڑے ہوئے تو کانچ کے رشتے ہوتے ہیں جو ایک بار اپنی جگہ سے سرکیں تو پھر کبھی جڑ نہیں پاتے۔ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جانے والے ان رشتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ رشتے تو وہی سچے ہوتے ہیں جن کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سگے اور سچے رشتے قرار دیا ہے۔

میری بھولی مریم! دعا کرتا کہ پھر کوئی مریم کسی بصیر کے ضبط اور ایمان کو توڑنے کا سبب نہ بنے اور یہ دعا کرتا کہ اللہ ہمارے بزرگوں کو بھی یہ سمجھ دے کہ اپنی اولاد کو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں رہنا سکھائیں۔ انہیں کسی نقلی رشتے کے فریب میں نہ آنے دیں۔ کھلونے دے کر بہلانے کے بجائے جو ان کی زندگی میں نہیں ہے اس پر صبر کرنا سکھائیں۔

وہ مکان جو ماموں جان نے اب سے 26 برس پہلے میرے نام کیا تھا۔ وہ تمہاری شادی کے تحفے کے طور پر تمہارے نام کر رہا ہوں۔ تمہیں اللہ کا واسطہ مریم! تم مجھے معاف کر دینا۔ بہت دن گزر گئے لیکن خود کو معاف نہیں کر سکا۔ مجھے نیند نہیں آتی مریم! نیند کی گولی کھا کر بھی لیتا ہوں تو پل دو پل کے لیے ہی آنکھ لگتی ہے۔ پھر تمہارا معصوم چہرہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ جب تک تم مجھے معاف نہیں کروگی اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔ دیکھو! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑ رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دو کہ وہ سانسیں جو میرے سینے میں گھٹ گئی ہیں آزاد ہو سکیں۔

فقط تمہارا گناہ گار

بصیر رضا۔

بصیر رضا کا خط ہاتھ میں پکڑے مریم گم صم سی بیٹھی تھی۔ یہاں تک کہ اسے اپنی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی بھی خبر نہیں تھی۔ آج اس کی مایوں تھی۔ پھوپو اور صبا بھابی آج صبح ہی اسلام آباد سے اس کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی پہنچی تھیں۔ بصیر رضا ان کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ وہ آ بھی نہیں سکتا کہ اس میں تاب ہی نہیں۔ صبا بھابی نے اسے بتایا تھا کہ کوئی بہت اہم ڈیلی گیشن لندن سے آیا ہوا ہے جس کی وجہ سے بصیر تمہاری شادی میں نہیں آ سکے۔ ساتھ ہی انہوں نے اسے ایک سفید لفافہ بھی دیا تھا جس میں گھر کے کاغذات اور یہ خط بھی تھا۔

کچھ دیر بعد گم صم بیٹھی مریم کے وجود میں جنبش ہوئی۔

"میں نے آپ کو معاف کیا۔ معاف کیا۔" لفظ آہستہ آہستہ اس کے لبوں سے ادا ہو رہے تھے۔

"جو کچھ ہوا اس کے تنہا ذمہ دار صرف آپ نہ تھے۔ میری حد سے بڑھی ہوئی بے احتیاطی بھی اس کا سبب تھی۔ اللہ آپ کو اور مجھے دونوں کو معاف کرے۔ یوں بھی میں ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہی ہوں۔ دو دن بعد میرا ایک ایسے شخص سے رشتہ قائم ہونے والا ہے جو مجھے ایسے تمام نام نہاد رشتوں سے جو کانچ کے بنے ہیں نجات دلا دے گا۔ میں نے آپ کو معاف کیا۔ اللہ بھی مجھے اور آپ کو معاف کرے (آمین)۔" خط کو پرزے پرزے کرتے ہوئے ہوا کے تیز جھونکوں کے سپرد کرتے ہوئے اس نے بصیر رضا تک معافی مل جانے کی نوید سنانے کی ذمہ داری بھی ہوا ہی کے ذمہ لگائی تھی۔ وہ جانتی تھی بصیر رضا کے دل میں اترتا اطمینان اسے خود یہ یقین دلائے گا کہ وہ مریم کی عدالت سے بری کیا جا چکا ہے۔

مضروب

بھائی عمران احمد
تسلیمات!
یہ کہانی ان لوگوں کی ہے جو اپنی روایات کو ٹھکرا کر اندھا دھند مغربی اقدار کے پیچھے بھاگتے ہیں اور پھر نہ ادھر رہتے ہیں نہ ادھر۔ مغرب کی اچھی چیزوں کو اپنانا بری بات نہیں ہے۔ حدیث قدسی ہے کہ "علم تمہارا بچھڑا ہوا اونٹ ہے اسے جہاں ملے پکڑ لو" مگر ہم علم کے بجائے مغرب کی عادات کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس سے ایسی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔

طاہرہ جبیں تارا
لاہور

اس کے سامنے اس کی جوان بیٹی کی لاش پڑی تھی۔ گولیوں سے چھلنی جسے اس نے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارا تھا' آج وہ زخموں سے چُور خون میں لت پت بدنامی اور رسوائی کی ایک ایسی مثال بن گئی تھی کہ لوگ توبہ توبہ کرکے اس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ علماء حضرات فتویٰ دے رہے تھے۔

"کیسا دور آ گیا ہے' مسلمان ہوکر عیسائی لڑکے کو پھانس رکھا تھا۔ اچھا ہوا مر گئی ورنہ ہم مسلمان اسے خود مار دیتے۔ باپ کی طرح بے غیرت تو نہیں۔"

اچانک اس کی ماں کا چہرہ اسے نظر آیا' حزن و ملال مگر بدنامی و رسوائی کی وجہ سے جھکی نظریں لب کچھ کہنے کی کوشش میں لرزتے کانپتے۔

"اب کیوں اس طرح بیٹھے ہو؟ کب تم نے میری بات سنی' مجھے ہمیشہ دقیانوسی کہہ کر رد کیا۔ اب اپنی دی ہوئی آزادی اپنی تہذیب و تمدن اور روایات کو توڑنے کا مزا چکھو' میں اس لیے ڈرتی تھی۔" وہ اسے کچھ نہیں کہہ رہی تھی مگر وہ سب سن رہا تھا' سمجھ رہا تھا لیکن اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہ تھا۔ یہ بیج اس کا اپنا بویا ہوا تھا۔ مغربی تہذیب کی چکاچوند سے وہ خود اپنی نسلِ نو کو متعارف کروا چکا تھا۔ اس کی ترقیوں کے گُن گا چکا تھا پھر اب کس کو دوش دیتا' ٹینا کو جس کے لیے یہ راہ اس نے خود متعین کی تھی۔

ماضی کے اوراق اس کے سامنے کھلی کتاب طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ فیصل آباد کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد اپنے والد کے ساتھ زمینوں کی دیکھ بھال میں لگ گیا مگر اسے انگریزی بولنے کا بہت شوق تھا۔ انگریزی لباس سے وہ بے حد متاثر تھا۔ انگریزوں کے طور طریقے اس کے من کو بھاتے تھے۔ وہ زمینوں سے آ کر تھری پیس سوٹ پہنتا۔ چھری کانٹے سے کھانا کھاتا اور انگریزی میوزک پر جھومتا چاہے گانا سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اس کا باپ اور ماں اس کے طور طریقے دیکھ کر اسے منع کرتے۔

"ملک رزاق! نہ جانے تُو کس پر چلا گیا ہے' تیرے دادا نے تو انگریزوں سے لڑائی لڑی۔ تیرے دادا کو اپنی سرزمین پر گوروں کا وجود گوارا نہ تھا' اس لیے تو وہ قائداعظم کی مسلم لیگ میں شامل ہوکر انگریزوں کے خلاف نعرہ بازی کرتے تھے۔ انگریزوں کی مکاری اور فریب کا کھلے عام اعلان کرتے۔ انگریزوں نے تیرے دادا کو گرفتار کیا جیل میں ڈالا مگر اسے زیر نہ کرسکے۔ تیرے دادا بہت بڑے زمیندار تھے۔ اپنے نیک کاموں اور حُسن سلوک کی وجہ سے

ے ان پر جان دیتے۔ انگریز سرکار اس لیے ے ہی دن انہیں جیل کا مہمان بنا پاتی اور جب تان بنا تو اس سرزمین کے لیے تیرے دادا نے اپنا ب کچھ چھوڑ دیا' کروڑوں کی جائیداد اور پاکستان کر تھوڑی زمین سرکار سے لی اور محنت و مشقت اس تھوڑی سی زمین کو کروڑوں کا بنادیا۔ یزوں سے نفرت کا یہ حال تھا کہ مجھے انگریزی نہ منے دی اور میں نے بھی پانچویں تک پڑھ کر ؤں پر کام شروع کردیا۔ پر رزاق! تُو تو پورا انگریز ل بنتا جارہا ہے۔ سن اپنا لباس اپنی زمین' اپنی زبان ی اہمیت رکھتی ہے۔ غیروں کی نقالی سے انسان نہ تو پنے جوگا رہتا ہے اور نہ ہی دوسرا روپ دھار سکتا ہے۔" رزاق کے ابا اسے وہ مثال بتا رہے تھے کہ کوا ہنس کی چال اپنی بھی چال بھول گیا۔

"بس اماں! تُو تو پرانے خیالات اور کہاوتیں سنا کے میرا برین ہی خراب کردیتی ہے۔"

"کیا بول رہا ہے؟"

"ارے بھلیے لوکے یہ کوئی انگریزی ونگریزی بول رہا ہے۔ دیکھ قصور اس کا بھی نہیں۔ پورے ملک کا یہی حال ہے آدھے تیتر آدھے بٹیر بنے ہوئے ہیں لوگ۔ امریکہ' لندن جانے کو بے تاب' چاہیں وہاں جاکر انگریزوں کے غسل خانے صاف کریں۔ اپنے ملک میں محنت کرنے میں عار ہے مگر غیروں کے سامنے کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتے۔ نہ جانے کیا بنے گا ہمارے ملک کا' ہماری قوم کا۔ بھلا حکومت ہی ان موئے انگریزوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے تو عوام کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔"

"بس ابا! تجھے تو کسی کالج میں پروفیسر ہونا چاہیے تھا۔ بہت لیکچر دیتا ہے' اماں کم ہے جواب تُو نے بھی یہی کام کرنا شروع کردیا۔"

"بچہ! جب ہم نہیں ہوں گے تو تُو یاد کرے گا ہماری باتیں۔ اب تو تُو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا ہے۔"

اماں ابا نے گاؤں کی ایک لڑکی سے اس کی شادی کردی۔ رشیدہ بہت خوب صورت تھی مگر بہت سادہ مزاج' جب اس نے رشیدہ سے کہا۔

"رشی ڈارلنگ! یہ اسکرٹ میں لاہور سے لایا ہوں' اسے پہن کر دکھا۔" تو وہ بے اختیار بولی۔

"نہیں ملک صاحب! یہ ننگا لباس میں نہیں پہنوں گی۔ اماں ابا کیا کہیں گے؟ یہ میموں کا لباس پہن کر گھر میں پھر رہی ہے۔"

"ارے پاگل! لاہور جا کر دیکھ لڑکیوں کو اسکرٹ' ٹراؤزر شرٹس پہن کر گھومتی ہیں بازاروں میں اور تجھے تو میں گھر میں پہننے کے لیے کہہ رہا ہوں۔"

"دیکھ لیں ملک صاحب! میں آپ کے لیے سب کچھ کرسکتی ہوں مگر آپ کے سامنے بھی یہ بے شرموں والا لباس نہیں پہن سکتی۔ دیکھیں اس کے بازو ہیں ہی نہیں' میں نے تو کبھی آدھے بازو والی قمیص نہیں پہنی تو یہ...... نہیں میں نہیں پہن سکتی۔"

"اماں ابا کم تھے کہ تجھے بھی لاکر میرے اوپر نازل کردیا ہے۔" وہ منہ میں بڑبڑاتا باہر نکل گیا۔

اللہ تعالیٰ نے سال بعد ہی اسے پیاری سی بیٹی کا باپ بنادیا۔

"اماں ابا اور رشیدہ! تُو بھی سن لے میں اپنی مرضی سے اپنی بیٹی کی پرورش کروں گا۔ خبردار کسی نے مجھے روکا ٹوکا میں......"

"اچھا اچھا اب بس کر' اپنی مرضی ہی کرنا اب اس کا نام تُو رکھ لے۔"

"ہاں ہاں میں نے اس کا نام سوچ رکھا ہے ٹینا رزاق!"

”ٹینا! یہ کیا نام ہے؟ رزاق پتر! کوئی چنگا سا نام رکھ جس کا کوئی اچھا سا مطلب ہو؟“

”بس اماں یہ میری ٹینا ہے۔ اس کا نام ٹینا ہے۔“

”پر ٹینا کا مطلب کیا ہے؟“

”جو بھی مطلب ہو مجھے پسند ہے یہ نام۔“

یوں ٹینا اپنے باپ کی لاڈلی بن گئی۔ جیسے ہی اس نے اماں ابا کے بجائے ماما پپا کہا تو ملک رزاق خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگا۔ اس نے فیصل آباد کے ایک مشنری اسکول میں ٹینا کو داخل کرا دیا۔

سب گھر والوں نے مخالفت کی مگر کوئی اسے نہ روک سکا۔

”دیکھ رزاق پتر! تو اسے کسی بھی انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرا لے مگر عیسائیوں کے اسکول میں داخل نہ کرا' جہاں پڑھائی کا آغاز بائبل سے ہوتا ہے۔ پتر! ہم مسلمان ہیں تجھے اسی بات کی تمنا ہے نا کہ تیری بیٹی فرفر انگریزی بولے تو انگلش میڈیم اسکول جو مسلمانوں نے کھول رکھے ہیں وہاں داخل کرا دے پر کافروں کے اسکول میں داخل نہ کرا۔ یہ تیرے اسلامی تشخص کے خلاف ہے' تیری تہذیب و روایات کے خلاف ہے۔“

”ابا! اب دیکھ زمانہ کہاں جا رہا ہے' اب تو بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سے باہر نکل اور زمانے کا ساتھ دے' اب پرانی باتوں اور پرانے خیالات کے بجائے نئی نئی چیزیں اپنا' یہی زندگی کا تقاضا ہے۔“

”بات مان لے پتر! اس کی سہیلیاں بھی ساری عیسائی ہوں گی' ہماری پوتی اب عیسائیوں میں پلے بڑھے گی تو اپنی تہذیب اپنی روایات بھول جائے گی۔“

”بس ابا! اب بس کر' سن سن کے میرے تو کان بھی پک گئے ہیں۔“

ٹینا جوں جوں بڑی ہوتی گئی وہ اپنی سہیلیوں کے رنگ میں رنگتی گئی۔ سگریٹ نوشی کرتی' منہ بگاڑ انگریزی بولتی اب لڑکیوں کے ساتھ اس کی لڑکوں سے بھی دوستی تھی' جب ماں نے اور دادا نے منع کیا تو باپ کی لاڈلی نے کہا۔

”گرینڈ پا اینڈ ماما! میرے پپا میرے ساتھ ہیں جب انہیں اعتراض نہیں تو پھر آپ دونوں کو کیا پرابلم ہے۔ مائیکل میرا دوست ہے' میرے ساتھ پڑھتا ہے اگر میں اس کے گھر جاتی ہوں تو اسے بھی اپنے گھر بلا سکتی ہوں۔“

”پتر! یہ لڑکوں اور لڑکیوں کی دوستی اچھی بات نہیں ہے۔ اسلام نے تو سوائے باپ' بھائی' بیٹے' ماموں کے سب سے پردے کا حکم دیا ہے کجا کہ غیر مسلموں سے دوستی۔“

”پپا پلیز گرینڈ پا کو سمجھائیں یہ سب دقیانوسی باتیں ہیں' محرم اور نامحرم کے چکر سے نکلیں اور ... جانی کرسچین تو اہلِ کتاب ہیں ان سے دوستی اور رشتہ داری سے اسلام منع نہیں کرتا۔ مجھے خود مائیکل نے بتایا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہے استغفار پڑھ۔ اسلام نے کافروں سے رشتہ داری کا حکم نہیں دیا پگلی! مرد کے لیے حکم ہے کہ وہ اہلِ کتاب سے شادی کر سکتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میرے پیارے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ ایک غیر مسلم سے مسلمان لونڈی بہتر ہے۔ یہ وہ کیسا سبق دے رہا ہے موا مائیکل؟“

”اوکے پپا! آپ ہی ماما اور گرینڈ پا کو سمجھائیں' میں تو چلی آج ہمارا کمبائن اسٹڈی کا پروگرام ہے۔ میٹرک کے پیپرز ہونے والے ہیں' بہت محنت کر رہی ہے آپ کی بیٹی۔“

”جاؤ بیٹی جاؤ۔“

”رزاق پتر! تیری بیٹی تیرے ہاتھ سے نکل جائے گی' تو خود اپنی بیٹی کے لیے کانٹے راہ میں بچھا رہا ہے۔ کچے ذہن میں جو سبق پڑھایا جائے گا وہ پختہ ہوتا جائے گا۔ آج وہ عیسائیوں سے دوستی اور رشتہ داری کی بات کر رہی ہے اگر کل کو اس نے ان سے رشتہ داری جوڑ لی تو اس معاشرے کو اپنے خدا کو کیا جواب دے گا۔ اس کا کچا ذہن ہے ابھی بھی وقت ہے اسے سیدھے راستے کی طرف موڑ لے' تیری بات مانتی ہے۔“

”ابا تو کم فکریں پالا کر' رات رشیدہ دماغ کھاتی رہتی ہے اور دن میں تو' میری بیٹی ہے وہ کچھ ایسا نہیں کرے گی۔“

میٹرک کے بعد تو ٹینا بالکل ہی آزاد ہو گئی۔ سارا وقت مائیکل کے ساتھ گھومتی پھرتی۔

”ٹینا! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا' ہم دونوں شادی کر لیں گے۔“

”اوکے بابا! ٹینا تمہاری ہے' تمہاری ہی رہے گی۔“

”تیرے گھر والے تو اعتراض نہیں کریں گے ہم دونوں کا مذہب جو الگ ہے۔“

”ارے نہیں' گرینڈ پا اور ماما روڑے اٹکائیں گی پر ڈونٹ وری پپا میرے ساتھ ہیں۔“

”میں ایف ایس سی لاہور سے کروں گا۔“

”میں بھی تیرے ساتھ لاہور آ جاؤں گی۔ کنیئرڈ کالج میں داخلہ لوں گی۔“

”پپا! یہ دیکھیں میری فرسٹ پوزیشن آئی ہے اب میں لاہور سے ایف ایس سی کروں گی۔ ہاسٹل میں رہ لوں گی' فیصل آباد میں کنیئرڈ کالج جیسا تو کوئی بھی کالج نہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں کنیئرڈ کالج سے اسٹڈی کروں' اوکے پپا جان!“

”اکیلی کیسے رہے گی ملک صاحب! جوان جہان لڑکی ہے اور زمانہ بہت خراب ہے۔ میرا دل ہولتا ہے بس میٹرک ہی کافی ہے کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر شادی کر دیتے ہیں۔“

”پاگل ہو گئی ہے میں نے اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا ہے ڈاکٹر...... ساری لڑکیاں تعلیم کے لیے امریکہ' لندن جا رہی ہیں' یہ تو لاہور جا رہی ہے دو چار گھنٹوں کا راستہ' جب تیرا دل چاہے گا بیٹی سے ملنے کو تجھے لے جاؤں گا۔“

وہ ابھی فرسٹ ائر میں ہی تھی کہ دادا کا انتقال ہو گیا۔ وہ رسم دنیا نبھانے کے لیے آئی اور قل سے دوسرے دن جانے کو تیار ہو بیٹھی۔

”ٹینا! ابھی نہ جاؤ' لوگ کیا کہیں گے ہفتہ تو رک جاؤ۔ تیرے دادا تھے' قل والے دن بھی تو قرآن پڑھنے کے بجائے اس موئے موبائل کے ساتھ ہی لگی رہی' سب لوگ باتیں کر رہے تھے۔ تجھے اپنے دادا کے جانے کا دکھ نہیں ہوا۔“

”اُفوہ ماما! دکھ کس بات کا' ہر ایک نے مرنا ہے۔ یہ تو نہیں کہ اگر کوئی مر گیا تو اس کے سوگ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ دنیا کے کاروبار چلتے رہتے ہیں۔ کسی کے مرنے سے کوئی کاروبار رکتا نہیں' مجھے بھی ضروری جانا ہے میری اسٹڈی کا ہرج ہو گا۔“

دو ہفتوں کے بعد اس نے فون کیا۔

”پپا! آپ میری مائیکل کے ساتھ منگنی کر دیں۔“

”کیا کہہ رہی ہو تم! ابھی تمہارے دادا کا چالیسواں نہیں ہوا اور تم منگنی کی بات کر رہی ہو اور وہ بھی مائیکل سے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ عیسائی ہے اور تو مسلمان۔“

”اُفوہ پپا! وہ اہلِ کتاب ہے اور ویسے بھی وہ اپنے مذہب پر قائم رہے گا میں اپنے مذہب پر۔“

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

"پپا پلیز! آپ سوچیں میں پھر فون کروں گی۔"

اور پھر یہ خبر سارے گاؤں' سارے خاندان میں پھیل گئی کہ ٹینا مائیکل سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

اس کے چچازاد بھائی نے کہا۔

"سن رزاق! بے شک وہ تیری بیٹی ہے وہ ہمیں بھی اتنی ہی پیاری ہے جتنی تجھے۔ تُو نے انگریزوں کے اسکول میں ڈالا ہم نہیں بولے' اس کی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ لڑکوں سے بھی دوستی رہی ہم نے کچھ نہیں کہا مگر یہ اسلام کے منافی بات ہے غیر شرعی حرکت ہے اگر اس نے مائیکل سے شادی کی تو ہم دونوں کو قتل کردیں گے۔ کان کھلے رکھ تُو تجھے پتا چلے کہ علماء کیا فتویٰ دے رہے ہیں انہوں نے ٹینا کو واجب القتل قرار دے دیا ہے اور یہ درست ہے کیونکہ اگر کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم سے شادی کرتی ہے تو وہ واجب القتل ہے۔ تجھے بھی اسلام کا یہ سبق بھولا تو نہیں ہوگا۔ اپنی بیٹی کو سمجھا دے اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی نا تو ہم اسے اور اس کتے مائیکل کو پاتال سے ڈھونڈ لیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔"

"ملک صاحب! میں نے منع کیا تھا اتنی آزادی نہ دیں' لاہور نہ بھیجیں مگر آپ کو ہماری باتیں پرانی لگتی تھیں۔ ہم بغیر سوچے سمجھے محض ترقی کی دوڑ میں اپنے بچوں اور بچیوں کو تاریک راہوں کا مسافر بنا دیتے ہیں۔ ملک صاحب! ٹینا قصوروار نہیں ہے آپ قصوروار ہیں' جب بھی میں نے اور ابا نے اسے سیدھی بات بتانی چاہی' اسلام کی طرف لانا چاہا آپ نے دقیانوسی کہہ کر ہمارا مذاق اڑایا۔ ٹینا نہیں آپ واجب القتل ہیں ملک صاحب! مغربی تہذیب اپنانے کا مزا چکھ لیں۔ اب بیٹی کو سمجھانا آپ کا ہی کام ہے۔"

......☆☆☆......

"پپا! آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"دیکھ ٹینا! ایسا ناممکن ہے۔ کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کرسکتی اگر وہ ایسا کرتی ہے تو پھر اس کا قتل واجب ہوجاتا ہے۔ اگر تم نے ایسا قدم اٹھایا تو تمہیں قتل کروا دیا جائے گا۔"

"اُفوہ پپا! کیا ہوگیا ہے لگتا ہے دادا اور ماما کی روح آپ میں چلی گئی ہے اگر غیر مسلموں سے دوستی کرسکتے ہیں تو شادی کیوں نہیں۔"

"میں نے کہہ دیا ہے ٹینا کہ ایسا ناممکن ہے بس...... اب میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں سنوں گا' بلکہ تمہاری پڑھائی بھی ختم کردوں گا۔"

"اوکے پپا! میں آج مائیکل سے ملتی ہوں اور اسے سمجھاتی ہوں۔"

"آج کے بعد تم اس سے نہیں ملو گی۔ یہ میرا حکم سمجھو۔"

......☆☆☆......

"ہاں کیا فیصلہ ہے تمہارا۔"

"دیکھو مائیکل! میرے پپا نہیں مان رہے' اس لیے میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی یہ زندگی مجھے بہت پیاری ہے اگر میں تمہارے ساتھ شادی کرلیتی ہوں تو لوگ مجھے قتل کردیں گے میری فرینڈ مجھے بتا رہی تھی۔"

"بکواس کرتی ہو تم' باپ تو میرا بھی نہیں مان رہا مگر میں تم سے شادی کرکے رہوں گا تُو تیار ہے یا نہیں۔" مائیکل نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "کیا کوئی اور ڈھونڈ لیا ہے؟"

"نہیں وحشی انسان میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ میرے گرینڈ پا صحیح کہتے تھے کہ تم غیر مسلم فریبی' مکار اور وحشی درندے ہو۔"

"ارے تو یوں بول تجھے اسلامی بخار چڑھا ہے یا

کوئی اپنا ہم مذہب پھانس لیا ہے۔"

"بکواس مت کرو اور اب میں جا رہی ہوں' آئندہ کال مت کرنا۔"

"ارے سنہری چڑیا! میں تجھے اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔ کروڑوں کی جائیداد کی اکلوتی وارث ہے تُو' چل میرے ساتھ ورنہ......" اس نے پستول نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں گھٹیا انسان! بچاؤ...... بچاؤ......" اس نے ایک دم آوازیں لگائیں اور مائیکل نے اندھا دھند فائرنگ کردی۔ چھ گولیاں ٹینا کو لگیں' دو راہگیر زخمی ہوئے اور شیر پاؤ پل ٹینا کے خون سے رنگین ہوگیا۔ مائیکل کو گرفتار کرلیا گیا۔

"ملک صاحب! بیٹی کو رخصت کریں۔" رشیدہ نے اس کے کندھے کو ہلایا۔ اس نے سپاٹ نظروں سے رشیدہ کو دیکھا اور پھر اس کی نظریں اپنی بیٹی کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ کتنی معصومیت تھی۔

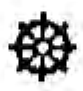
"رزاق پُتر! میری پوتی بڑی معصوم ہے اور زمانہ بڑا چالاک ہے اور یہ عیسائی اس کے کچے ذہن کو اپنی چکاچوند سے تباہ کردیں گے۔" اس کے قریب ابا کی سرگوشی ابھری۔

"دیکھ موئی! حکومت بھی امریکہ امریکہ کرتی ہے اور اپنا رزاق پُتر بھی ٹینا کے ساتھ پتا نہیں کیا انگریزی میں گٹ مٹ کرتا رہتا ہے۔ ہائے ہم مسلمانوں کو کیا ہوگیا ہے' غیر مسلموں کا دم بھرتے رہتے ہیں۔" اماں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

سرگوشیاں اس کے چاروں اور گونج رہی تھیں اور پھر اس نے اپنی پیاری بیٹی کو منوں مٹی تلے دفنا دیا۔

آج مائیکل جیل میں سزا کاٹ رہا ہے وہ جیل سے باہر سزا کٹ رہا ہے۔ ٹینا کو ہر بات ریکارڈ کرنے کی عادت تھی اور مائیکل سے ہونے والی آخری گفتگو بھی اس نے ریکارڈ کرلی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی آخری گفتگو سنتا رہتا ہے۔ جسے اس نے خود جدید تہذیب کے طور طریقے سے آشنا کیا تھا۔ اگر وہ انگریزی سے متاثر نہ ہوتا تو اپنی بیٹی کو غیر مسلموں سے دور رہنے کی تلقین کرتا تو یہ سانحہ رونما نہ ہوتا' نہ زمانہ اس پر تھو تھو کرتا۔

ہم نے اپنی تہذیب' مذہب اور روایات کو فراموش کرکے مغربی تہذیب کی پیروی شروع کردی ہے یہ جانے بغیر کہ یہ تہذیب بظاہر تو چمک دمک رکھتی ہے مگر اندرون خانہ نحش تاریک اور فسادی ہے۔ جب کوئی مسلمان اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے تو پھر وہ تباہ و برباد ہوجاتا ہے۔ آج ہم خود غیر مسلموں اور کفار کو بہت فخر سے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتے ہوئے احساسِ برتری محسوس کرتے ہیں حالانکہ یہ احساسِ برتری نہیں احساسِ کمتری ہے۔ اللہ ہمارے حال پر رحم کرے اور ہمیں اپنے مرکز کی طرف راغب ہونے کی توفیق عطا کرے۔ ٹینا کا قتل اس بات کا ثبوت ہے کہ غیر مسلم ہمارے دوست نہیں بلکہ دوست کے پردے میں دشمن ہیں اور ہمیں دشمن سے خبردار رہنا چاہیے جو موقع ملتے ہی اپنی عیاری' چالاکی اور فریب سے ہم پر جان لیوا وار کرسکتے ہیں۔





شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

محبت کی روایتی تکون سے شروع ہونے والی یہ خونی داستان جوں جوں آگے بڑھتی ہے کہانی سے جڑے کرداروں کو کسی عفریت کی طرح نگلتی جاتی ہے۔ اس میں کرپٹ سیاست دانوں کی نقاب کشائی نہایت مہارت کے ساتھ کی گئی ہے کہ کیسے وہ وطن عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کہلانے والے مجبور و مقہور طبقے کے بنیادی حقوق کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ گفتار کے یہ غازی کیسے عوام کو سبز باغ دکھا کر ان کی عزت و جان اور مال و متاع کے سودے وطن دشمنوں سے کرتے ہیں۔ اپنے مفادات کی خاطر کیسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ان کے وعدے پانی پر کھینچی گئی لکیر کی طرح ناپائیدار ہوتے ہیں۔

اس طویل داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لیے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

میں نے جب یہ دیکھا کہ راکھی اب پوری طرح میرے شیشے میں اتر چکی ہے تو میں نے وہ سوال جو بہت عرصے سے مجھے پریشان کررہا ہے کہ آخر یہ غضنفر کون ہے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کر ڈالا۔

میرا سوال سن کر مجھے اس کی آنکھوں میں الجھن تیرتی ہوئی دکھائی دی۔ یا تو وہ واقعی غضنفر نام کے کسی شخص سے واقف نہیں تھی' یا پھر وہ زبردست اداکاری کررہی تھی۔

''غضنفر' کون غضنفر؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا تم نے یہ نام نواب سطوت کی کوٹھی میں کسی کے منہ سے نہیں سنا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں میں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا۔ کون ہے غضنفر؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

''میں نے بھی ایک دو کے منہ سے یہ نام سنا ہے' اسی لیے جاننا چاہ رہا تھا اس کے بارے میں۔'' میں نے کہا۔

''پھر بھی کس کے منہ سے اور کس سلسلے میں یہ نام سنا ہے جو تمہیں اتنی تشویش ہورہی ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ایک شخص تھا عمران' سردار نواب نے ایک جھوٹی کہانی گھڑ کر اس کا مرڈر کروانے کے لیے مجھے بھیجا تھا۔ میں جب اس کو مارنے لگا تو اس نے کہا کہ تمہیں غضنفر نے مجھے مارنے کے لیے بھیجا ہے اس نے میرے باپ کو بھی مروایا تھا کیونکہ نواب نے ایک جھوٹ کا سہارا لے کر مجھے اسے مارنے کے لیے بھیجا تھا اس لیے مجھے شک ہوا کہ غضنفر یقیناً نواب کا ہی کوئی بندہ ہوگا۔'' میں نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

''کیا سوچنے لگیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''دیکھو راکھی تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تم کوئی بھی بات جو تمہیں معلوم ہوگی مجھ سے نہیں چھپاؤ گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس شخص کو جانتی ہو' پھر مجھ سے کیوں چھپا رہی ہو۔'' میں نے اس کا چہرہ اپنی جانب موڑ کر اس کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے اپنی نگاہیں جھکالیں۔

میں سمجھ گیا کہ راکھی مجھے اس کے بارے میں بتانے سے گریز کررہی ہے۔ مجھے ایک دم ہی ڈھیر سارا غصہ آگیا اور میں نے ایک جھٹکے سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھ سے جھٹک کر چھوڑ دیا اور غصے سے کہا۔

''نہیں بتانا ہے تو نہ بتاؤ' جاؤ دفع ہوجاؤ یہاں سے ہماری اور تمہاری دوستی آگے نہیں بڑھ سکتی اور ہاں اب مجھے تمہارا ساتھ بھی نہیں چاہیے کل میرے ساتھ شیر افضل کی حویلی بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نہیں' نہیں پلیز مجھ سے ناراض مت ہو' میں تمہاری ناراضگی افورڈ نہیں کرسکتی۔ اس لیے اب چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے میں تمہیں ہر بات بتا کر رہوں گی۔'' وہ ایک جھٹکا کھا کر تیزی سے میری جانب آئی اور میرے بازو سے لپٹ کر بولی۔ لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اب کیوں ناراض ہو بتا تو رہی ہوں۔ سب کچھ۔ تم دیکھو تا اگر یہ بات نواب کو پتا چلی کہ میں نے تمہیں یہ سب کچھ بتادیا ہے تو وہ میری جان لینے میں لمحہ بھی نہیں لگائے گا اب تم اپنا موڈ ٹھیک کرو پھر میں تمہیں بتاؤں گی۔'' اس نے کہا۔

''مجھے بہت افسوس ہورہا ہے راکھی' اس بات کا کہ ابھی ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ دوستی نبھانے اور وفادار رہنے کا وعدہ کیا تھا لیکن تم تو پہلے ہی قدم پر لڑکھڑا گئی۔ ایسے کیسے کام چلے گا۔ دوستی بے اعتباری کا نام نہیں ہے۔'' میں نے روٹھے لہجے میں کہا۔

''اچھا بابا معاف کردو' آئندہ اگر ایسا کروں تو جو چاہو سزا دے دینا' چاہے میری یہ گردن اتار لینا۔ میں اف نہیں کروں گی۔ اب تو خوش ہوجاؤ۔'' اس نے میرے آگے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اور سر کو جھکا کر کہا تو میں نے اسے گلے سے لگالیا پھر چند لمحے اس کے رسیلے ہونٹوں کو محبت کا جام پلانے کے بعد کہا۔ ''اچھا اب بتاؤ۔''

''ہاں میں غضنفر کے نام سے واقف ہوں۔ لیکن غضنفر اب دوسرے نام سے لوگوں میں جانا جاتا ہے۔ لیکن بہت سے اس کے پرانے یا قریبی جاننے والے ایسے لوگ ہیں جو اس کے نام سے واقف ہیں۔

غضنفر کو اب لوگ ''صدیق پاشا'' کے نام سے جانتے ہیں۔ صدیق پاشا وہی شخص ہے جو تم سے خار کھاتا ہے پہلے نواب کے ساتھ اس کوٹھی میں رہتا تھا اب نواب نے اسے اپنے گاؤں والی حویلی میں بھیج دیا ہے۔''

''یہ نواب کے گاؤں کا نام کیا ہے۔'' میں نے راکھی کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''شاداب پور۔'' اس نے جواب دیا۔ پھر اپنی بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے میں نے توڑا تھا۔

''وہ جو تم نے عمران سردار کا ذکر کیا تھا تو اس کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ''سردار احمد ایک بہت مال دار آدمی تھا۔ چمن کی وادیوں کے پہاڑی علاقے میں اس کی موروثی جائیداد تھی۔ یہ قبائلی علاقہ پہاڑوں کے

www.Paksociety.com

خطرناک سلسلے پر مشتمل تھا اور سیکڑوں میل کے اس علاقے میں صرف ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جس کا نام چمن تھا۔ لیکن جب ان پہاڑوں سے لوہا برآمد ہوا تو سردار احمد کی تو قسمت ہی بدل گئی۔ حالانکہ حکومت نے بیش تر علاقہ سردار احمد سے خرید لیا تھا لیکن چمن کی وادی اب بھی اس کی ملکیت تھی۔ لوہا برآمد ہونے کے بعد وادی کا شمار خاصی اہم وادی میں ہونے لگا۔ سردار احمد نے قرب و جوار کے علاقے سے جہاں کان کنوں کی بستیاں تھیں مزدور بلوائے اور کام شروع کروادیا۔

پھر اچانک ہی سردار احمد کا ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا۔ سردار احمد کے بعد اس کی تمام جائیداد اور زمینوں کا مالک اس کا اکلوتا بیٹا عمران سردار ہوا۔ اس وقت غضنفر عمران کے پاس گیا اور اس سے چمن کی وادی اور اس کی اردگرد کی زمینوں کا زبردستی سودا کرنا چاہا۔ اس نے خود ہی پہلے سے ہی زمین کی منتقلی کے کاغذات تیار کروائے۔ عمران سردار نے غضنفر کے ہاتھوں زمین بیچنے سے انکار کردیا تو غضنفر نے دھوکے سے کسی اور کے ذریعے عمران سے ان کاغذات پر دستخط کروالیے۔

عمران سردار کو جب اس دھوکہ دہی کا پتا چلا تو اس نے غضنفر کو نہایت خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیں تب غضنفر نے اسے بھی مرواڈالا۔"

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مجھ سے تو نواب نے عمران کو مروایا تھا یہ غضنفر کہاں سے بیچ میں آگیا۔" میں نے کہا۔

"دراصل وہ زمین غضنفر اپنے لیے نہیں خرید رہا تھا وہ نواب کا ملازم تھا اور نواب ہی کے کہنے پر یہ کام کررہا تھا۔ عمران کا سامنا چونکہ غضنفر سے ہوا تھا اس لیے اس نے اسی کا نام لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ چونکہ اس کے دستخط شدہ کاغذات غضنفر کے پاس ہیں اس لیے اسے مرکر وہ ان زمینوں کا جائز وارث ہونا چاہتا تھا۔ نواب نے تمہارے ذریعے عمران کا کانٹا اپنے رستے سے نکلوایا اور خود بغیر ایک بھی پیسہ خرچ کیے زمینوں کا مالک بن بیٹھا اور اب اس کو شاید اس نے اس لیے یہاں سے شاداب پور بھیج دیا ہے اور تمہیں اپنے ساتھ رکھ لیا ہے۔" راکھی نے مجھے تفصیل سے بتایا۔

"اچھا اب میں ساری بات سمجھ گیا۔" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"ہاں ایک بات اور ہے اور وہ بہت اہم ہے جو میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں بتانا ضروری ہے۔" راکھی نے کہا تو میں چونک پڑا۔

"وہ کیا؟" میں نے چونک کر کہا۔

"تم یہاں شیر افضل کو نہیں مار سکتے۔" اس نے سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ کیا مطلب ہے اس بات کا؟" میں نے چونک کر غصیلے لہجے میں کہا۔

"وہ اس لیے کہ نواب ابھی ایسا نہیں چاہتا اس نے تمہیں یہاں بھیج تو دیا ہے تاکہ تم اس کے شکر گزار رہو دوسری جانب وہ کسی بھی ذریعے سے شیر افضل اس بات کے لیے خبردار کردے گا..... تم حویلی مت جانا کچھ لوگ تمہاری تاک میں بیٹھے ہیں کہ تمہاری جان لے سکیں اور پھر وہ تمہیں یہاں زیادہ دن ٹھہرنے بھی نہیں دے گا۔ وہ بڈھا بہت چالاک اور خبیث ہے اور تم اس کے شیطانی دماغ کی اسکیموں کی گرد تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ البتہ اس کی بیٹی کے ساتھ تم جو چاہو سلوک کرو۔ اسے اس کی بیٹی کی ضرورت نہیں ہے۔" راکھی نے سنسنی خیز انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسی ہی بات تھی تو نواب مجھ سے یہ کہہ سکتا تھا کہ تم ابھی شیر افضل سے انتقام نہ لو ابھی مجھے اس کی ضرورت ہے تو کیا میں منع کردیتا۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ بات تو ہے لیکن شاید...... پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا مجھے نہیں معلوم تم دفع کرو اس بات کو اب تو مجھ سے ناراض نہیں ہونا۔" اس نے جھنجلا کر بات ختم کرنے سے پہلے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہوں۔" میں نے سوچوں میں گم ہنکاری بھرتے ہوئے کہا۔

پھر راکھی اپنی چارپائی پر سونے کے لیے لیٹ گئی اور میں بھی پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے میں شیر افضل کی شہزادی جیسی بیٹی کے بارے میں سوچتا رہا۔

دوسری صبح میں اپنا تمام ضروری سامان' جو میں نے اپنے بڑے سے اور ڈھیلے ڈھالے چوغے کی جیبوں میں چھپا رکھا تھا لے کر راکھی کے ساتھ حویلی روانہ ہوگیا۔

میں نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ فی الحال شیر افضل کی جان نہ سہی اس کی عزت تو اپنے قدموں تلے روند کر اپنی معصوم بہن فائزہ کا انتقام تو لے ہی سکتا ہوں۔

میں حویلی پہنچا تو کلثوم کا چہرہ مجھے مسرور دکھائی دیا۔ میں سمجھ گیا کہ شہزادی کی طبیعت یقیناً بہتر ہوگی۔

"سو بسم اللہ' میرے بھاگ جاگے جو حضور میرے غریب خانے میں تشریف لائے۔ شکر ہے رب سوہنے کا کہ شہزادی اب کافی ٹھیک ہے اس نے صبح ناشتہ بھی کیا ہے اور آپ کے بارے میں بھی پوچھا ہے کہ آپ کب آئیں گے۔" کلثوم نے پرمسرت لہجے میں میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"ہم نے کہا تھا نا کہ تم اب بالکل بے فکر ہو جاؤ

alislamkpk.com

ملک کا منفرد دینی و اصلاحی رسالہ



تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے

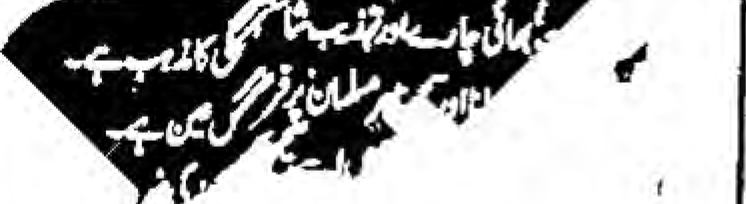
ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیرادارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری

روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

خوابوں کی تعبیر: حافظ عبدالقیوم نعمانی



دنیائے اسلام کے تمام مسالک سے متعلق علمائے کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل

وہ سب کچھ جو آپ جاننا اور پڑھنا چاہتے ہیں

پتہ: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

فون: 35260771/2 فیکس: 35260773

alislamkhi@gmail.com

اس کا علاج ہم ایسا کریں گے کہ اب شاہ جنات تو کیا اس کا باپ بھی شہزادی کے نزدیک نہیں آئے گا۔ لیکن ہم آخری دو تین دن ایک اہم عمل کرنا چاہتے ہیں اور وہ عمل رات کے وقت شہزادی کے کمرے میں ہوگا۔ ہماری مریدنی خاص بھی ہمارے ساتھ ہی کمرے میں موجود رہے گی۔ تاکہ اگر شہزادی کی طبیعت خراب ہو تو وہ اسے سنبھال سکے۔" میں نے اپنی آواز اور لہجے کو بھاری بنا کے کہا۔

"آپ جیسا چاہیں حضور۔" کلثوم نے اپنی رضا مندی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر تم یہیں ٹھہرو، ہم خود شہزادی کے پاس اس کے کمرے میں جائیں گے۔ آؤ چلو۔" میں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا اور راکھی کو ہاتھ سے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

کلثوم نے شہزادی کے کمرے میں رات گزارنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیونکہ بظاہر میں ایک ستر پچھتر سال کا بوڑھا دکھائی دے رہا تھا اور وہ بھی جن اتارنے والا پیر بابا۔ اسے مجھ سے کیا خطرہ ہوسکتا تھا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے چلتے چلتے رک کر اور پیچھے مڑ کر کلثوم سے کہا۔

"تیرا گھر والا آج رات یہاں آنے والا تھا مگر اب وہ یہاں نہیں آئے گا اس کی جان کو خطرہ ہے۔"

"میں صدقے، میں واری حضور آپ اللہ والے ہیں۔ آپ کو سب کچھ معلوم ہے۔ ایسا ہی ہے۔ وہ آنے والے تھے مگر اب نہیں آئیں گے۔ حضور آپ ان کے لیے بھی دعا کریں کہ وہ سلامت رہیں۔ وہ میرے سر کا تاج ہیں۔ وہ ہیں تو میری بھی شان ہے۔ ان کے بہت سے دشمن ہیں۔ رب نہ کرے کبھی کوئی کاری وار...... میرے منہ میں خاک...... میں کیا کہنے لگی تھی۔"

وہ اور بھی نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی مگر میں اس کی بکواس سننے کے لیے مزید نہیں رکا اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ میرا بس چلتا تو میں اس کا سہاگ لوٹنے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگاتا۔ ابھی اس کی زندگی تھی جو نواب کو اس کی ضرورت ہے۔

میں شہزادی کے کمرے میں گیا تو میں نے راکھی کو باہر روکنے کا ارادہ کیا اور اپنی آنکھوں کو نیم وا کر کے زیر لب بڑبڑاتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا۔

اندر وسیع و عریض اور شاندار بیڈ پر شہزادی تکیے پر نیم دراز تھی اور کل والی ادھیڑ عمر ملازمہ آہستہ آہستہ اس کی پنڈلیوں سہلا رہی تھی۔

شہزادی نے مجھے دیکھا تو ملازمہ سے بولی۔ "تو جا، باہر جا کر بیٹھ۔" ملازمہ حکم سنتے ہی تیزی سے بیڈ سے اتر گئی اور میرے آگے سر کو اس قدر جھکایا کہ اس کی کمر ہی دہری ہوگئی۔ میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا تو وہ باہر چلی گئی۔ تو میں بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا اور نرم لہجے میں پوچھا۔

"کیا حال ہے شہزادی۔"

"ٹھیک ہوں۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"رات نیند تو اچھی آئی۔ اس نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا۔" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"تھوڑا سا کیا تھا لیکن آپ کے ہاتھ لگانے سے وہ بھاگ گیا۔" اس نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میرے ہاتھ لگانے سے۔" میں نے حیرت زدہ ہونے کی اداکاری کی۔ "میں نے تمہیں کہاں ہاتھ لگایا تھا۔" میں نے اپنی آنکھوں میں خمار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ "بس مجھے بہت سکون ملا تھا اچھا لگا تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ

آپ آج بھی۔"

"میں تو بوڑھا آدمی ہوں اور تمہیں ضرورت ہے ایک جوان مرد کی، بتاؤ میں کیا کروں۔" میں نے اس کا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور مخمور لہجے میں کہا۔

حیرت انگیز طور پر صرف میری خمار آلود آواز اور لہجے کو سن کر ہی اس کی آنکھوں میں نشہ سا تیرنے لگا۔ عورت کی جسمانی طلب کی اتنی شدت میں نے پہلی مرتبہ محسوس کی۔

"مجھے تو آپ بوڑھے نہیں لگتے۔ میرے لیے تو آپ مرد ہیں۔ صرف مرد۔" اس نے میرے قریب ہو کر پیاسے لہجے میں کہا۔

"کیا تمہیں صرف ایک مرد کی طلب ہے شہزادی۔" میں نے اپنی جانب کھینچ کر کہا تو وہ بے دم سی میری بانہوں میں گر گئی۔

میں نے بھڑے ہوئے کمرے کے دروازے پر ایک نگاہ ڈالی اور اسے اپنی بانہوں میں کس کر بڑھاپے کے چولے سے باہر نکل آیا۔

لمحوں ہی میں وہ بری طرح ہانپنے لگی۔ وہ مجھے کسی طرح بھی چھوڑنے پر راضی نہیں تھی۔ میرے خیال میں وہ ایک نفسیاتی مریضہ تھی۔ ایک مرتبہ میرے کلینک میں بھی ایسی ہی ایک جوان لڑکی آئی تھی۔

اس کے علاج کے دوران مجھے پتا چلا تھا کہ تنہائی اور ماں باپ کی بے جا پابندیوں کا شکار وہ لڑکی بے ہودہ ناولز اور گندی ویڈیو فلموں کی رسیا ہوگئی تھی اور پھر اپنی جنسی تسکین کے لیے وہ کسی حد تک جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ لیکن میں نے نفسیات کی رو سے اور دواؤں اور انجکشن کے ذریعے اس کا علاج کیا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہنے اور نماز کی پابندی کرنے اور قرآن اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعے کا مشورہ دیا تھا وہ صحت یاب ہوگئی تھی۔

افسانچہ

کل صبح کو تمہاری سالگرہ تھی۔ میں بڑی گرم جوشی سے کل کے لئے پروگرام سیٹ کر رہی تھی تم چپ چاپ سن رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے دونوں کی آنکھ لگ گئی۔ سپنوں میں بھی سالگرہ کی تیاریوں میں مصروف تھے ہم۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ میری آنکھ کھلی لیکن یہ کیا بستر تو خالی تھا۔ میں نے پریشان ہو کر آس پاس تمہیں آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ پا کر آخر مجھے بستر کو چھوڑنا ہی پڑا۔ باتھ روم سے لے کر گھر کے صحن تک میں نے تمہیں دیکھ لیا لیکن تمہارا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ مجھے رونا آ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے رات کو تم میرے پاس تھے پھر اچانک تم کہاں چلے گئے تمہیں کسی نے اغواء تو نہیں کرلیا۔ اس خیال کے آتے ہی زمین میرے پیروں تلے سرکنے لگی۔ مجھے یاد آنے لگے وہ دن جب کتنی مشکل سے میں نے تمہیں حاصل کیا تھا۔ سب گھر والوں کی مرضی کے خلاف کسی کو تم پر بھروسہ نہیں تھا۔ لیکن اب میں کیا کروں جوں جوں رات بیت رہی ہے میری پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ کل سالگرہ ہے اپنی سہیلیوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ تمہارے ساتھ بھلا کسی کو کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔ ہاں یاد آیا رات سونے سے پہلے ممی سے اس بات پر لڑائی ہو رہی تھی وہ تمہیں اپنے پاس سلانا چاہتی تھی اور میں اپنے پاس۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا تمہیں ممی کی بانہوں میں دیکھ کر میں چکرا گئی۔ اے میرے پیارے "آنچل" اگر کچھ دیر اور تم مجھے نہ ملتے تو نہ جانے کیا ہو جاتا!

(خواجہ عرفانہ محبوب، جتوئی)

اب ایسا ہی ایک کیس میرے سامنے پھر آ گیا تھا۔ شہزادی بھی بے جا پابندیوں، بھارتی فلموں اور تنہائی کی وجہ سے اس نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہوگئی

تھی۔ اس نے اپنے خیالوں میں کسی شخص کا تصور کر رکھا تھا۔ وہ خیالی تصور مجسم روپ دھار کر اس کے سامنے آتو جاتا تھا لیکن اسے جسمانی تسکین نہیں پہنچا سکتا تھا۔ بس اس طلب کی شدت ایک شدید دورے کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی اور جب کوئی اس سے مخاطب ہوتا تو اس کا خیالی تصور شاہ جنات کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا۔

دوسرے علاج کی غرض سے آنے والے بابا لوگ شریف آدمی ہوتے ہوں گے اور انہوں نے عملی طور پر ایسی کوئی کوشش نہیں کی ہوگی جیسی میں نے کی تھی۔

یہ ساری بات بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ شہزادی کی شخصیت پوری طرح قارئین کے سامنے واضح ہو جائے۔

"شہزادی ہوش میں آؤ' دیکھو یہ دن کا وقت ہے یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے آج رات میں یہیں رکوں گا پھر تم اپنے دل کی ہر خواہش پوری کر لینا۔" میں نے شہزادی کے ہانپتے ہوئے وجود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگی۔ "کیا دیکھ رہی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" اس کے لبوں سے سسکی سی نکل گئی۔

"میرا خیال ہے تمہیں آرام کی ضرورت ہے' تم سو جاؤ۔" میں نے کہا۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی۔ میں ابھی تو رات بھر سو کر اٹھی ہوں۔" اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تم لیٹو میں تمہیں سلاؤں گا۔" میں نے پیار سے چمکارتے ہوئے کہا تو وہ بچوں کی طرح سعادت مندی سے لیٹ گئی اور معصومیت سے ایک ہاتھ گال کے نیچے رکھ کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہی ہے لمحہ بھر کو تو میں گڑبڑا گیا کہ کہیں میرا میک اپ تو خراب نہیں ہو گیا۔

"اپنی آنکھیں بند کرو شہزادی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اور نہ جانے کیوں اس کے لب مسکرانے لگے۔

میں نے جھٹ جیب سے بھری ہوئی سرنج نکالی اور اس کے بازو میں سوئی انجکٹ کر دی۔ اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ سوئی کی چبھن کو محسوس کر کے اس کے لبوں سے ایک سسکاری نکل گئی اور دوسرا ہاتھ بے ساختہ بازو کی جانب جانے لگا۔ جسے میں نے فوراً تھام لیا دوائی کو سرعت سے بازو میں داخل کیا اور سوئی باہر نکال لی۔

"آپ نے مجھے سوئی لگائی ہے۔" اس نے پوچھا۔

"نن..... نہیں تو۔" میں نے کہا۔

تو وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"سچ سچ بتائیں کیا آپ کون ہیں؟"

لیکن نیند کی دوائی کا اثر اتنا شدید تھا کہ وہ میرا جواب سننے کی پوزیشن میں نہ رہی اور گرنے لگی۔

میں نے اسے سنبھال کر اور سیدھا کر کے لیٹایا اور اسے چادر اڑھا دی۔ پھر تیزی سے کمرے میں موجود سنگار میز کی جانب بڑھا اور اپنا جائزہ لیا میرا میک اپ بالکل ٹھیک تھا لیکن شہزادی نے انجکشن لگتے ہوئے محسوس کر لیا اور اسے میرے پیر فقیر ہونے پر شک ہو گیا۔ یہ بات میرے لیے پریشان کن تھی۔ اس لیے میں نے باہر بیٹھی راکھی کو اندر بلایا تو ساتھ بیٹھی ملازمہ بھی اٹھ کر اندر آنے لگی۔

"تم یہاں کس کی اجازت سے بیٹھی ہو' کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ جن ایک عورت سے اتر کر دوسری عورت پر آ جاتے ہیں۔ یہ تو ہماری

خاص مریدنی ہے اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا تم یہاں سے جاؤ۔" میں نے اسے زور سے ڈانٹا تو وہ خوف زدہ ہو کر اور توبہ توبہ کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

میں راکھی کو اندر کمرے میں لایا اور اسے ساری بات بتائی تو وہ بولی۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں یہیں اس کے پاس بیٹھی ہوں اس کے جاگنے کے بعد میں اسے سنبھال لوں گی۔"

"سوچ لو کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"ارے کچھ نہیں ہوگا یہ تو بتاؤ یہ کتنے گھنٹے تک جاگے گی۔" راکھی نے پوچھا۔

"کم از کم آٹھ گھنٹے تک۔" میں نے کہا۔

"پھر تم بے فکر رہو' ہم دونوں باہر چل کر بیٹھتے ہیں ذرا اپنی خاطر تواضع تو کروائیں۔ تم کلثوم سے کہہ دینا کہ تم نے عمل پڑھا ہے۔ اس لیے شہزادی پرسکون ہو کر سو گئی ہے۔" راکھی نے کہا اور ہم لوگ شہزادی کے کمرے سے باہر آ گئے۔ ویسے بھی میڈیکل کے پوائنٹ سے شہزادی کو پرسکون نیند کی شدید ضرورت تھی اور یہاں رہنے کے دوران مجھے شہزادی کو ہلکی اور بھاری ڈوز جو نیند کی دوا کی صورت میں دینی تھی سلانا تھا۔

کلثوم اس طریقہ سے بہت خوش تھی کیونکہ ان دو دنوں میں جب سے میں اس کے پاس آ رہا تھا شہزادی کو کوئی دورہ نہیں پڑا تھا اور وہ جو رات رات بھر جاگتی رہتی تھی اور اس پر جن سوار رہتا تھا اب پرسکون ہو کر سو رہی ہے۔ کلثوم نے ہماری خوب خاطر مدارات کی دوپہر کو میں ایک کمرے میں جا کر سو گیا۔ کیونکہ رات کو راکھی نے مجھے کم ہی سونے دیا تھا۔ شہزادی کی جانب سے میں بے فکر تھا کیونکہ وہ دوا کے زیر اثر گہری نیند سو رہی تھی اور ابھی اس کے بیدار ہونے میں چند گھنٹے باقی تھے۔ راکھی بھی میری شاندار مسہری کے قریب زمین پر بیٹھی اونگھ رہی تھی پھر وہ بھی نیند کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہیں لڑھک گئی۔

کلثوم نے شہزادی کے لیے پوچھا بھی کہ اسے دوپہر کے کھانے کے لیے جگا دیا جائے تو میں نے سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ اسے خود بیدار ہونے دینا اگر اسے جگایا گیا تو اس کی طبیعت خراب ہو جائے گی اور حقیقت میں ایسا ہی ہوتا بھرپور نیند اس کے تھکاوٹ زدہ اعصاب کے لیے بہت ضروری تھی۔

میری آنکھ کھلی تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے راکھی کو جھنجوڑ کر جگایا اور اسے کہا کہ وہ شہزادی کے کمرے میں جائے اور یہ کہے کہ وہ پیر صاحب کا بتایا ہوا ایک عمل پڑھنے جا رہی ہے اور کوئی اس کے کمرے میں نہ آئے تاکہ اگر شہزادی بیدار ہو اور وہ راکھی سے میرے بارے میں کوئی سوال کرے تو راکھی کسی بھی طرح مطمئن کر سکے۔

راکھی چلی گئی میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور راکھی کا انتظار کرنے لگا۔ ملازمہ نے کمرے میں آ کر جھانکا اور مجھے بیٹھا دیکھ کر ادب سے پوچھا۔

"اگر حضور عبادت سے فارغ ہو گئے ہوں تو شام کی چائے حاضر کی جائے۔"

لیکن میں دوپہر کو اچھا خاصا کھانا کھا چکا تھا صرف چائے کی خواہش تھی اس لیے چائے کا کہہ دیا لیکن چائے کے ساتھ اور بھی بہت سے لوازمات تھے۔ لیکن میں نے کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا سوائے چائے کے۔

مجھے بے چینی سے راکھی کا انتظار تھا کیونکہ میرے حساب سے تو اب تک شہزادی کو اٹھ جانا چاہیے تھا لیکن راکھی نہیں آئی حد یہ کہ رات کے

www.Paksociety.com

کھانے کا وقت ہو گیا۔

میں نے رات کا کھانا کھایا اور راکھی کو بلایا راکھی آئی اور آتے ہی مسکرانے لگی۔

"کیا بات ہے تم مسکرا کیوں رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیا جادو کر دیا ہے اس بڈھے نے شہزادی پر۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب۔ میں پریشان ہوں اور تمہیں شوخیاں سوجھ رہی ہیں۔" میں نے بگڑے تیور سے کہا۔

"مطلب یہ ہے کہ نیند سے جاگنے پر بھی شہزادی نے مجھ سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ سوائے اس کے کہ پیر صاحب کہاں ہیں تو میں نے کہا حویلی میں ہی ہیں دوسرے کمرے میں آرام کر رہے ہیں تو وہ بولی۔ وہ آج رات حویلی میں ہی رکیں گے نا۔ کہیں جائیں گے تو نہیں کیوں جب سے وہ آئے ہیں مجھے شاہ جنات نے تنگ نہیں کیا ہے۔ انہیں آج رات بھی میرے کمرے میں بلا لینا۔ تو میں نے کہا ہاں آج وہ تمہارے کمرے میں ہی عمل پڑھیں گے۔ مجھے امید ہے کہ تم جلد ہی ٹھیک ہو جاؤ گی یہ بڑے کراماتی پیر صاحب ہیں۔ بڑے بڑے جن ان سے پناہ مانگتے ہیں۔"

"بس، بس مجھے پتا ہے بس تم پیر صاحب سے یہ کہنا کہ آج رات وہ میرے کمرے میں ضرور آئیں شہزادی کے لہجے میں بے پناہ بے قراری چھپی تھی۔" راکھی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے راکھی کو اپنی اور شہزادی کی حرکتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا سوائے اس کے کہ اس کو انجکشن کا پتا چل گیا تھا کیونکہ میں یہ بات جانتا تھا کہ ایک عورت کی حیثیت سے وہ یہ بات قطعی برداشت نہیں کرتی۔

"شکر ہے اللہ کا کہ اس نے تم سے کچھ نہیں کہا اور مجھے پوری امید ہے کہ وہ کسی اور سے بھی کچھ نہیں کہے گی جو کچھ بھی پوچھے گی مجھ سے ہی پوچھے گی۔" میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"آج رات میں بھی تو ہوں تمہارے ساتھ اس کمرے میں۔" راکھی نے کہا۔

"نہیں تم باہر ہی ٹھہرنا ورنہ وہ مجھ سے سوال نہیں کر سکے گی اور اس کے علاج کے لیے اس کا مطمئن ہونا بہت ضروری ہے اور پھر تم یہ کیوں بھول رہی ہو کہ شہزادی ٹھیک ہو گئی تو آئندہ بھی اس حویلی میں آنے کے لیے ہمارا راستا کھلا رہے گا اور مجھے شیر افضل کو بھی ٹھکانے لگانا ہے۔ ابھی تو اس کی جان بخشی گئی ہے۔ لیکن اس کی جان لینے کا میرا ارادہ تو اٹل ہے۔" میں نے کہا تو وہ سر ہلانے لگی۔

راکھی کو باہر بھیج کر میں کمرہ بند کر کے لیٹ گیا تا کہ وہ لوگ سمجھیں کہ میں عشاء کی نماز پڑھ رہا ہوں۔ جب کہ یہ تمام عبادات میں مکمل طور پر ترک کر چکا تھا۔ اب مجھ میں اور ایک وحشی درندے میں کوئی فرق نہیں تھا میں آج جب اپنے اس وقت کی کیفیت کو سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ روح کانپ اٹھتی ہے اور میں روتے ہوئے بے ساختہ سجدے میں گر جاتا ہوں۔ میں اپنی زندگی کے اس آخری دور میں کہاں اور کیسے پہنچا اور کس طرح تبدیل ہوا یہ آپ آگے جان پائیں گے۔

رات کے گیارہ بجے جب حویلی میں سناٹا چھا گیا سارے ملازمین سونے کے لیے چلے گئے۔ صرف کلثوم اور اس کی خاص ملازمہ چنبیلی جاگ رہی تھی میں کمرے سے باہر نکل آیا اور شہزادی کے کمرے کی جانب بڑھا۔

شہزادی کے کمرے میں کلثوم راکھی اور چنبیلی موجود تھیں۔ شہزادی اس وقت نہا دھو کر بہترین لباس میں مزین تھی۔ اس کے لمبے گھنے اور سیاہ بال اس کی پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بستر پر لیٹی تھی مجھے دیکھ کر اس نے دوپٹا سر پر لے لیا اور سر جھکا لیا۔

"کلثوم تم نے اپنی بیٹی کی حالت دیکھی تمہیں کیا لگتا ہے۔" میں نے کلثوم کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"حضور میری سات پشتیں بھی آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گی۔ میں آپ کے در کی لونڈی ہوں۔ میری شہزادی کی طبیعت بہت اچھی ہے۔ ماشاء اللہ اس کے چہرے پر کچھ رونق بھی آ گئی ہے۔ ورنہ یہ تو کملایا ہوا پھول ہو گئی تھی۔" کلثوم نے پر مسرت لہجے میں کہا۔

"ہاں بس دو ایک دن کی بات اور ہے پھر وہ مردود اس کی جان ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا۔" میں نے دبنگ لہجے میں کہا۔

"میرے لیے کیا حکم ہے حضور۔" کلثوم نے پوچھا۔

"تم جا کر آرام سے سو جاؤ، ہم آج کی ساری رات اسی کمرے میں عمل پڑھیں گے۔ شہزادی کی طرف سے تم بے فکر رہو یہ سوتی رہے گی اور پھر راکھی بھی تو ہے اگر کوئی بات ہوئی تو یہ ہے نا سنبھالنے کے لیے۔" میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"حضور کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔" کلثوم نے جانے کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"صرف پانی رکھوا دو۔" میں نے بند آنکھوں کے ساتھ کہا۔

"پانی موجود ہے حضور آپ کہیں تو اور......!"

"بس۔" میں نے ایک بار پھر بھاری اور دبنگ لہجے میں کہا۔ "اب تم جاؤ وقت ضائع نہ کرو۔ ہمارا ٹائم

aanchal.com.pk

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں



پرچہ نہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

www.Paksociety.com

ضائع ہو رہا ہے۔"

کلثوم اور چنبیلی کے جانے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر انتظار کیا اس دوران ہم تینوں خاموش رہے۔ پھر میں نے راکھی کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا اور شہزادی کی جانب دیکھتے ہوئے کمرے کا دروازے بند کر کے کنڈی لگا دی۔ شہزادی میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس نے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

میں کنڈی لگا کر پلٹا تو وہ بولی۔ "یہ کنڈی اگر آپ نہ لگاتے تو میں لگا دیتی۔" میں اس کے نزدیک جا کر بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیسی ہو۔"

"آپ بہت بڑے پیر ہیں اس لیے امید کرتی ہوں کہ آپ جھوٹ بھی نہیں بولتے ہوں گے آپ وعدہ کریں کہ میں جو کچھ پوچھوں گی آپ اس کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دیں گے۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا اور ساتھ ہی میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر سہلانے لگی۔

"تم کیا پوچھنا چاہتی ہو۔" اس کے اندر اتنی بڑی تبدیلی کو محسوس کر کے مجھے بے چینی سی ہوگئی۔

"یہی کہ آپ سچ سچ بتائیں کہ آپ کون ہیں اور اس حویلی میں کس نیت سے آئے ہیں۔ ایک بات اور وہ یہ کہ آپ ایک بوڑھے نہیں جوان آدمی ہیں۔ آخر ایک بوڑھے سے پیر کا بھیس بدل کر اس حویلی میں آنے کی آپ کو کیا ضرورت محسوس ہوئی۔" وہ بڑی جرأت مندی اور خود اعتمادی سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال پوچھ رہی تھی۔

میرے اندر بڑی ہلچل مچ رہی تھی۔ اور مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ سے ٹوٹ رہے تھے۔ میں جسے ایک ان پڑھ دیہاتی اور نفسیاتی مریضہ سمجھ رہا تھا وہ تو چھپی رستم نکلی اور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن میری زبان ہی گنگ ہوگئی۔ مجھے اس بات کی کوئی ٹینشن نہیں تھی کہ وہ میری اصلیت جان چکی ہے یہ بات جاننے کے لیے اس سے کیا کہنا ہے یہ بات میں پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ حیرت مجھے اس کی جرأت اور بہادری پر تھی۔

"آپ خاموش کیوں ہیں جواب کیوں نہیں دیتے۔" اس نے میری خاموشی پر بے چینی سے کہا۔

"میں تمہارے سارے سوالات کے جواب ضرور دوں گا لیکن پہلے تم میرے چند سوالات کے جوابات دو اور اس ضمن میں، میں بھی تم سے امید کرتا ہوں کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گی۔" میں نے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

"پوچھیے۔" اس نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔ اس کا لہجہ اور انداز بھی دوستانہ تھا۔

"تم نے یہ اپنے اوپر جن آنے والا ڈرامہ کیوں کیا ہے اور وہ دورہ پڑنا مردانہ آواز میں باتیں کرنا۔ یہ سب کیا ہے کیوں اپنے والدین کو پریشانی اور دکھ میں مبتلا کیا ہوا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"اگر آپ پریشانی اور دکھ کی بات کرتے ہیں تو والدین کا نام ایک ساتھ مت لیں۔ یعنی والدین میں تو دونوں ہی آجاتے ہیں۔ ماں اور باپ لیکن میں صرف اپنی ماں کو جانتی ہوں اس کے پیار اس کی محبت کو جانتی ہوں اور جب باپ کا تصور آتا ہے تو وہ ایک ظالم اور بے حس انسان ہے۔ عیاش انسان ہے جسے صرف اپنی خواہشات کی تکمیل یاد رہتی ہے۔ دوسروں کے جذبات اور احساسات کا اسے قطعی احساس نہیں ہے اب وہ دوسرا انسان خواہ اس کی بیٹی ہو یا بیٹا اسے کسی سے محبت نہیں لیکن ہاں اگر کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو وہ ہے دولت روپیہ پیسہ زمینیں اور شہر کی بے ہودہ عورتیں۔" باپ کا ذکر کرتے ہوئے اس کا

علم مومن کی میراث ہے یہ جہاں سے ملے اسے حاصل کرو (حدیث)

تشنگانِ علم کیلئے محترم مشتاق احمد قریشی کی
جانب سے ایک اور تحفہ، قرآن آسان تحریک کے تحت



اللہ کون ہے اور کیوں ہے جانیے اور سمجھیے صرف کلام اللہ کی روشنی میں
بقول ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر یہ کتاب بطور خاص
ان لوگوں کیلئے ہے جو عصری تعلیم کے دلدادہ اور سائنسی ترقی کی چمک سے
چندھیائے ہوئے اور اللہ کی صفت خالقیت، مالکیت اور رزاقیت سے ناآشنا
بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ہی منکر ہیں

اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنوی روڈ اردو بازار لاہور۔ 0423-7116257
نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔ 0213-5620771/2

لہجہ حد درجہ زہر آلود ہوگیا۔ میں سراسر اس کی باتوں سے اتفاق کرتا تھا اس نے شیر افضل کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے یہ تمہارا اور تمہارے باپ کا معاملہ ہے۔ لیکن مجھے اپنے سوال کا جواب اب بھی نہیں ملا۔'' میں نے کہا تو اس نے جواب دینے کے بجائے اپنا سر جھکالیا اور خاموش ہوگئی۔

''شہزادی۔'' میں نے اصلی آواز میں اسے پیار بھرے لہجے میں پکارا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا اور بے قرار لہجے میں بولی۔

''بالکل یہی آواز بالکل یہی انداز پیار بھرا۔ اس کا بھی تھا۔''

''کس کا؟ کون تھا وہ......؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''اسی کا جو میرے خوابوں اور خیالوں میں آتا تھا۔ وہ بالکل اسی طرح مجھے پکارتا تھا جس طرح آپ نے ابھی پکارا۔'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا پھر میرے نزدیک آکر اسی کیفیت میں بولی۔

''آپ ایک بار پھر سے پکاریے نا مجھے۔''

''شہزادی کیا تم نے کسی خیالی شخصیت کو اپنے خیالوں میں بسایا ہوا تھا۔'' میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں تو اور کیا کرتی۔'' اس نے دکھی لہجے میں کہا پھر مزید میرے قریب کھسک آئی اور میرے ہاتھوں کو ایک بار پھر اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولی۔

''آپ کو پتا ہے میری ساری سہیلیوں کی شادی ہوگئی ہے۔ وہ سب دلہنیں بن کر بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ ان سب کے دلہا انہیں بہت پیار کرتے ہیں۔ میری سہیلیوں نے وہ ساری باتیں مجھے بتائیں جو ان کی شادی کی رات ان کے دلہا نے ان سے کی تھیں۔ پھر جب بھی میری سہیلیاں آتیں وہ اپنے دلہا کی ساری باتیں مجھے بتاتیں کہ وہ کس طرح ان سے پیار کرتے ہیں۔ وہ ان کے لیے بجتی سنورتی ہیں تو وہ کس طرح ان کی تعریف کرتے ہیں اور پھر ان کے اتنے ڈھیر سارے پیار کے نتیجے میں ان کے ہاں اولاد بھی پیدا ہوئی وہ ماں بن گئیں ہیں۔ کوئی موٹی اور بھدی ہوگئی ہے لیکن ان کے پیار میں کمی نہیں آئی۔ مجھ سے زلیخا کہہ رہی تھی کہ جب سے ہمارا کاکا پیدا ہوا ہے۔ شوکت کا پیار مجھ سے اور بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ وہ ہر بار آکر مجھ سے پوچھتی ہے کہ شہزادی تیرا بیاہ کب ہوگا۔ تو تو اتنی حسین اور خوب صورت ہے کہ تیرا دلہا تو بس تجھے تکتا ہی رہے گا اس کا پیار تیرے ساتھ کبھی کم نہیں ہوگا پھر تیرا بیاہ کیوں نہیں ہو رہا۔ دیکھ ہمارے تو کئی بچے بھی ہوگئے اور تیرا تو بیاہ بھی ابھی تک نہیں ہوا کیا تیرا جی نہیں چاہتا کہ تیرا دلہا بھی تیری بارات لے کر آئے اور تجھے دلہن بنا کر اپنے گھر لے جائے۔ تجھے تو پتا ہی نہیں ہے کہ بیاہ کے بعد زندگی کتنی حسین ہو جاتی ہے مرد کا پیار عورت کو اور بھی حسین بنا دیتا ہے۔

اب میں کسی کو کیا بتاؤں کہ میرے خاندان میں کوئی مجھے بیاہنے نہیں آئے گا۔ کیونکہ وٹہ سٹہ کرنے کے لیے میرا کوئی بھائی نہیں ہے اور بنا وٹے سٹے کے میرا باپ مجھے نہیں بیاہے گا۔

اپنی سہیلیوں کی باتیں سن سن کر میرا دماغ سنسنانے لگتا میرا بھی دل چاہتا تھا کہ کوئی میرا بھی تو ہو جو مجھ سے پیار کی باتیں کرے میری راتیں رات بھر اس بڑے سے نرم بستر پر اس طرح گزرتی ہیں جیسے اس بستر میں کانٹے اگے ہوں۔ میرے جسم کا انگ انگ ایک مرد کے لمس کو محسوس کرنا چاہتا ہے۔ میری پیاس بڑھتی چلی گئی۔

ہار میرے خیالوں نے ایک تصوراتی مرد کی شکل ۔ وہ مجھ سے پیار بھری باتیں کرتا ہے لیکن جب اسے چھونا چاہتی ہوں تو وہ میرے ہاتھ ہی نہیں ۔ جب میری پیاس بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو اپنے حواس کھونے لگتی ہوں۔ چیختی چلاتی ہوں۔ مجھے اپنے قریب آنے والی ہر عورت سے نفرت محسوس تی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ان سب کے گلے دبا ڈالوں۔ ان میں کوئی مرد کیوں نہیں ہے۔ مجھ سے پیار کرنے والا یہ سب یہ سمجھنے لگے کہ مجھ پر جن عاشق ہو گیا ہے لیکن کوئی بھی مجھ پر عاشق نہیں ہوا کاش کوئی جن ہی عاشق ہو جاتا۔

لیکن کل جب آپ آئے تو میں بے قابو ہوگئی۔ میں بوڑھے اور جوان کی تمیز کھو بیٹھی۔ لیکن آپ نے جس طرح مجھے اپنے سینے سے لگایا۔ میرے ساتھ جو حرکتیں کیں انہوں نے مجھے بتا دیا کہ آپ بوڑھے نہیں جوان ہیں۔ میں نے آپ کے جسم کو چھو کر محسوس کیا ہے۔ آپ کی بدلی ہوئی آواز میں آپ کی جوانی کو محسوس کیا ہے آپ کے جوان جسم کی سختی کو محسوس کیا ہے۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔'' اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ ''آپ مجھے اپنی حقیقت بتا دیں۔ میرے دل کی پیاس بجھا دیں۔'' وہ میرے آگے گڑگڑانے لگی گویا اس معصوم لڑکی نے میرے کام کو میرے لیے بے انتہا آسان کر دیا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ تو ہمدردی تھی اگر اس وقت اس کے سامنے شاہ زمان ہوتا تو وہ اس کو سمجھاتا اور دواؤں سے اس کا علاج کرتا لیکن اس وقت شاہ زمان نہیں شمروز تھا۔ جو شیر افضل کے لیے سرتاپا انتقام تھا۔ انتقام کی جو آگ آپ کے اندر بھڑکتی ہے۔ وہ بڑی ظالم ہوتی ہے اور پھر اس آگ کی زد میں جو چیز بھی آئے وہ اسے جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ میں نے شہزادی کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگالیا۔ وہ جیسے میرے اندر جذب ہونے لگی۔ میں نے جذبات سے بے خود ہو کر اس کی ریشمی زلفوں کو چوما اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم مجھ سے میری حقیقت پوچھ رہی ہو تو میری حقیقت یہ ہے شہزادی کے میں تمہارا عاشق ہوں۔ گزشتہ تین سالوں سے میں تمہارے عشق کی آگ میں جل رہا ہوں۔ لیکن میرا جرم یہ ہے کہ میں ایک غریب لڑکا ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتا تھا۔ ایک دن میرے بابا میرا رشتا لے کر تمہارے باپ کے پاس آئے لیکن اس نے نہ صرف میرے بابا کو بے عزت کر کے اپنے حجرے سے نکال دیا بلکہ مجھے بھی اپنے پالتو کتوں سے بہت پٹوایا۔ میں کئی روز تک اسپتال میں پڑا رہا لیکن اتنی مار کھانے کے باوجود میرا پیار تمہارے لیے کم نہیں ہوا بلکہ اور بڑھتا چلا گیا۔

اب مجھے تمہارے بارے میں معلوم ہوا تو میرے دماغ نے تم سے ملاقات کرنے کا اچھا بہانہ سوچا اور میں یہ بہروپ دھار کر تم سے ملنے کے لیے آگیا۔ تم میری محبوبہ ہو اور میں تمہارا محبوب ہوں۔ کہتے ہیں نا کہ اگر پیار سچا ہو تو اسے حاصل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا دیکھ لو میں بھی آخر تم تک پہنچ ہی گیا۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کے ملیح چہرے کے کئی بوسے لے ڈالے۔

''ہائے ربا آپ سچ کہہ رہے ہو۔'' اس نے خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

''بالکل سچ میری جان۔'' میں نے اس کے نرم د گداز لبوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے۔'' اس نے بے خودی میں آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''محبوب۔'' میں نے کہا۔

"محبوب۔" اس نے اس طرح میرا نام دہرایا جیسے اس کے منہ میں شہد گھل گیا ہو۔

"تم مجھے اپنا اصل چہرہ تو دکھاؤ میرے محبوب۔" اس نے میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"فی الحال نہیں دکھا سکتا۔ اگر یہ میک اپ اتر گیا تو تمہاری ماں سمجھ جائے گی پھر بہت برا ہوگا۔ میں نے بہت سارے پیسے خرچ کر کے یہ میک اپ کروایا ہے۔" میں نے کہا اور اسے محبت کے سبق پڑھانے لگا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی وہ میرے سامنے ایک کھلی کتاب بن گئی اور میں نے اس کتاب کا ایک ایک لفظ حفظ کر لیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے اس پر لطف کھیل کے بعد وہ بے سدھ ہو گئی۔ میں نے سب سے پہلے آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا۔ میں گھبرا رہا تھا کہ کہیں شہزادی کے جنون نے میرا بھید تو نہیں کھول دیا۔ میں اس میک اپ مین کامران کے فن کا قائل ہو گیا۔

اس اطمینان کے بعد میں نے شہزادی کے بستر کا جائزہ لیا سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد میں نے ایک چادر زمین پر بچھائی اور لیٹنے لگا اچانک کمرے میں لگی کنڈی کا خیال آیا تو میں نے دروازے کی کنڈی کھول کر باہر جھانکا مگر دور دور تک مجھے راکھی دکھائی نہیں دی میں نے دروازہ پورا کھول دیا اور زمین پر بچھی چادر پر لیٹ کر سو گیا۔

لیٹ کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک طویل سانس لی۔ مجھے اپنے اندر ایک اطمینان سا ایک خوشی سی اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کس قدر گھٹیا اور ذلیل انسان تھا۔ اپنے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے میں نے ایک معصوم لڑکی کی عزت کو داغ دار کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ شیر افضل کے ظلم کا تو وہ بھی شکار ہوئی تھی۔ پھر میں نے کیوں اس پر ظلم کیا۔ میرے اندر کا وہ اچھا انسان میں نے ڈانٹ پھٹکار کر سلا دیا تھا۔ سہمے سہمے میں بول رہا تھا۔

میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ شہزادی نے اپنی پوری خوشی اور آمادگی سے خود کو میرے حوالے کیا تھا۔

میں نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس اچھے اور سہمے ہوئے انسان کو ڈانٹ دیا۔ اور اس سے پہلے کہ میرے اندر یہ جنگ طول پکڑتی میں شہزادی کے کمرے سے نکل کر سیدھا اس کمرے کی جانب آیا۔ جہاں دوپہر کو میں نے آرام کیا تھا۔ وہاں میں نے راکھی کو زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ بے سدھ سو رہی تھی۔ میں چپ چاپ مسہری پر لیٹ گیا اور سو گیا۔

صبح راکھی کے جگانے پر میری آنکھ کھلی۔ میں اور سونا چاہتا تھا اس لیے راکھی سے جھنجلا کر کہا۔ "کیا بات ہے سونے دو مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"بعد میں سوتے رہنا نواب کا فون آیا تھا وہ تمہیں واپس بلا رہا تھا۔" اس نے کہا۔

"نواب کا فون۔" نواب کا نام سنتے ہی میری ساری نیند لمحہ بھر میں غائب ہو گئی۔ "کیا کہہ رہا تھا۔" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"کہہ رہا تھا کہ فوراً واپس آ جاؤ ایک ضروری کام ہے۔" راکھی نے کہا۔

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے میرا کام تو ہو بھی نہیں سکتا۔ واپس چلتے ہیں۔" میں نے آمادگی ظاہر کی۔ پھر یہ خبر حویلی میں پھیل گئی کہ پیر صاحب واپس جانا چاہتے ہیں۔ کلثوم نے سنا تو دوڑی چلی آئی اور بولی۔

"حضور کیا خطا ہو گئی سنا ہے آپ واپس جا رہے ہیں۔ ابھی تو شہزادی کا علاج بھی پورا نہیں ہوا۔ آپ تو کہہ رہے تھے دو تین دن لگیں گے۔"

"ہم یہی سمجھتے تھے لیکن اب وہ ٹھیک ہو گئی ہے ہمیں واپسی کا حکم ملا ہے تو ہم مزید یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔" میں نے بارعب لہجے میں کہا۔

"جو آپ بہتر سمجھیں۔" کلثوم نے کہا۔

میں اور راکھی جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک شہزادی کے کمرے کی جانب سے ایک شور سا اٹھا ملازمائیں اور کلثوم گھبرائی ہوئی وہاں دوڑی بھاگی جا رہی تھیں۔

"راکھی ذرا جا کر تو دیکھو کہ کیا معاملہ ہے۔" میں نے فکر مند لہجے میں کہا تو راکھی بھی تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ لمحہ بھر کو میں پریشان ہو گیا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ کیا کسی کی تیز نگاہوں نے گزری رات کی واردات کو محسوس تو نہیں کر لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں راکھی لوٹ آئی اور اس نے بتایا کہ شہزادی کو دوبارہ دورہ پڑ گیا ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ کلثوم نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کی ہے کہ میں تمہیں آج جانے سے روک لوں اس کا کہنا ہے کہ شہزادی ابھی ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔

"کیا مصیبت ہے یار۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "تم نے اس کا علاج کیا کیا تھا کیا رات کو نیند کا انجکشن نہیں دیا تھا۔" راکھی نے پوچھا۔

"ارے یار وہ ویسے ہی بہل گئی تھی اور سونے لگی تھی اس لیے انجکشن نہیں دیا تھا۔ اچھا چلو چل کر دیکھتے ہیں۔" میں نے کہا اور راکھی کے ساتھ شہزادی کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اندر کا منظر بڑا عجیب تھا۔ شہزادی کے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ہونٹوں کے کناروں سے رال بہہ رہی تھی چہرہ وحشت زدہ تھا۔

"حضور میری بچی کو بچا لیجیے آپ کو اللہ کا واسطہ۔" مجھے دیکھتے ہی کلثوم میرے پیروں پر جھک گئی وہ بری طرح رو رہی تھی اور ہاتھ پاؤں جوڑے گڑگڑا رہی تھی۔

"ہمارے جانے کا سنتے ہی واپس آ گیا خبیث ٹھہر جا ہم تیرا وہ حشر کریں گے کہ تو کسی قابل نہیں رہے گا۔" میں نے بارعب لہجے میں آنکھیں نکال کر کہا پھر کمرے میں موجود دوسری ملازماؤں اور کلثوم راکھی سب کو مخاطب کر کے کہا کہ سب کمرے سے دور چلی جائیں ہم اکیلے ہی اس سے نمٹنا چاہتے ہیں۔

میرا حکم سنتے ہی سب تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ایک حیرت انگیز بات میں نے یہ دیکھی تھی کہ حویلی کے اندر کے اس حصے میں کوئی مرد ملازم نہیں آتا تھا۔ شیر افضل کا سختی کے ساتھ حکم تھا کہ حویلی کے زنان خانے میں کوئی مرد داخل نہیں ہوگا شاید یہی وجہ تھی کہ شہزادی کو سوائے عورتوں کے چہروں کے کسی مرد کا چہرہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ عورت کے جذبات بالکل اس ہانڈی میں پکنے والے دودھ کی مانند ہوتے ہیں کہ اگر ڈھکنا پورا بند کر دیا جائے تو دودھ ابل ابل کر باہر گرنے لگتا ہے۔ آگ جلے اور دودھ نہ ابلے یہ ناممکن ہے۔

سب کے باہر جاتے ہی میں نے شہزادی کے قریب بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔ تو وہ تیزی سے اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اور میرے سینے سے اپنا چہرہ رگڑتے ہوئے بولی۔

مجھے پتا چلا ہے کہ تم واپس جا رہے ہو میں تمہیں جانے نہیں دوں گی تم یہیں رہو حویلی میں اس روپ کے ساتھ۔ لیکن یہاں سے مت جاؤ۔ اگر تم چلے گئے تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ مر جاؤں گی۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو شہزادی میں اس

طرح کب تک رہ سکتا ہوں۔ میرا میک اپ زیادہ دن تک نہیں چل سکتا۔ اس لیے میں واپس جا رہا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں دوبارہ لوٹ آؤں گا۔

"اچھا ٹھیک ہے چلے جانا لیکن آج رات اور رک جاؤ۔ ابھی تو ہم نے پیار بھری باتیں بھی نہیں کیں۔ رات کو ذرا دیر کو آنکھ لگ گئی تھی۔ اور جب جاگی تو تم کمرے میں نہیں تھے۔ پھر مجھے نیند نہیں آئی اور ابھی چنبیلی نے بتایا کہ تم واپس جا رہے ہو تم مجھ سے ملے بنا کچھ کہے بنا ہی واپس جا رہے تھے میں نے اس لیے ایسا کیا تھا کہ تم میرے پاس واپس آسکو اور میں تم سے بات کرسکوں اگر میں ایسا نہ کرتی تو تم تو چلے ہی گئے تھے۔"

میں عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ پھر سوچا کہ ٹھیک ہے میں فہیم کو فون کر کے کل جہاز کی سیٹیں کروا لیتا ہوں۔ نواب سے اپنی خرابی طبیعت کا بہانہ کر دوں گا۔

میں نے شہزادی کو تسلی دی اور یقین دلایا کہ میں آج نہیں جاؤں گا کل جاؤں گا۔ لیکن اس مرتبہ وہ کوئی ایسی حرکت کر کے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ میرے یقین دلانے پر وہ راضی ہو گئی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ آنکھیں بند کر کے پرسکون ہو کر لیٹ جائے تھوڑی دیر کے بعد اٹھ جائے اور بالکل ٹھیک ٹھاک رہے۔

وہ لیٹ گئی تو میں باہر نکل گیا۔ کمرے سے تھوڑے فاصلے پر ساری عورتیں موجود تھیں۔ میں دھیمی اور تھکی ہوئی چال چلتا ہوا ان کے قریب گیا اور اپنا ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ شیطانوں کا استاد معلوم ہوتا ہے۔ اس سے جھگڑتے ہوئے ہمارا سر دکھنے لگا ہے۔ فی الحال تو ہم نے اسے بھگا دیا ہے۔ شہزادی سو گئی ہے۔ اٹھے تو ناشتہ کروا دینا آج رات پھر عمل پڑھنا پڑے گا"

کہتے ہوئے میں اپنے کمرے کی جانب بڑھتے کلثوم اور چنبیلی تو دبے پاؤں شہزادی کے کم
کی جانب بڑھ گئیں۔ اور راکھی میرے ساتھ آ اندر آ کر میں نے سب سے پہلے فہیم کو فون کیا تو نے بھی مجھے یہی بتایا کہ نواب نے مجھے فوری طو واپس بلایا ہے میں نے جہاز کی سیٹوں کے لیے اس نے بتایا کہ صبح پانچ بجے کی فلائٹ سے اس سیٹ کنفرم کروالی ہے۔

"ارے یار تمہیں یہ بات مجھے پہلی، چاہیے تھی۔" میں نے صبح پانچ بجے کی سیٹ کا۔ غصے سے کہا۔

"شمروز بھائی نواب صاحب کے حکم کے با میں تو میں نے راکھی کو ایس ایم ایس کر دیا تھا۔ اور سو کہ آپ فوراً واپس جانا چاہیں گے اس لیے آپ سے پوچھے بنا سیٹ بھی کنفرم کروالیں۔" فہیم نے کہا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ ہمیں یہاں سے کتنے بج نکلنا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔

"کم از کم ایک بجے تو لازمی نکلنا ہوگا یہاں سے اسلام آباد جائیں گے ٹائم تو لگے گا۔" فہیم بولا۔

"ٹھیک ہے تم ہمارا سارا سامان ٹیکسی میں رکھ لے آنا اور ہمیں اسی جگہ پر ملنا جہاں اتارا تھا میں ا راکھی پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"آپ آج کیوں نہیں آرہے۔" فہیم نے پوچھا۔

"بس یار پھنس گیا ہوں ملوں گا تو بتاؤں گا۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں دن میں نہیں آسکتا۔" یہ کہہ کر میں نے موبائل فون آف کر دیا اور جیب میں ڈال لیا۔ راکھی میری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے مجھ سے مزید تفصیلات ان باتوں کی پوچھی جو میرے اور فہیم کے درمیان ہوئی تھیں۔ میں نے ساری باتیں بتا دیں۔

"کیا رات کو ایک بجے حویلی سے نکلنا ممکن ہوگا۔ ہم گیٹ پر موجود چوکیدار کی نگاہوں سے بچ کر کس طرح نکل سکتے ہیں۔" راکھی نے کہا۔

"ہمیں چھپ کر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یہ بات کلثوم کو پہلے ہی بتا دیں گے۔ بس تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو مجھے پتا ہے کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک بات سچ سچ بتاؤ تم اس پاگل لڑکی کو کیسے قابو کرتے ہو؟" راکھی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی میں ایک ڈاکٹر ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ مریض کو کیسے کنٹرول کیا جاتا ہے۔" میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

"ڈاکٹروں کے بارے میں تو یہ سنا ہے کہ وہ مرض کو کنٹرول کرتے ہیں اور تم مریض کو کر رہے ہو کیا چکر ہے آخر مجھے بھی تو پتا چلے۔ رات کو تنہائی میں تم نے کیا کیا تھا۔" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"کرنا کیا تھا اسے خاموشی سے انجکشن دیا تھا وہ سو گئی تو میں یہاں آگیا۔" میں نے کہا۔

"لیکن تم تو کہہ رہے تھے کہ وہ خود ہی سو گئی تھی انجکشن دینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔" اس نے کڑے تیور سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"افوہ۔" راکھی تم بھی ٹیپیکل بیویوں کی طرح جرح کر رہی ہو۔ ہاں یاد آیا وہ پہلے ہی سو گئی تھی۔ اب کوئی اور سوال مت پوچھنا میرا ویسے ہی میٹر گھوم رہا ہے۔" میں نے غصیلے لہجے میں کہا تو راکھی طنزیہ انداز میں مسکرانے لگی۔ پھر کندھے اچکا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ سارا دن میں نے کمرے میں سوتے ہوئے گزارا۔ کیونکہ آنے والی ساری رات مجھے جاگنا ہی تھا۔ راکھی بھی ایک دو مرتبہ ذرا دیر کو کمرے میں آئی اور چلی گئی۔ وہ میری خاص مریدنی تھی اور اسے میری خبر گیری کے لیے آنا ہی تھا۔

دیہاتوں میں اندھیرا پھیلتے ہی لوگ گھروں میں دبک جاتے ہیں۔ حویلی میں بھی اذان عشاء کے بعد چہل پہل معدوم ہو گئی۔ میں تھوڑی دیر کے بعد کمرے سے نکلا۔ تو کلثوم نے بتایا کہ شہزادی کے سر میں بہت درد ہے وہ سارا دن بہت بے چین رہی ہے۔ اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔ شاید آج رات کے عمل سے اس کی طبیعت بہتر ہو جائے۔

"ٹھیک ہو جائے گی تم فکر نہ کرو اور ہم جانے کے بعد دوبارہ بھی آئیں گے۔ ہمیں تو جب اوپر سے حکم ہوتا ہے تو حکم کی تعمیل ہم پر فرض ہوتی ہے۔ ہمیں یہاں رکنے کا حکم ہوا تو ہم یہاں آگئے اب واپسی کا حکم ہے تو ہمیں واپس جانا ہے۔ ہمیں آج دن میں ہی رخصت ہو جانا تھا لیکن صرف شہزادی کی وجہ سے ہم نے سوچا ہے کہ ایک بجے تک ہم اپنا عمل مکمل کر لیں گے اور رات ہی چلے جائیں گے۔"

"بڑی مہربانی ہے حضور میں ساری حیاتی حضور کی لونڈی بن کر رہوں گی۔" اس نے نیاز مندی سے اپنے ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکاتے ہوئے کہا۔ تو میں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور چند لمحوں تک رکھے رہا پھر شہزادی کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر پلٹ کر کہا۔

"تم یہیں رک کر ہماری واپسی کا انتظار کرو۔ آج کا عمل بڑا جلالی اور آخری عمل ہے۔ کوئی دخل اندازی نہ کرے ورنہ ہماری جان جانے کا اندیشہ ہے۔"

میں نے کہا اور کلثوم کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔ شہزادی کے کمرے میں گیا تو وہ بہت پژمردہ سی دکھائی دی۔

"کیا بات ہے شہزادی ایسی صورت کیوں بنا رکھی ہے۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ تا کہ تمہاری ماں بھی

خوش ہوجائے میں تمہیں دیکھنے کے بہانے دوبارہ آسکوں گا۔" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کرو محبوب کہ آج رات ہی چلے جاؤ۔" اس نے کہا اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آ گئی۔

"ہاں ہاں میں آج رات ایک بجے ہی چلا جاؤں گا۔ میرے بابا کی اچانک ہی بہت طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ انہیں اسپتال لے گئے ہیں اس لیے میرا جانا بہت ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

اچھا ایک منٹ رکو۔" یہ کہہ کر وہ بیڈ سے نیچے اتر گئی اور سیدھی الماری کی جانب بڑھی میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔

اس نے الماری کھولی اور اس میں سے ایک چھوٹی سی اٹیچی نکالی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے قریب آئی۔ میں بھی بیڈ سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔

"سنو میرے محبوب! میں اب تمہاری جدائی برداشت نہیں کرسکتی۔ ایک منٹ بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس حویلی کا مالک ظالم شیر افضل جو بد قسمتی سے میرا باپ ہے کبھی مجھے اور تمہیں ایک ہونے نہیں دے گا۔ اس لیے میں نے آج دن میں یہ پلان بنالیا تھا اس اٹیچی میں بہت کچھ ہے۔ چلو یہاں سے رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نکل چلتے ہیں۔"

لمحہ بھر کو میں بری طرح بوکھلا گیا میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شہزادی اس حد تک چلی جائے گی۔ وہ نرم و نازک خوب صورت مکھن اور ملائی جیسے جسم والی شہزادی مجھے بہت پسند آئی تھی۔ مگر میں اپنی اس پسندیدگی کو یہیں چھوڑے جا رہا تھا۔ میں نے ایک فیصلہ اور کیا تھا اور وہ یہ کہ شیر افضل کی جان لینے کے لیے اس حویلی میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ شہزادی کا کردار میرے لیے پراسرار ثابت ہو رہا تھا۔

اس خوب صورت لڑکی کے کردار اور شخصیت میں مجھے جھول نظر آیا جو مجھے قطعی پسند نہیں ایسے پھل کو بھوک کے وقت رغبت سے کھایا تو جاسکتا ہے۔ جو خود بخود آپ کی جھولی میں آن گرے۔ لیکن اس کی چاہ نہیں کی جاسکتی یہ بے وقوف لڑکی نہیں جانتی کہ میں کون ہوں کس طرح کا انسان ہوں اور میں کس نیت اور ارادے سے اس حویلی میں آیا تھا۔

وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے کے بے چین نقوش میں کچھ اور بے چینی نظر آ رہی تھی جب میں دیر تک کچھ نہ بولا تو وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم اٹھو نا محبوب کیا تمہیں میری کیفیت کا اندازہ نہیں ہے میرے اس اٹیچی کیس میں تقریباً پچاس لاکھ کا خزانہ موجود ہے۔ میں نے بابا کی ساری تجوری خالی کردی ہے۔ یہ خزانہ ہماری زندگی میں خوشیوں کے لیے کافی ہے۔ ہم اتنے دور دراز مقام پر نکل جائیں گے کہ کوئی ہماری گرد کو بھی نہ پاسکے گا۔ میں تو برقعے میں چہرے پر نقاب ڈال لوں گی اور تم اپنا یہ میک اپ اتار دینا کسی نے بھی تمہاری اصل صورت تو نہیں دیکھی ہے۔ تمہیں تو کوئی خطرہ نہیں ہوگا ہم فوراً ہی شادی کرلیں گے اور اپنی خوشیوں بھری زندگی کا آغاز کریں گے۔

اب اٹھو بھی میرے محبوب اس وقت سارے لوگ سو رہے ہیں۔ اگر کوئی جاگ گیا تو سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ میں پکڑی گئی تو پاپا میرا حشر تو برا کریں گے ہی ساتھ ہی تم جان سے جاؤ گے۔ کچھ مت سوچو بس اب اٹھ جاؤ۔"

میں بڑے ضبط سے اس کی ساری بکواس سن رہا تھا۔ آخر میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ لہجے میں خود بخود کرختگی سی آ گئی۔

"تم کیسی بیٹی ہو تمہیں اپنے ماں باپ کی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے تمہیں اتنے ناز و نعم سے پالا کل دن کی روشنی میں اپنا سر پکڑے بیٹھے ہوں گے۔ اس حویلی کے کونے کھدروں میں منہ چھپائے اپنی ذلت سے بچنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ میری وجہ سے میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں نے تمہاری عزت کی ہے۔ تم سے پیار کیا ہے تمہیں چاہا ہے شہزادی۔ یہ پچاس لاکھ تو کیا تم پچاس کروڑ بھی لاتیں تو میں تمہیں یوں رات کے اندھیرے میں اپنے ساتھ نہیں لے جاتا۔"

"بے شک وہ میرے والدین ہیں۔ انہوں نے مجھے پالا ہے۔ لیکن ان کی لالچ کی وجہ سے وہ میری زندگی تباہ کر رہے ہیں۔ جب انہیں میرے جذبات و احساسات کی پروا نہیں ہے تو میں کیوں ان کی عزت کی پروا کروں۔ میں بھی زندگی کے سارے رنگ دیکھنا چاہتی ہوں۔ جینا چاہتی ہوں۔ خوش ہونا چاہتی ہوں یہاں میں گھٹ گھٹ کر جی رہی ہوں۔ یہ گھر نہیں ایک قید خانہ ہے۔ سونے کا بنا ہوا پنجرہ ہے یہ میرا مقبرہ ہے۔ مجھے سونے کا کفن پہنا کر دفن کردیا گیا ہے۔" شہزادی نے زہر خند لہجے میں کہا۔

"تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے شہزادی اچھی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"تو پھر مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"تقدیر کے فیصلے کا انتظار اچھے وقت کا انتظار۔" میں نے کہا اور شہزادی میری صورت دیکھتی رہی پھر وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں نہ تو کوئی دیوانگی تھی اور نہ کچھ اور بلکہ ایک پیا بھرا انداز تھا ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ رونے لگی اب اس کی کیفیت عجب دیوانوں جیسی ہو رہی تھی۔ وہ ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ پھر بے ساختہ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"پلیز خود کو سنبھالو تمہیں اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کی کمر کو تھپتھپانے کے بعد اسے خود سے آہستگی سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے یہاں سے نکال کر لے جائیے۔ آپ کون ہیں کیسے ہیں میں نہیں جانتی۔ میں تو آپ کے اصلی چہرے سے بھی واقف نہیں ہوں۔ بس مجھے یہاں سے نکلنا ہے آپ کو اللہ کا واسطہ آپ مجھے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائیے۔" اس نے روتے ہوئے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"نہیں شہزادی میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔" میں نے کہا تو میرے سخت لہجے میں کہے گئے اس جملے کو سن کر بری طرح چونک پڑی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر زیر لب بولی۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"حقیقت ہے شہزادی لیکن فی الحال میں ایسا نہیں کرسکتا۔ کم از کم مجھے کوئی ایسا محفوظ ٹھکانہ تو تلاش کرلینے دو جہاں میں تمہیں اطمینان سے سب سے چھپا کر رکھ سکوں۔ ورنہ تو تمہارا ظالم باپ سردار شیر افضل ہمیں جلد ہی ڈھونڈ نکالے گا اور اس کے ہاتھ لگنے کے بعد نہ تم زندہ رہ سکوگی اور نہ ہی میں۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم ٹھنڈا کر کے کھائیں۔ میں تو تمہاری محبت میں دیوانہ ہوکر یہ سوانگ بھر کے یہاں

www.Paksociety.com

...یں تو میری محبت کا علم بھی نہیں تھا اور نہ ہی تم مجھے جانتی تھیں لیکن اب جب کہ میں نے تمہیں پالیا ہے تو اب میں خوش خوش یہاں سے جارہا ہوں اور تمہیں اپنا بنانے کے لیے انتظامات کرتا ہوں۔ جہاں تم نے اس جہنم میں اتنے دن گزارے ہیں وہاں تھوڑا سا صبر اور کرلو۔ میں جلد ہی آؤں گا میری جان۔'' میں نے جذباتی ہوکر کہا اور دیوانے عاشق کی طرح اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

میں نے اسے پیار سے تسلی دی تو وہ مطمئن ہوگئی۔ میں نے اس سے یہ جھوٹا وعدہ بھی کرلیا کہ میں اسے جلدی ہی لینے کے لیے بھی آؤں گا۔

شہزادی کی نم آلود آنکھوں کا الوداعی بوسہ لیتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔ سامنے ہی کمرے سے فاصلے پر مجھے راکھی اور کلثوم بے قراری سے ٹہلتی ہوئی نظر آگئیں۔ آہستہ روی سے چلتا ہوا ان کے نزدیک جانے لگا۔ مجھے آتا ہوا دیکھ کر وہ رک گئیں اور میری جانب دیکھنے لگیں۔ نزدیک پہنچنے پر مجھے ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑی چمپکی بھی دکھائی دے گئی۔

''میں نے کلثوم کو سلا دیا ہے تم مطمئن رہو اب وہ صبح تک آرام سے سوتی رہے گی اور ان شاء اللہ اب اسے وہ جن نامراد ستائے گا بھی نہیں۔ میں نے پکا انتظام کردیا ہے۔'' میں نے کلثوم کو مخاطب کرکے کہا۔

''بڑی مہربانی حضور، یہ لونڈی ہمیشہ آپ کی تابعدار .....!'' میں نے تیزی سے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور راکھی کو مخاطب کرکے کہا۔

''چلو ہمارے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔''

''جی۔'' راکھی نے نیاز مندی سے سر جھکا کر کہا اور میرے ساتھ چلنے لگی کلثوم ہمارے پیچھے پیچھے حویلی کے بڑے گیٹ تک آئی گیٹ پر موجود گارڈ نے بھی تابعداری سے سر جھکایا اور گیٹ کھول کر ادب سے کھڑا ہوگیا اور میں ان کی جانب دیکھے بنا باہر نکل گیا اور اندھیرے میں چلنے لگا۔

گیٹ بند ہونے کی آواز آئی تو میں نے اور راکھی نے تیز قدموں سے چلنا شروع کردیا۔ راستے میں راکھی نے وہ تھیلا مجھے دکھایا جو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور جس پر ابھی تک میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔

''یہ لو تمہاری امانت۔ کلثوم نے بہت منتیں کرکے مجھے دیا ہے کہ میں خصوصی طور پر تم سے درخواست کروں کہ تم اسے قبول کرلو کیونکہ بہ قول اس کے اگر وہ یہ تمہیں دیتی تو یہ تمہارے حضور گستاخی ہوتی اور تم اسے قبول نہ کرتے۔''

''کیا ہے اس میں۔'' میں نے تیز قدموں سے چلتے ہوئے کہا۔

''یہ تو میں نے بھی نہیں دیکھا۔'' وہ بولی اور تھیلا میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے تھیلا ہاتھ میں لے کر سوچا کہ گھر جاکر دیکھ لوں گا۔ میرے خیال کے مطابق اس میں رقم ہوسکتی تھی۔ بعد میں میرا خیال بالکل ٹھیک نکلا۔ اس میں اچھی خاصی رقم اور کچھ سونے کے زیورات تھے۔

ہم مقررہ جگہ پہنچے تو فہیم کو ٹیکسی سمیت موجود پایا۔ میں نے کلثوم کا دیا ہوا تھیلا اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ وہ اتنا بڑا تھیلا نہیں تھا کہ میری جیب میں نہ سما سکتا۔ یہاں سے جاتے وقت مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ شیر افضل کو زندہ چھوڑ کر جارہا ہوں اور قصوروار نواب تھا۔ نواب کو میں نے جو سمجھا تھا وہ وہ نہیں نکلا میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ راکھی کو مزید مٹھی میں لے کر اس سے نواب کی ذات کے وہ سارے راز اگلوا لوں گا جو اس نے مجھ سے فی الحال چھپا لیے

معروفِ مفسر، قرآن پاک کے طالب علم مشتاق احمد قریشی کی تازہ پر مغز تحقیق

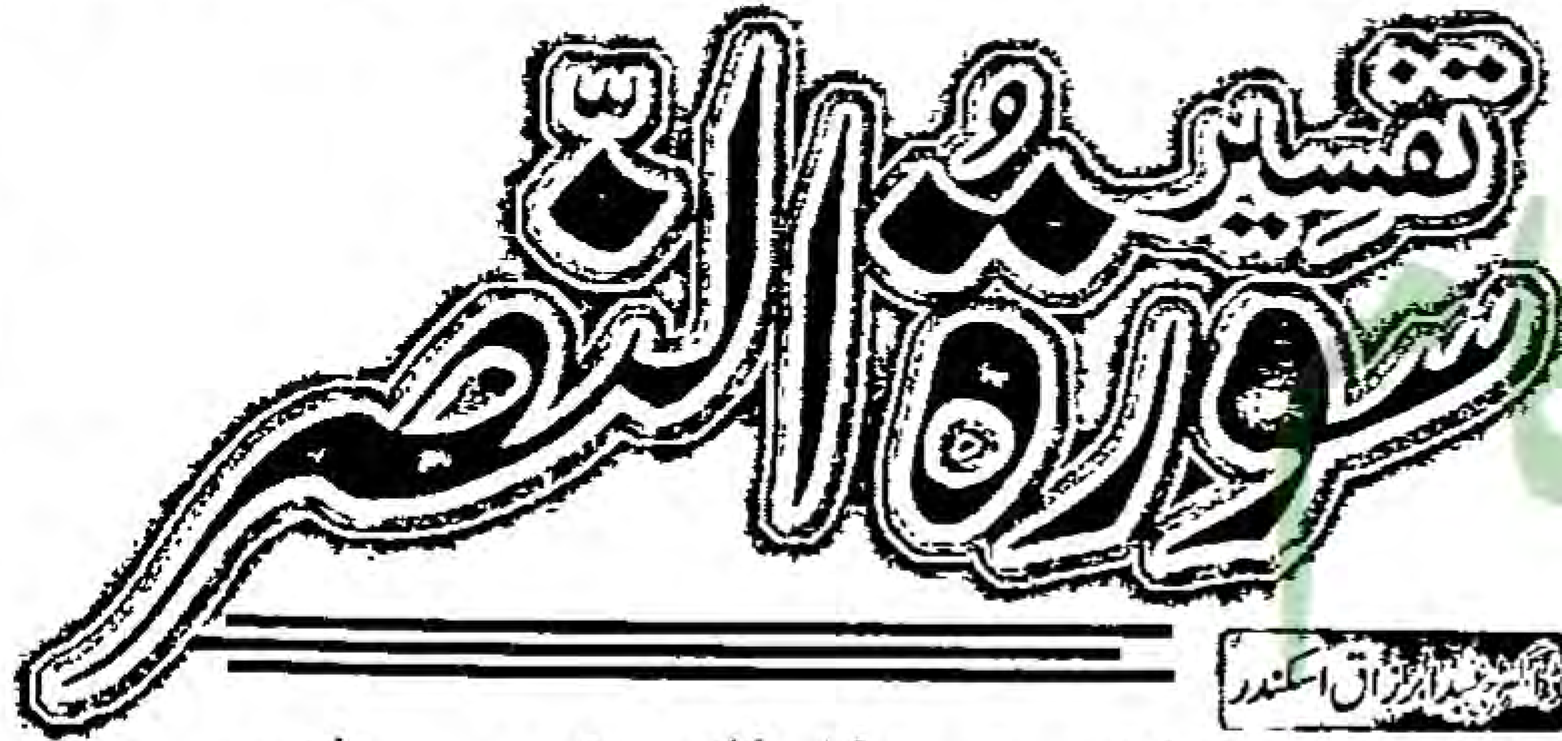
سورۃ النصر قرآن حکیم کی آخری سورتوں میں شمار ہوتی ہے

سورۃ النصر مکمل صورت میں آخری وحی کی گئی

یہ سورۃ حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں منیٰ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی

اس سورۃ میں فتح سے مراد فتح مکہ ہے

سورۃ نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے



ڈاکٹر محمد عبدالرزاق اسکندر

مسلم امہ کے نوجوانوں قرآنی تعلیمات کے مطابق عملی زندگی گزارنے کی ہدایت وراہنمائی فرمائے۔

حافظ فضل الرحیم اشرفی

''سورۃ النصر'' کا مسودہ میں نے مختلف مقامات سے پڑھا' دل خوش ہوا۔

مفتی خالد محمود

اللہ تعالیٰ ان کے اس تفسیری سلسلہ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائے، آمین۔

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

سورۃ نصر کے ایک ایک لفظ کے تحت مزید کئی آیات کی تشریح اور تفسیر پڑھنے کے لیے قاری کو مل جاتی ہے۔

اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنوی روڈ اردو بازار لاہور۔ 0423-7116257

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز، 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔ 0213-5620771/2

تک آ گیا تھا۔ تمہیں تو میری محبت کا علم بھی نہیں تھا اور نہ ہی تم مجھے جانتی تھیں لیکن اب جب کہ میں نے تمہیں پالیا ہے تو اب میں خوش خوش یہاں سے جارہا ہوں اور تمہیں اپنا بنانے کے لیے انتظامات کرتا ہوں۔ جہاں تم نے اس جہنم میں اتنے دن گزارے ہیں وہاں تھوڑا سا صبر اور کرلو۔ میں جلد ہی آؤں گا میری جان۔“ میں نے جذباتی ہو کر کہا اور دیوانے عاشق کی طرح اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

میں نے اسے پیار سے تسلی دی تو وہ مطمئن ہوگئی۔ میں نے اس سے یہ جھوٹا وعدہ بھی کرلیا کہ میں اسے جلدی ہی لینے کے لیے بھی آؤں گا۔

شہزادی کی نم آلود آنکھوں کا الوداعی بوسہ لیتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔ سامنے ہی کمرے سے فاصلے پر مجھے راکھی اور کلثوم بے قراری سے ٹہلتی ہوئی نظر آ گئیں۔ آہستہ روی سے چلتا ہوا ان کے نزدیک جانے لگا۔ مجھے آتا ہوا دیکھ کر وہ رک گئیں اور میری جانب دیکھنے لگیں۔ نزدیک پہنچنے پر مجھے ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑی چنبیلی بھی دکھائی دے گئی۔

”میں نے کلثوم کو سلا دیا ہے تم مطمئن رہو اب وہ صبح تک آرام سے سوتی رہے گی اور ان شاءاللہ اب اسے وہ جن نامراد ستائے گا بھی نہیں۔ میں نے پکا انتظام کردیا ہے۔“ میں نے کلثوم کو مخاطب کر کے کہا۔

”بڑی مہربانی حضور یہ لونڈی ہمیشہ آپ کی تابعدار ......!“ میں نے تیزی سے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا اور راکھی کو مخاطب کر کے کہا۔

”چلو ہمارے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔“

”جی۔“ راکھی نے نیاز مندی سے سر جھکا کر کہا اور میرے ساتھ چلنے لگی کلثوم ہمارے پیچھے پیچھے حویلی کے بڑے گیٹ تک آئی گیٹ پر موجود گارڈ نے بھی تابعداری سے سر جھکایا اور گیٹ کھول کر ادب سے کھڑا ہوگیا اور میں ان کی جانب دیکھے بنا باہر نکل گیا اور اندھیرے میں چلنے لگا۔

گیٹ بند ہونے کی آواز آئی تو میں نے اور راکھی نے تیز قدموں سے چلنا شروع کردیا۔ راستے میں راکھی نے وہ تھیلا مجھے دکھایا جو اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اور جس پر ابھی تک میری نگاہ نہیں پڑی تھی۔

”یہ لو تمہاری امانت۔ کلثوم نے بہت منتیں کر کے مجھے دیا ہے کہ میں خصوصی طور پر تم سے درخواست کروں کہ تم اسے قبول کرلو کیونکہ بقول اس کے اگر وہ یہ تمہیں دیتی تو یہ تمہارے حضور گستاخی ہوتی اور تم اسے قبول نہ کرتے۔“

”کیا ہے اس میں۔“ میں نے تیز قدموں سے چلتے ہوئے کہا۔

”یہ تو میں نے بھی نہیں دیکھا۔“ وہ بولی اور تھیلا میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے تھیلا ہاتھ میں لے کر سوچا کہ گھر جا کر دیکھ لوں گا۔ میرے خیال کے مطابق اس میں رقم ہوسکتی تھی۔ بعد میں میرا خیال بالکل ٹھیک نکلا۔ اس میں اچھی خاصی رقم اور کچھ سونے کے زیورات تھے۔

ہم مقررہ جگہ پہنچے تو فہیم کو ٹیکسی سمیت موجود پایا۔ میں نے کلثوم کا دیا ہوا تھیلا اپنے ڈھیلے ڈھالے کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔ وہ اتنا بڑا تھیلا نہیں تھا کہ میری جیب میں نہ سما سکتا۔ یہاں سے جاتے وقت مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ شیر افضل کو زندہ چھوڑ کر جارہا ہوں اور قصوروار نواب تھا۔ نواب کو میں نے جو سمجھا تھا وہ ’وہ‘ نہیں نکلا میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ راکھی کو مزید مٹھی میں لے کر اس سے نواب کی ذات کے وہ سارے راز اگلوالوں گا جو اس نے مجھ سے فی الحال چھپالیے

معروف مفسر قرآن پاک کے طالب علم مشتاق احمد قریشی کی تازہ پُر مغز تحقیق

سورۃ النصر قرآن حکیم کی آخری سورتوں میں شمار ہوتی ہے

سورۃ النصر مکمل صورت میں آخری وحی کی گئی

یہ سورۃ حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں منیٰ کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی

اس سورۃ میں فتح سے مراد فتح مکہ ہے

سورۃ نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”مجھے میری وفات کی خبر دے دی گئی ہے



ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر

مسلم لمہ کے نوجوانوں قرآنی تعلیمات کے مطابق عملی زندگی گزارنے کی ہدایت و راہنمائی فرمائے۔

حافظ فضل الرحیم اشرفی

”سورۃ النصر“ کا مسودہ میں نے مختلف مقامات سے پڑھا دل خوش ہوا۔

مفتی خالد محمود

اللہ تعالیٰ ان کے اس تفسیری سلسلہ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائے، آمین۔

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

سورۃ نصر کے ایک ایک لفظ کے تحت مزید کئی کئی آیات کی تشریح اور تفسیر پڑھنے کے لیے قاری کو مل جاتی ہے۔

اسلامی کتب خانہ الحمد مارکیٹ غزنی روڈ اردو بازار لاہور۔ 0423-7116257

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز 7 فرید چیمبر عبداللہ ہارون روڈ کراچی۔ 0213-5620771/2

ہیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے مجھے اس کی خواہش کو گاہے بگاہے پورا کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اس کی خواہش کو پورا کرنے کے بعد اس کا پورا پورا بدلہ بھی مجھے اس سے چاہیے تھا۔

فہیم کے گھر پہنچ کر میں نے اپنا سارا میک اپ اس لوشن کے ذریعے اتار دیا جو اس میک اپ مین نے مجھے دیا تھا۔

میک اپ صاف کرنے کے بعد میں نے غسل کر کے فہیم کا ایک شلوار قمیص کا سوٹ پہن لیا۔ فہیم کی بیوی نے جب میری اصل شکل دیکھی تو مارے حیرت کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آ...... آپ تو بالکل ہی بدل گئے...... او...... اور آپ بہت خوب صورت ہیں۔'' اس نے کہا تو راکھی کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی اور وہ بولی۔

''چلیں شمروز......!''

''ہوں چلو!'' میں نے ساری چیزوں کو سمیٹتے ہوئے کہا پھر اپنے کپڑے اور ساری چیزیں ایک شاپر میں ڈال کر فہیم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''انہیں اس طرح سے ضائع کرنا کہ ان کا وجود بھی باقی نہ رہے۔''

''آپ مطمئن رہیں۔'' فہیم نے میرے ہاتھ سے شاپر لیتے ہوئے کہا پھر ہم فہیم کی ٹیکسی میں آ بیٹھے اور فہیم نے ٹیکسی کو تیزی کے ساتھ ائرپورٹ کی جانب بھگانا شروع کر دیا۔



میں نے امی کی ڈائری ہاتھ میں لے لی' کمرے کا دروازہ لاک کرنے سے پہلے شمو بابا اور اماں حمیدہ سے کہا کہ مجھے ڈسٹرب نہ کیا جائے اور پھر دروازہ لاک کر کے میں نے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ ڈائری کھول لی۔

پہلے ہی صفحے پر اپنا نام دیکھ کر میں چونک گئی بڑے اور موٹے حرفوں میں ''سرمئی بائی'' لکھا تھا۔

سرمئی تو میرا نام ہے پھر اس پر لفظ بائی کیوں لکھا ہوا ہے' جہاں تک میرا خیال تھا بائی کا لفظ تو کوٹھے پر رہنے والی عورت کے لیے عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ میں چند لمحوں تک اسی الجھن میں مبتلا رہی پھر یہ سوچ کر صفحہ پلٹ دیا کہ آگے دیکھتی ہوں شاید اس لفظ ''سرمئی بائی'' کی تشریح سمجھ میں آ جائے۔

اندر امی کی تحریر (جس کو میں اچھی طرح سے پہچانتی تھی) تھی اور انہوں نے مجھے مخاطب کر کے لکھا تھا۔

''میری پیاری بیٹی سرمئی! میں جانتی ہوں کہ تم اس وقت میری یہ ڈائری پڑھ رہی ہو اور میں دنیا میں موجود نہیں ہوں کیوں کہ تم یہ ڈائری اس وقت پڑھ سکو گی جب میں دنیا سے چلی جاؤں گی۔

میری بیٹی تم نے ہوش سنبھالنے کے بعد مجھ سے بارہا ایسے سوالات کیے جن کے جوابات میں تمہیں نہیں دے سکی' میں تمہیں ان سوالات کے جوابات دے بھی کس طرح سکتی تھی جب کہ مجھے خود بھی ان کے جوابات نہیں معلوم تھے اور بہت سی باتیں ایسی تھیں کہ میں تمہارے سامنے ان کا اظہار نہیں کر سکتی تھی' میں یہ بات بھی جانتی تھی کہ تمہیں زندگی بھر وہ سوالات تنگ کرتے رہیں گے اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں اس ڈائری میں تمہارے سارے سوالات کے جوابات دے دوں اور پھر ان باتوں کے جاننے کے بعد میرا تم سے سامنا ہی نہ ہوا کیوں کہ اس وقت جب تم میری حقیقت جان لو گی میں تمہارا سامنا نہیں کر سکتی۔

تم نے مجھ سے بار بار یہ سوال کیا کہ تمہارا باپ ون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟ وہ کہاں رہتا تھا اور یہ می کہ تم کہیں میری ناجائز اولاد تو نہیں......!

تو میری جان! میں ان باتوں کے بارے میں اتنی ہی لاعلم ہوں جتنی کہ تم......! تم یہ پڑھ کر ضرور حیران ورہی ہو گی لیکن میں تمہیں اس سے بھی زیادہ حیرانی لی بات بتانے والی ہوں اور وہ یہ کہ ''میں تمہاری حقیقی ماں نہیں ہوں......''

تم چونک گئیں ناں یہ پڑھ کر...... ہاں میری بیٹی یہ ایک بہت تلخ حقیقت ہے کہ میں نے تمہیں جنم نہیں یا لیکن شاید کچھ دیر بعد جب تم میری حقیقت جان لو گی تو تمہارے منہ سے بے ساختہ ''شکر ہے اللہ'' کا لمہ نکل جائے گا کہ میں تمہاری حقیقی ماں نہیں ہوں۔''

یہاں تک پڑھنے کے بعد میں نے جھٹ ڈائری ند کر دی۔ یہ جملہ میرے لیے بہت بڑا شاک تھا کہ ی در حقیقت میری ماں نہیں ہیں اور آخر ان میں ایسی ون سی برائی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو میری ماں نہ ہونے کی صورت میں مجھے شکر اللہ ادا کرنے ے لیے کہا۔

میں وہ حقیقت جاننے سے بہت خوف زدہ ہی تھی' میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا پھر میں رونے لگی اور کافی دیر تک ڈائری پر سر رکھے روتی رہی اور روتے ے صرف اتنا کہتی رہی۔

''میں کچھ نہیں جانتی آپ ہی میری ماں ہیں۔ ی بہت پیاری ماں...... جنہوں نے اتنے پیار ے میری پرورش کی' مجھے محبت دی' میرا خیال رکھا ے لیے راتوں کو جاگتی رہیں' میرے لیے مائیں کیں۔''

پتا نہیں کتنی دیر ہو گئی پھر روتے روتے خود ہی ے آنسو تھم گئے اور میں نے بے خیالی میں ایک بار پھر ڈائری کو کھول لیا تب ایک بار پھر میری آنکھوں کے سامنے لفظ ''سرمئی بائی'' تحریر تھا۔ میں نے تیزی سے آگے کے صفحے پلٹ دیئے اور وہاں سے پڑھنا شروع کیا جہاں سے 'چھوڑا تھا' لکھا تھا۔

''تم ڈائری پر اپنا نام لکھا دیکھ کر چونک گئیں ناں...... اور تمہارے نام کے آگے ''بائی'' کیوں لکھا ہے' تو میری جان ''سرمئی'' دراصل میرا ہی نام ہے' میں سرمئی بائی ہوں اور مشہور طوائف......!'' امی کی اصلیت خود ان کے قلم سے جان کر میں پوری جان سے لرزنے لگی۔ میرا سارا وجود ایک سوکھے پتے کی مانند کانپ رہا تھا۔ امی ایک طوائف تھیں...... پھر میں امی کے پاس کیسے آئی...... کون مجھے ان کی گود میں دے گیا یا ان کی دہلیز پر چھوڑ گیا...... میرے دماغ میں یہ خوف ناک سوالات کسی ناگ کی طرح ڈنک مارنے لگے' میں نے آگے پڑھا۔

''میں ایک خاندانی طوائف تھی' میری ماں بھی ایک ناچنے گانے والی تھی اور میری نانی بھی...... میرا جنم بھی کوٹھے ہی پر ہوا تھا۔ میں ناچنے اور گانا گانے میں ماہر تھی۔ میرا گانا سننے کے لیے لوگ دور دور سے میرے کوٹھے پر آیا کرتے تھے پھر ایسا ہوا کہ میری ماں مر گئی' اب اس کوٹھے کی مالک میں تھی' میرے بہت سے عاشق تھے' ایک بہت بڑا زمین دار تھا جو آج حکومت میں ایک وزیر کے عہدے پر فائز ہے۔ اس زمانے میں نوجوان تھا اور میرا سب سے بڑا عاشق تھا' مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔ اس نے مجھ پر نوازشات کی برسات کر رکھی تھی' اپنی زرعی زمینوں سے کچھ اس نے میرے نام بھی کیں۔ تین باغ بھی میرے نام لکھ دیئے' میں ایک بات تمہیں بتا دوں میں ایک خاندانی طوائف تھی ناچنا اور گانا میرا خاندانی پیشہ تھا لیکن ہم نے جسم فروشی کبھی نہیں کی' میں بھی اپنے باپ کی جائز اولاد

www.Paksociety.com

تھی (بقول میری ماں کے) اس نے میری ماں سے نکاح کیا تھا اور یہ وعدہ کر کے اور ماں کے ساتھ راتیں گزار کے ہمیشہ کے لیے غائب ہوگیا کہ وہ ایک دن ماں کو اس گندگی کے ڈھیر سے نکال لے جائے گا' پھر اچانک ایک دن وہ تو نہیں آیا البتہ اس کی طرف سے تحریری طلاق نامہ ضرور آ گیا اور اس وقت تک میں اپنی ماں کے بطن میں آ گئی تھی۔

اس کے بعد میری ماں کو اس سے اتنی شدید نفرت ہوئی کہ اس نے میرے باپ کو اس بات کی اطلاع بھی نہیں دی کہ وہ "امید" سے ہو چکی ہے جب میں پیدا ہوئی تو میری ماں بے حد خوش ہوئی کہ وہ اس نام نہاد شریف زادے کے شریف خون کو کوٹھے کی زینت بنا کر انتقام لے گی۔

خیر..... میں اپنے بارے میں بتا رہی تھی کہ مجھے بھی اس سے محبت ہوگئی اور میں نے اس سے کہا وہ مجھ سے شادی کر لے لیکن وہ ٹال مٹول سے کام لینے لگا' دراصل وہ مجھے محبت کے سبز باغ دکھا کر جسمانی طور پر حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی بے پناہ نوازشوں (جو اس نے باغات اور زمینیں میرے نام کر کے رکھی تھیں) کے باوجود اس کو خود سے دور رکھا اور نکاح کی شرط رکھی اور ساتھ میں یہ شرط بھی رکھی کہ نکاح کرنے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے ماں باپ کے سامنے لے جا کر کہے گا کہ میں اس کی بیوی ہوں اور شب عروسی میں اس کے گھر میں ہی مناؤں گی' پھر پلٹ کر اس کوٹھے کی جانب دیکھوں گی بھی نہیں کیوں کہ اپنی ماں کی زندگی سے میں نے بہت سبق حاصل کیا تھا۔

لیکن ایسی محبت کرنے والے اندر سے بہت بزدل ہوتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکا اس لیے خاموشی سے میری زندگی سے نکل گیا۔ جب اس نے سچائی کے ساتھ میرے سامنے اپنی بزدلی کا اعتراف کرتے ہوئے مجھ سے نکاح کرنے سے معذرت کی تو میں نے کہا بھی کہ میں اس کی زمینیں اور باغات اسے واپس کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن وہ اتنا شرمندہ تھا کہ ہمیشہ کے لیے واپس لوٹ گیا۔

اس کے میری زندگی سے چلے جانے کے بعد میرا دل بہت دکھی ہوا بلکہ دنیا ہی سے اچاٹ ہوگیا۔ اب میرا نہ ناچنے کا دل چاہتا تھا اور نہ ہی کوٹھا سجانے کا..... تماشبین آتے تو میں خرابی طبیعت کا بہانہ بنا کر معذرت کر لیتی' آہستہ آہستہ میرے کوٹھے کی روشنیاں ماند پڑنے لگیں۔ دوسرے کوٹھے والیاں جو پہلے تماشبین کے لیے ترستی تھیں' ان کے کوٹھے آباد ہوگئے۔

میں خاموشی اور تنہائی میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی کہ آخر میرا انجام کیا ہوگا۔ شمسو اور حمیدہ..... یہ دونوں میرے کوٹھے پر میرے ملازم تھے' میرے وفادار تھے اور آج تک ہیں۔ کوٹھا تاریک ہونے پر سارے لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے لیکن یہ دونوں میرے ساتھ ہی رہے۔

ایک رات کا ذکر ہے اس رات شدید طوفانی بارش تھی مجھے بہت تیز بخار تھا اتنا تیز کے مجھے ہوش بھی نہیں تھا تب شمسو میرے لیے کسی ڈاکٹر سے دوا لینے کے لیے گیا لیکن شدید بارش کے باعث جگہ جگہ پانی کھڑا تھا' بازار بند تھے ڈاکٹر کے کلینک بھی' تب ہی شمسو واپس آ رہا تھا کہ اچانک اس کی کسی سے ٹکر ہوگئی' اندھیرے میں شمسو اور وہ دونوں زمین پر پانی میں گر پڑے۔ نیچے گرتے ہی شمسو کے کان میں کسی بچے کی ننھی سی رونے کی آواز آئی شمسو نے دیکھا کہ ایک عورت جو سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی ہے زمین پر گری ہوئی ہے اس کی گود میں ایک بچہ ہے اور گرنے سے اس عورت کو بھی چوٹ لگی اور بچے کو بھی۔

شمسو نے اس عورت کو سہارا دے کر اٹھایا اور اس ے معذرت کی کہ اندھیرے کے سبب وہ اسے دیکھ ں سکا یوں اس سے ٹکرا گیا اور پوچھا کہ وہ کون ہے ور اس شدید بارش میں اتنے چھوٹے بچے کو لے کر ہاں جا رہی ہے تو وہ عورت بلک بلک کر رونے لگی۔ ؓو نے پوچھا کہ اس پر کیا مصیبت آن پڑی ہے وہ بولی۔

"میں مصیبت کی ماری ایک ایسی عورت ہوں ں نے صرف بیٹیاں ہی پیدا کی ہیں۔ اس کا شوہر یوں کا دشمن ہے' اب جب یہ بیٹی پیدا ہوئی ہے تو وہ ں کی جان کا دشمن ہو رہا ہے اور اس کا گلا دبا کر اس کو ارنا چاہتا تھا' وہ اس بچی کی جان بچا کر فی الحال تو ے لے آئی ہے لیکن وہ کب تک اس کی جان اس ے ظالم باپ سے بچا پائے گی اگر تمہارے اندر ذرا ھی خوف خدا ہے تو تم میری اس بچی کو بچا لو۔"

شمسو نے حیرانی سے کہا "وہ کس طرح اس بچی کی ہان بچا سکتا ہے" تو اس نے کہا۔

"اس طرح" اور بچی کو شمسو کی گود میں دیتے وئے کہا۔ "اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کو پال و اللہ تمہیں اس نیکی کی بہت بڑا اجر دے گا اور میں یات تمہارے لیے دعا گو رہوں گی۔"

"بہن! میں تو خود ایک غریب آدمی ہوں' بھلا ہاری بچی کو......!" شمسو نے گھبرا کر کہا تو اس نے ں کی بات پوری ہونے سے پیش تر ہی ایک پڑے کا تھیلا شمسو کے ہاتھ میں تھمایا اور بولی۔

"اس تھیلے میں بہت کچھ ہے' یہ بڑی ہو جائے تو س میں موجود چیزیں اس کے حوالے کر کے کہنا ان کی دے تمہیں اپنے باپ کو تلاش کر کے پہچاننے میں سانی ہو گی اور وہ اپنا حسب نسب جان سکے گی۔"

"لیکن بہن......!" شمسو کچھ کہہ بھی نہیں پایا اور وہ عورت تیزی سے وہاں سے غائب ہوگئی۔ شمسو نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے کی چادر نے اسے نگل لیا۔ تب ناچار شمسو اس بچی کو میرے پاس لے آیا' اس نے بچی کو حمیدہ کے حوالے کر دیا' دو دنوں کے بعد جب میری طبیعت بحال ہوئی تو حمیدہ اور شمسو نے اس بچی کو مجھے دکھایا اور ساری بات بتانے کے بعد وہ تھیلا بھی میرے حوالے کر دیا۔

وہ روتی ہوئی بچی میری گود میں آنے سے ایک دم چپ ہوگئی' جیسے اسے ماں کی گود مل گئی ہو۔ حمیدہ نے میرے ہاتھ میں فیڈر دیا اور کہا۔

"اسے آپ ہی پلا دیں' مجھ سے تو یہ پی ہی نہیں رہی۔" میں نے فیڈر اس کے منہ میں دیا تو وہ مزے سے پینے لگی اور پی کر سو گئی۔

اسے گود میں لے کر اور سینے سے لگا کر مجھے بھی کچھ اس طرح کا سکون ملا جیسے میری زندگی کی ہر تکلیف ختم ہوگئی شاید ہر عورت کے اندر اللہ پاک نے ماتا کوٹ کوٹ کر رکھی ہے اور ہر عورت ماں بن کر ہی اپنے عورت ہونے کی تکمیل چاہتی ہے۔

شاید میرے اندر کہیں یہ ملال پنپ رہا تھا کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی' کوئی مجھ سے شادی ہی نہیں کرے گا تو ایسے کیسے ہوگا اور میں حرام کاری کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے اس بچی کو اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

"آج سرمئی ہمیشہ کے لیے مر گئی' آج سے میں اس کی ماں ہوں۔ میں اسے ماں بن کے پالوں گی۔"

شمسو اور حمیدہ میرے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئے' حمیدہ نے کہا۔

"اس کا نام تو رکھ دیں۔" تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"آج سے ایک سرمئی بائی مرگئی اور ایک نئی سرمئی پیدا ہوئی ہے' میں اسے سرمئی ہی کہوں گی' ایک نیک اور پاک باز سرمئی......!"

پھر میں نے اس تھیلے کو دیکھا کہ اس میں کیا کیا ہے تو اس میں چند ہزار روپوں کی رقم' اس کے علاوہ چند قیمتی جواہرات اور تین چیزیں جو خاص تھیں وہ نکلیں۔ شاید ان ہی چیزوں کے لیے اس عورت نے کہا تھا کہ ان چیزوں کی مدد سے وہ اپنے باپ کو تلاش کرکے پہچان سکے گی اور وہ پہچان کس طرح سے ہوگی' اس کے بارے میں مجھے نہیں معلوم اور وہ تینوں چیزیں میں نے سنبھال کر رکھ لی ہیں۔ ان میں ایک خاص پتھر کا تعویز ہے' جس میں بلیک کلر کا کوئی خاص نشان ہے۔ دوسرا قیمتی پتھروں سے جڑاؤ سونے کا تاج اور سب سے اہم چیز ایک چھڑی ہے' جس کے سرے پر سونے کے دو شیر بنے ہوئے ہیں۔

وہ بچی تم ہو میری جان...... میں نے ان نشانیوں کو تمہارے لیے سنبھال کر رکھا ہے تاکہ تم ان نشانیوں کی مدد سے اپنے باپ اپنے خاندان کو تلاش کرسکو۔ ایک بات اور سمجھ لو' جو میں نے اس وقت جان لی تھی کہ تمہارا تعلق کسی اونچے اور اعلیٰ خاندان سے ہے' نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ تمہاری ماں یوں کسی انجان آدمی کے حوالے تمہیں کرگئی' یہ ہو بھی سکتا ہے کہ واقعی تمہارا باپ تمہاری جان کا دشمن ہو۔

پھر میں نے تمہاری ماں کو دیئے ہوئے قیمتی جواہرات کو شمسو کے ذریعے فروخت کروا کے وہ کوٹھا ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور لاہور چھوڑ کر کراچی آگئی۔ یہاں اس رقم سے یہ مکان خریدا اور یہاں ایک بیوہ اور بچی کی ماں کی حیثیت سے رہنا شروع کردیا۔

میں سخت پردے میں رہتی تھی کہ کہیں بھولے سے بھی کوئی میرا واقف کار نہ نکل آئے اور میری اصلیت سے واقف ہوجائے۔ میں نے پوری طرح گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اللہ سے لَو لگالی' دن رات اپنی سابقہ زندگی کے گناہوں کی توبہ کرتی۔

زمین دار کی بخشی ہوئی زمینوں اور باغات کی آمدنی سے تمہیں پالا اور پرورش کی ہے۔ شمسو اور حمیدہ کی بہت احسان مند ہوں کہ ان دونوں میاں بیوی نے انتہائی بُرے حالات میں بھی میرا ساتھ دیا اور میری ہدایت پر تمہیں میرے راز سے ناواقف رکھا۔ تمہاری پرورش میں ان دونوں کا بھی ہاتھ ہے' میرے بعد تم انہیں وہی درجہ دینا جو اپنے ماں باپ کا ہوتا ہے' اللہ نے انہیں بھی اولاد نہیں دی پھر جب سے تم ہماری زندگیوں میں آئیں تو یہ دونوں بھی اپنی اولاد نہ ہونے کا غم بھلا بیٹھے' انہیں تم سے بے پناہ محبت ہے۔

میرے بعد بھی زمینوں اور باغات کی آمدنی اسی طرح آتی رہے گی' جس طرح میری زندگی میں آتی تھی۔ تمہیں کسی بھی قسم کی مالی پریشانی نہیں ہوگی۔ تم اطمینان سے اپنی تعلیم مکمل کرنا' میرا تمہیں ایک مشورہ ہے کہ کسی بھی مرد کی محبت کے جھانسے میں مت آنا اور وقت آنے پر کسی شریف اور خاندانی آدمی سے شادی کرکے گھر بسا لینا' بچے پالنا اور شوہر کی خدمت اور اس کی فرماں برداری ہی ایک عورت کا وتیرہ ہونا چاہیے۔

مجھے اپنے رحیم و کریم سے امید ہے کہ میں اپنی سابقہ گناہوں بھری زندگی پر ہمیشہ نادم رہی اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتی رہی تو اس نے یقیناً مجھے معاف کردیا ہوگا' تم بھی میری مغفرت کی ضرور دعا کیا کرنا' میں نے تمہارے لیے اپنے ہر سانس میں دعا کی ہے' اتنی دعائیں کہ میرے مرنے کے بعد بھی میری دعائیں سایہ بن کر ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔

کئی دنوں سے مجھے سینے میں شدید درد کی شکایت ہے لیکن میں نے اس بات کا ذکر کسی سے بھی نہیں کیا ہے' بس اب ایسا لگتا ہے کہ زندگی کی میعاد پوری ہونے والی ہے' اسی لیے آج یہ سب باتیں تمہارے لیے تحریر کررہی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فرشتہ اجل اچانک سے آجائے اور مجھے تم سے یہ باتیں کرنے کا موقع ہی نہ ملے اس لیے کہ جب وہ آئے گا تو لمحہ بھر کی بھی مہلت نہیں دے گا۔

تمہارے پاس تمہاری ماں کی دی ہوئی تین نشانیاں ہیں۔ پتھر کا یہ تعویز' سونے کا تاج اور وہ چھڑی شاید تمہاری خاندانی نشانیاں ہیں۔ تم ان کی مدد سے اپنے خاندان کو تلاش کرسکتی ہو اور جیسا کہ ان چیزوں سے ظاہر ہے تمہارا تعلق کسی معمولی خاندان سے نہیں ہے' کوشش کرنا کہ اعلیٰ خاندان کے لوگوں سے تعلقات بڑھاؤ' ہوسکتا ہے کہ کہیں تمہیں تمہارے ماں باپ یا بہن بھائی ٹکرا جائیں اور ان میں سے کوئی ایک نشانی کسی اور کے پاس بھی ہو۔

میری بچی' میری بیٹی' میری جان میری یہ آخری دعا ہے کہ اللہ تمہیں ہر مصیبت اور ہر پریشانی سے بچائے' تمہاری عزت اور عفت کی حفاظت کرے اور تمہیں بہترین رفیق زندگی عطا فرمائے' اللہ ہر لمحہ تمہارا حامی و ناصر ہو' اللہ حافظ میری بیٹی میں نے تمہیں ہر لمحہ اللہ کی حفاظت اور نگہبانی میں سونپا......! تمہاری گناہ گار ماں سرمئی! سترہ اپریل۔" یہ ڈائری امی نے اپنی وفات سے پورے ایک ماہ قبل لکھی تھی۔

ڈائری بند کرکے میں دیر تک روتی رہی پھر اٹھی اور ایک بار پھر ان تینوں چیزوں کا جائزہ لیا جو میری ماں نے (پتا نہیں وہ میری ماں تھی یا کوئی اور) شمسو بابا کو دی تھیں۔

سونے کا تاج اتنا چھوٹا تھا جو کسی چھوٹے بچے کے سر پر آسکتا تھا' اس تاج میں قیمتی پتھر اور نگینے جڑے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہوسکتا ہے یہ تاج میری پیدائش پر میرے ماں باپ یا دادی دادا نے پہنایا ہو' پتھر کا تعویز ہوسکتا ہے کہ میرا خاندانی ہو...... ایسا میں نے کبھی کسی کو پہنے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ آخری چیز جو ایک اسٹک تھی' اس کی ساخت بالکل ایسی تھی جیسے عمر رسیدہ لوگ سہارے کے لیے ہاتھ میں لے کر چلتے تھے' وہ بھی سونے کی تھی' چھوٹی سی تھی لیکن خاص بات یہ تھی کہ اس کے سرے پر جہاں سے وہ پکڑی جاتی ہے وہاں سونے کے دو چھوٹے چھوٹے شیروں کی جوڑی بنی ہوئی تھی۔ ایسی اسٹک یقیناً میرے دادا یا باپ کے پاس ہوگی۔

میں نے امی کی ڈائری اور وہ تینوں چیزیں دوبارہ الماری میں رکھ کر لاک کردیں اور کمرہ کھول کر باہر نکل آئی' باہر آئی تو شمسو بابا اور اماں حمیدہ پریشان صورتیں لیے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں ایک ساتھ اٹھے اور میری جانب بڑھے' ان کے لب کانپے مگر کچھ کہہ نہ سکے' وہ خاموش لبوں کی زبان سے مجھ سے بہت سے سوالات کررہے تھے ان کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔

پھر میں بھاگ کر اماں حمیدہ کی پھیلی ہوئی بانہوں میں سما گئی اور رونے لگی۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ دونوں بھی رو پڑے۔ اماں میری پشت سہلاتے ہوئے مجھے چمکار رہی تھیں تو بابا میرا سر سہلا رہے تھے۔

پھر میں نے بابا کی زبانی وہ سارا قصہ سنا' ان سے کہا۔

"بابا! آپ نے اس عورت کی شکل دیکھی تھی جو خود کو میری ماں کہہ رہی تھی اور جس نے مجھے آپ کی گود میں دیا تھا۔"

"بیٹا! وہ ایک اندھیری رات تھی اور بارش کی بوچھاڑیں کسی تیر کی مانند جسم پر برس رہی تھیں۔ وہ عورت اچانک ہی کسی آندھی کی طرح میرے سامنے

www.Paksociety.com

آئی، چند باتیں کیں اور تمہیں میرے حوالے کر کے اندھیری فضاؤں میں گم ہوگئی اور میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ کیا کرتا تمہیں اپنے ساتھ گھر لے گیا اور پھر یہ تمہارا اچھا نصیب تھا کہ ہمارے دلوں میں تمہاری محبت کے سوتے پھوٹ نکلے اور ہم نے تمہیں گلے لگالیا اور بجی نے بھی اپنی گناہ گار دنیا کو الوداع کر کے اپنی بقیہ زندگی ایک نیک اور شریف عورت کی طرح اس گھر کی چار دیواری میں گزار دی۔'' شمسو بابا ایک بار پھر ای کا ذکر کرتے ہوئے رو پڑے۔

وہ شام بہت سوگوار تھی ہم بیٹھے امی کا ذکر کرتے رہے تھے' ان کی خوبیاں اور اچھائیاں بیان کرتے رہے' میں نے بابا اور اماں کو بتایا کہ امی نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ دونوں کو اپنے والدین کی طرح سمجھوں اور آپ کی عزت کروں۔ یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو مجھ سے اور مجھے آپ سے کتنی محبت ہے۔ آج سے میں آپ دونوں کو ہی اپنا سب کچھ مانتی ہوں۔ آپ دونوں مجھے میری کسی غلطی پر روک بھی سکتے ہیں اور ڈانٹ بھی سکتے ہیں۔''

پھر میں نے دوبارہ سے کالج جوائن کرلیا۔ بابا گاڑی خود ڈرائیو کرتے اور مجھے کالج چھوڑ کر آتے' میں انٹر میں پڑھ رہی تھی' آہستہ آہستہ میں نے دوسری لڑکیوں اور لڑکوں سے دوستی شروع کردی لیکن یہ دوستی ایک حد میں رکھی' کسی بھی لڑکی یا لڑکے کو میں نے اپنی ذاتیات میں دخل دینے کی اجازت نہیں دی' سب کو میں نے یہی بتایا کہ میرے والدین فوت ہوچکے ہیں۔ امی کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے' یہ سب کو معلوم تھا۔

انٹر کے ایگزام دے کر فارغ ہوئی تو میں نے ایک ہیلتھ کلب جوائن کرلیا' وہاں سیلف ڈیفنس کے سارے گر سکھائے جاتے تھے' امی کے انتقال کے بعد سے نہ جانے کہاں سے میرے اندر بے پناہ خود اعتمادی آگئی۔ میرا ارادہ تھا کہ انٹر کے بعد یونیورسٹی جوائن کرلوں گی اور پھر جرنیلزم میں ماسٹر کر کے صحافی بنوں گی۔

وقت گزرتا گیا' مجھے نہیں معلوم کہ گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹا زمینوں اور باغوں سے ہونے والی آمدنی کا حساب آپ اپنے ہاتھ میں رکھیں لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ یہ سارا انتظام آپ اور اماں سنبھالیں' مجھے ان جھمیلوں سے دور ہی رکھیں تو اچھا ہے' مجھے جب پیسوں کی ضرورت ہوگی آپ سے مانگ لیا کروں گی' اس کے علاوہ امی کی الماری سے مجھے اس مکان کے کاغذات بھی ملے جس میں ہم رہتے تھے بقول بابا کے کیوں کہ یہ مکان ان پیسوں سے خریدا گیا ہے جو میری ماں نے دیئے تھے اور کچھ رقم ان قیمتی پتھروں کو فروخت کر کے حاصل کی تھی۔ وہ بھی میرے نام تھے۔

طوائف کے بارے میں یہی سنا گیا تھا کہ وہ پیسے کی حریص اور لالچی ہوتی ہے لیکن میری امی تو بہت ایمان دار اور امانت دار تھیں۔ انہوں نے میری ایک ایک پائی کا حساب رکھا اور سب کچھ میرے نام کرگئیں۔

بابا اور اماں بوڑھے ہوچکے تھے اور بیمار رہنے لگے تھے' پیسے کی میرے پاس کمی نہیں تھی اس لیے میں نے بابا اور اماں کو آرام کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے گھر میں کل وقتی دو ملازم رکھ لیے۔

میرے لیے تو ان دونوں کا وجود ہی بہت غنیمت تھا' میں ان کا بہت خیال رکھتی تھی اور یہ بات سوچ کر ہی کانپ اٹھتی کہ کہیں یہ دونوں بھی مجھے امی کی طرح اچانک ہی چھوڑ کر چلے نہ جائیں۔

وہ یونیورسٹی میں میرا آخری سال تھا' میں جرنیلزم کے فائنل ائر میں تھی۔ یہاں بھی میں لڑکوں اور لڑکیوں سے ملتی تو تھی لیکن ایک حد میں رہ کر' کسی لڑکے کی مجال نہیں تھی کہ میرے ساتھ بے تکلف ہوسکے۔ بابا کے بیمار ہونے کے بعد میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور خود گاڑی لے کر یونیورسٹی جاتی اور آتی تھی۔ میرے کلاس فیلوز میں حشام نامی ایک لڑکا تھا۔ جو بہت شوخ و شریر اور وجیہہ تھا۔ بہت سی لڑکیوں سے اس کی دوستی تھی لیکن مجھے وہ چھچھورا لگتا تھا' وہ جوک سناتا تو سب ہنستے سوائے میرے' اس نے میرا نام ''کھڑوس'' رکھ دیا تھا' اس نے میرے قریب آنے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے فائنل ایگزام ہورہے تھے تب ہی بابا شدید بیمار ہوگئے میں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہوگئی اور خود بھی بستر سے لگ گئی یونیورسٹی میں یہ خبر پہنچی تو بہت سے لڑکے اور لڑکیاں عیادت کے لیے میرے گھر آئے۔ ان میں حشام بھی تھا سب میرے اردگرد بیٹھے تھے اور میری آنکھوں سے آنسو بہنا بند ہی نہیں ہورہے تھے' تب وہ میرے نزدیک آیا اور بولا۔

''تم اپنے ایک ملازم کی بیماری پر اتنا رو سکتی ہو' یقین نہیں آرہا۔ تمہیں دیکھ کر تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے تمہارے سینے میں دل ہی نہیں ہے لیکن تم تو ایک بہت گداز اور محبت بھرا دل رکھتی ہو۔''

اس وقت مجھے اس کی بات بُری نہیں لگی' بعد میں وہ میرے بہت کام آیا' ایگزام کے دنوں میں اس نے میری بھرپور مدد کی اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مجھ سے دوستی کرنا چاہتا ہے تو میں نے اسے بتایا کہ میں لڑکے اور لڑکی کی دوستی کی قائل نہیں ہوں۔ دوستی کا رشتہ بہت اونچا مقام رکھتا ہے لیکن ایک مرد ایک عورت کے ساتھ اس مقام کو نہیں چھوسکتا۔ کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے بعد وہ اپنے جذبات کو سطحی محبت کا نام دے کر اسے بے وقوف بناتا ہے تب اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرے اور اپنے دوستی کے پاکیزہ رشتے پر کوئی حرف نہیں آنے دے گا۔ اس نے مجھے دوستی کے لیے اس لیے چنا ہے کہ میں اسے دوسری تمام لڑکیوں سے بہت مختلف دکھائی دی ہوں۔

اس کا تعلق ایک اونچے اور اعلیٰ خاندان سے تھا جب اس نے مجھے اپنے بارے میں بتایا تو میرے ذہن میں امی کی نصیحت آگئی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ تم اونچے خاندانوں میں دوستیاں کرنا تاکہ اپنے خاندان کو تلاش کرسکو ہوسکتا ہے کہ تمہیں کوئی تمہارا اپنا کہیں ٹکرا جائے۔ سو میں نے اس کی دوستی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا۔ یہ سوچ کر کہ وہ دوستی کے علاوہ کوئی اور بات نہیں سوچے گا۔

ایگزام کے بعد ہمارے رزلٹ آئے اور ہم دونوں ہی کامیاب ہوچکے تھے' ہمیں اب جاب تلاش کرنی تھی' میں ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی تھی' جاب تلاش کرنے کا مشکل مرحلہ بھی حشام نے چٹکی بجاتے ہی حل کردیا' اس نے مجھے بتایا کہ ایک نیوز چینل کے مالک اس کے ڈیڈی کے بہت اچھے دوست ہیں اور میں اسی نیوز چینل میں کام کرنے والا ہوں اور میں نے تمہارے لیے بھی ڈیڈی سے بات کرلی ہے تم بھی میرے ساتھ اس نیوز چینل میں کام کررہی ہو۔

اس کے اتنے بڑے احسان پر تشکر سے میری آنکھیں نم ہوگئیں۔ مجھے آب دیدہ دیکھ کر اس نے جھٹ اپنی جیب سے رومال نکالا اور بولا۔

''اپنے یہ قیمتی موتی تحفتاً مجھے ان میں جذب

www.Paksociety.com

کر کے دے دو اور یہ سمجھنا کہ تمہاری آنکھ میں آنے والا ہر آنسو اب میرا ہے خبردار جو انہیں اس طرح لٹایا۔"

"ہیں......! کیا مطلب ہے اس بات کا؟" میں نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"مطلب وطلب مجھے نہیں معلوم بس میں تمہیں روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"مگر میں اس قسم کے ڈائیلاگ کا مطلب اچھی طرح سے سمجھتی ہوں۔ ایسے ڈائیلاگ تو لو برڈ ایک دوسرے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا......!" اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا پھر زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ میں بھی ڈائیلاگ بول سکتا ہوں۔ چلو کبھی کوئی ایسی بندی ملی جس سے اظہار عشق کرنا پڑا تو میں کامیاب رہوں گا۔"

"پاگل ہو تم بالکل۔" میں نے اس کا رومال اسے واپس کرتے ہوئے کہا۔

"تھوڑا تھوڑا!" اس نے جھینپ کر کہا تو میں اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔ موٹی موٹی آنکھوں والا یہ لڑکا مجھے اچھا لگتا تھا لیکن میرے دل میں اس کے لیے سوائے ایک دوست کے کوئی اور جذبہ نہیں تھا۔

"ایسے کیا گھور رہی ہو؟ نظر لگانے کا ارادہ ہے کیا...... ویسے بھی میری ممی کہتی ہیں کہ یونیورسٹی میں روزانہ لڑکیاں مجھے نظر لگاتی رہتی ہیں۔" اس نے معصومیت سے منہ بنا کر کہا تو مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔

"بڑی خوش فہمی ہے تمہاری ممی کو، تمہارے بارے میں۔ اس کالے کلوٹے کو کوئی لڑکی پسند کرے گی۔" میں نے اس کی سانولی رنگت کو نشانہ بنایا۔

"چلو...... گوری نہ سہی ہو سکتا ہے کوئی سانولی سلونی تیکھے نینوں اور لمبی زلفوں والی ہی ہم پر بھی نظر کرم کر دے......!" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور میں لمحہ بھر کو گڑبڑا گئی۔ نہ جانے اس وقت اس کی آنکھوں اور لہجے میں ایسا کیا تھا مگر فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کہا۔

"منہ دھو رکھو کوئی بھی لڑکی تمہیں گھاس ڈالنے والی نہیں۔"

"ٹھیک ہے تو تم یہ چاہتی ہو کہ میں کنوارہ ہی اس دنیا سے اٹھ جاؤں۔" اس نے روٹھ کر منہ پھیر لیا۔

"ناراض ہو گئے دوست! میں تو مذاق کر رہی تھی ان فیکٹ تم سے تو کوئی بھی لڑکی شادی کر کے خود پر فخر محسوس کرے گی تم ہو ہی اتنے اچھے......!" میں نے اس کے سامنے جا کر کہا۔

"سچ کہہ رہی ہو......!" اس نے روٹھے روٹھے لہجے میں کہا۔

"بالکل سچ......!" میں نے ہنستے ہوئے اس کی لمبی سے ناک کو پکڑ کر کھینچا تو وہ چیخ اٹھا۔ "ارے یار! یہ تو ویسے ہی خاصی لمبی ہے پلیز تم اسے مزید لمبا مت کرو۔"

"اچھا چلو مجھے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں لنچ کراؤ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"کس خوشی میں؟" اس نے کہا۔

"جاب ملنے کی خوشی میں اور کس میں۔" میں نے کہا۔

"پھر تو ٹریٹ تمہاری جانب بنتی ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا بابا! پیسے میں دے دوں گی تم چلو تو سہی کنجوس کہیں کے۔" تو وہ ہنستا ہوا میرے ساتھ چل دیا۔ لنچ کے دوران اس نے مجھ سے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔

"سرمئی! تم نے کبھی اپنے بارے میں مجھے

بتایا۔"

"کیا جاننا چاہتے ہو؟" میں نے بھی گہری ...گی سے پوچھا۔

"تمہارے اور تمہارے والدین کے بارے میں، ...ے والد کون تھے؟ کہاں کام کرتے تھے؟ ان کا ...ل کب ہوا؟ اور پھر ان کے بعد تمہاری گزر بسر ...ہوتی تھی وغیرہ وغیرہ......!" اس نے کہا۔

"کیا تمہارے لیے ان باتوں کو جاننا ہماری دوستی ...لیے مشروط ہے؟" میں نے بغور اس کے چہرے ...تاثرات دیکھنے چاہے۔

"ارے نہیں! میں تو بس ویسے ہی پوچھ رہا تھا اگر ...نہیں بتانا چاہتیں تو نہ بتاؤ اور ہاں اگر تمہیں برا لگا ...میں دلی معذرت چاہتا ہوں۔ تم کون ہو، کیا ہو، ...ارا بیک گراؤنڈ کیا ہے، مجھے اس سے کوئی مطلب ...ں ہے، میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم میری ...ت ہو......اور......!" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

"اور کیا......؟" میں نے تیزی سے سوال کیا۔

"اور یہ کہ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں......!" اس ...آہستہ سے سر جھکا کر کہا۔

"حشام! تم معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ..." میں نے اپنے زور سے دھڑک جانے والے ...ل کی آواز کو دبا کر کہا۔

"یار! تمہاری سوئی ایک جگہ پر کیوں اٹک جاتی ...کیا کوئی دوست کسی دوست سے محبت نہیں کرتا ...ایک بات اور یاد دلا دوں اگر دوستی میں محبت نہ ہو تو ...تی دوستی نہیں رہتی، مطلب پرستی بن جاتی ہے، جب ...مطلب ہے ساتھ رہے، پھر تو کون اور میں ...ن؟" اس نے جھنجلا کر جواب دیا تو میں خاموش ...ی۔

اس کے سوال کرنے سے میں اپنے ماضی میں سوچنے لگی، مجھے تو خود نہیں معلوم تھا کہ میں کون ہوں، میرے ماں باپ کون ہیں اور وہ کیا وجوہات تھیں کہ ایک ماں اپنے بچے کو یوں کسی غیر اور انجان کے حوالے کر کے چلی گئی اور پلٹ کر یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ اس کی بچی کن ہاتھوں میں گئی ہے، کس نے اس کی بیٹی کو زندگی دی ہے اسے پالا بھی ہے یا اس کے ساتھ دیا ہوا مال و متاع ہڑپ کر کے اس کی بیٹی کو کہیں مار کر پھینک دیا۔

"کیا سوچنے لگیں، تم کھانا بھی نہیں کھا رہیں، سب ٹھنڈا ہو گیا۔" حشام کی آواز مجھے میری سوچوں کے حصار سے باہر کھینچ لائی۔

"آں...... ہاں...... کچھ نہیں!" میں نے چونک کر کہا۔ "بس کھا چکی اب دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے اداس لہجے میں کہا وہ دیر تک میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر آہستگی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا پریشانی ہے، مجھے نہیں بتاؤ گی اپنے دوست کو......!"

اس کے اتنے محبت سے پوچھنے پر میری آنکھیں نم آلود ہو گئیں اور میں نے نرمی سے اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں ہے۔"

"کوئی بات تو ہے...... دیکھو میں نے تمہارے آنسو تو لے لیے ہیں اب اپنی ساری فکریں، اپنی ساری پریشانی بھی مجھے دے دو...... پلیز سرمئی! مجھے کسی قابل تو سمجھو......!" اس نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"پتا ہے حشام! میں نے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی اس سوال کے زیر اثر گزار دی کہ میں کون ہوں، کیوں کہ جنہوں نے مجھے پالا ہے وہ عورت میری ماں نہیں تھیں لیکن انہوں نے مجھے اس طرح پالا ہے کہ

مجھے کبھی اس بات کا احساس ہی ہونے نہیں دیا کہ وہ میری حقیقی ماں نہیں ہیں' انہوں نے مجھے ماں کی ممتا بھی دی اور ایک اچھی ماں کی طرح میری تربیت بھی کی۔ وہ میری ماں نہیں تھیں میری کائنات تھیں۔ ان کے علاوہ میرا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے' میری حقیقی ماں کون تھی؟ کیسی تھی؟ میرا باپ کون تھا کیسا تھا یہ تو انہیں بھی نہیں معلوم تھا بلکہ یہ بات امی میری حقیقی ماں نہیں ہے مجھے ان کے انتقال کے بعد پتا چلا ہے' کبھی کبھی میرے ذہن میں اپنی ماں کا تصور ایک عکس کی طرح رقص کرتا ہے' ایک حسین مسکراتا ہوا چہرہ جو محبت بھری نگاہوں سے ایک وجیہہ اور باوقار چہرے کے ساتھ پردہ خیال پہ بار بار ابھر آتا ہے۔ میں خود کون ہوں؟ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میری زندگی کا سرمایہ تو امی تھیں جن کے وجود سے مجھے احساس رہتا تھا کہ میں تنہا نہیں ہوں اور اب امی کے بعد شمسو بابا اور اماں حمیدہ ہیں' اور انہیں دیکھ کر میں سوچتی ہوں کہ اتنی بڑی اللہ کی اس بستی میں میرا بھی کوئی ہے۔

میں اپنی حقیقی ماں کے بارے میں جانتی ہوں تو صرف اتنا کہ برسات کی ایک اندھیری رات میں وہ اپنی گود سے مجھے شمسو بابا کی گود میں میری خاندانی نشانیوں کے ساتھ دے گئی تھیں۔" اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگئی۔ میں نے حشام کو اپنی امی کے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا' میں نے جو کچھ ان کے بارے میں جانا تھا' میں خود اسے بھول جانا چاہتی تھی۔ اس لیے کسی اور کو ان کے بارے میں بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

حشام بہت غور سے میری باتیں سن رہا تھا' میرے خاموش ہوجانے کے بعد اس نے سوال کیا۔

"اب تم کیا چاہتی ہو......؟ کیا اپنے حقیقی والدین کی تلاش کروگی یا پھر انہیں بھی اس طرح سے بھول جاؤ گی' جس طرح سے انہوں نے تمہیں بھلا دیا ہے......!"

"میں انہیں ضرور تلاش کروں گی لیکن اس لیے نہیں کہ میں ان کی محبت میں مری جارہی ہوں۔ محبت تو مجھے امی شمسو بابا اور اماں حمیدہ نے اتنی دی ہے کہ وہ سات جنم لے کر بھی مجھے اتنی محبت نہیں دے سکتی تھیں۔ میں ان سے مل کر صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ آخر وہ کیا وجوہات تھیں کہ ایک ماں نے اپنا جگر کا ایک حصہ یوں کاٹ کر خود سے جدا کردیا۔ وہ ظالم اور بے حس باپ کون تھا' جو بقول میری ماں کے مجھے موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا۔" میرے لہجے میں خود بخود ڈھیر ساری تلخی اتر آئی۔

"لیکن تم انہیں تلاش کیسے کروگی؟" حشام نے پوچھا۔

"ان خاندانی نشانیوں کے ذریعے جو میری ماں نے میرے ساتھ شمسو بابا کو دی تھیں۔" میں نے کہا اور پھر حشام کے پوچھنے پر ساری بات تفصیل سے اسے بتائی کہ میں اپنے باپ کے بارے میں کس کس طرح امی سے سوالات کیے لیکن اپنی زندگی میں امی نے کبھی مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ میری حقیقی ماں نہیں ہیں۔ یہ بات اور وہ خاندانی نشانیاں امی کی موت کے بعد ان کی ڈائری سے پتا چلی تھیں۔

"آج سے میں تمہارے اس مشن میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر مناسب سمجھو تو تم مجھے وہ چیزیں دکھانا تاکہ ہوسکتا ہے کہ انہیں دیکھنے کے بعد میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔" حشام نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم کل میرے گھر آنا میں تمہیں وہ چیزیں دکھاؤں گی اور بابا اور اماں سے بھی ملواؤں گی۔ یہ دونوں ہمارے پرانے ملازم ہیں لیکن میں نے اور امی نے انہیں کبھی ملازم نہیں سمجھا بلکہ گھر کا فرد ہی سمجھا ہے۔ اب تو وہی دونوں میرے سب کچھ ہیں۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

پھر ہم کھانے کی ٹیبل سے اٹھ گئے' باتیں ہی ہمارے درمیان ایسی شروع ہوگئی تھیں کہ ہم سے کھانا کھایا ہی نہیں گیا۔ پڑے پڑے ٹھنڈا ہوگیا۔ لنچ کا بل حشام نے دیا اور پھر کل ملنے کے وعدے پر ہم جدا ہوگئے۔ ہمارے درمیان یہ طے پایا کہ پہلے کل حشام میرے گھر آئے گا پھر میں اس کے ساتھ اس کے گھر جاؤں گی اس کی ممی اور ڈیڈی سے ملنے کے لیے' جاب کی بات بھی کرنی تھی۔

دوسرے دن میں ناشتے سے فارغ ہوکر اخبار پڑھ رہی تھی ساتھ ہی حشام کا انتظار بھی کررہی تھی تب ہی فون کی بیل بجنے لگی' میں نے فون ریسو کیا۔

"ہیلو......کون بول رہا ہے؟" میں نے ریسیور کی دوسری جانب ایک اجنبی مردانہ آواز سن کر کہا۔

"آپ یقیناً سرمئی بات کررہی ہیں۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔

"جی ہاں میں سرمئی بول رہی ہوں لیکن آپ کون صاحب بات کررہے ہیں۔" میں نے ایک اجنبی مرد کے منہ سے اپنا نام سن کر حیرت سے کہا کیوں کہ آج سے پہلے کبھی کسی بھی اجنبی مرد کی کال گھر کے فون پر سنائی نہیں دی تھی۔

"بیٹی میں ایڈوکیٹ انجم اسلام بول رہا ہوں' آپ کی والدہ کی وفات کے بعد چند ضروری قانونی کارروائیوں کے لیے آپ کی اجازت ضروری ہے۔ اسی سلسلے میں' میں آپ کے پاس آنا چاہ رہا تھا' ویسے میرا خیال ہے کہ آپ کو معلوم تو ہوگا کہ انہوں نے آپ کے لیے کتنی جائیداد چھوڑی ہے۔"

"جی نہیں! میں نے آج تک کبھی اس بارے میں نہیں سوچا۔" میں نے جواب دیا۔ "میرا سب سے قیمتی سرمایہ میری امی تھیں' ان کے بعد مجھے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔"

"مجھے آپ کے اس عظیم دکھ کا احساس ہے بیٹی! لیکن میرا فرض ہے کہ میں آپ کی جائیداد کے بارے میں آپ کو بتاؤں' جس کی آپ تنہا قانونی وارث ہیں۔ میں دراصل ملک سے باہر گیا ہوا تھا' ابھی آیا ہوں تو مجھے بیگم صاحبہ کے انتقال کے بارے میں معلوم ہوا اور یہ ان ہی کی ہدایت تھی کہ ان کی وفات کے بعد یہ سب کچھ آپ کے حوالے کردیا جائے۔" وکیل صاحب نے کہا تو میں نے انہیں آنے کی اجازت دے دی۔

میں نے یہ بات اماں اور بابا کو بھی بتادی اور ان سے چائے اور دیگر لوازمات تیار کرنے کے لیے بھی کہہ دیا۔ اب میں مجبوراً بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگی کیوں کہ میں تو حشام کا انتظار کررہی تھی تقریباً آدھے گھنٹے بعد وکیل صاحب تشریف لے آئے۔

کچھ دیر امی کی تعزیت وغیرہ کرنے کے بعد انہوں نے ساتھ لایا ہوا بریف کیس کھول کر ایک فائل نکالی اور ایک براؤن کلر کا لفافہ نکالا اور بولے۔

"آپ کی امی نے جائیداد کے علاوہ معقول رقم بھی چھوڑی ہے۔" انہوں نے کاغذات دیکھتے ہوئے کہا۔

"بینک میں آپ کے نام تقریباً دو کروڑ روپے ہیں اور تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی مجموعی رقم سے کہیں زیادہ ہے۔"

میں حیران ہورہی تھی کہ امی کے پاس اتنی ساری رقم کہاں سے آئی۔ اس لیے وکیل صاحب سے سوال بھی کر ڈالا۔

"اس سلسلے میں' میں کچھ نہیں جانتا' وکیل کا کام

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

کسی بھی صاحب جائیداد کے سورس کے بارے میں جاننے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ یہ جائیداد انہوں نے کیسے بنائی۔'' پھر فائل اور لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس فائل میں سوائے وصیت نامے کے کچھ اور نہیں ہے' دوسرے کاغذات میں صرف وہ دستاویز ہے جس کے ذریعے بیگم صاحبہ نے آپ کو گود لے کر اپنی تمام جائیداد جو زرعی زمینیں اور باغات پر مشتمل ہے'اس کے علاوہ ایک دو بنگلے جو ڈیفنس میں ہیں'ان کے کاغذات ہیں۔'' پھر وکیل صاحب نے چند کاغذات پر میرے سائن لیے اور سارے کاغذات میرے حوالے کر کے چلے گئے۔

میں ہاتھ میں وہ فائل اور کاغذات لیے بیٹھی امی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ زمینوں اور باغات کے بارے میں تو امی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ان کے پاس کہاں سے آئیں لیکن اتنی بڑی رقم جو انہوں نے بینک میں میرے نام جمع کروائی ہے وہ ان کے پاس کہاں سے آئی'اس کے بارے میں' میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے شمسو بابا مجھے اس سوال کا جواب دے سکیں اس لیے میں نے انہیں بلایا کیوں کہ وکیل صاحب کے آنے کے بعد اماں اور بابا دونوں کمرے سے چلے گئے تھے۔

''شمسو بابا...... شمسو بابا! کہاں ہیں آپ ادھر تو آئیں۔'' میں نے فائل اور لفافہ میز پر رکھتے ہوئے انہیں آواز دی تو وہ میری پہلی ہی آواز پر اندر آ گئے اور بہت مودٔب انداز میں بولے۔

''جی بی بی......!''

''بابا! آپ میرے ساتھ اس طرح سے کیوں بول رہے ہیں......؟'' میں نے ان کا بدلا ہوا مودٔب انداز اور اپنے آپ کو بی بی کہنے پر حیرت سے پوچھا۔

''کس طرح بی بی صاحبہ......؟'' انہوں نے بدستور سابقہ لہجے میں کہا۔

''یہ بی بی صاحبہ کون ہیں؟ میں تو آپ کی بیٹی ہوں...... سرمئی بیٹی! آپ جس طرح پہلے مجھے مخاطب کرتے تھے اسی طرح مخاطب کریں' مجھ سے ادب سے نہیں شفقت بھرے لہجے میں بات کریں' آپ میرے بابا جو ہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''میں آپ کا بابا تو ہوں' مگر ہوں تو ایک ملازم ہی ناں...... بے جی نے مجھے اس وقت ملازم رکھا تھا جب میں ایک نوعمر لڑکا تھا' ان کا خدمت گزار تھا' پھر حمیدہ آ گئی اس کو بے جی کی ماں نے خریدا تھا شاید وہ اسے ناچ گانا سکھاتیں لیکن وہ بھی خاندانی دشمنی کی نذر ہو گئی اور اس کے باپ کے دشمنوں نے اسے اغواء کر کے بے جی کی ماں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

حمیدہ دن رات روتی تھی' اللہ رسول کے واسطے دے کر کہتی کہ وہ یہ کام مرتے دم تک نہیں کرے گی' اس نے بے جی کے پاؤں پکڑ لیے اور اللہ کی قسم کھا کر وعدہ کیا کہ وہ زندگی بھر ان کی خادمہ بن کر ان کی خدمت کرے گی بس اس سے یہ کام نہ کروائیں پھر بے جی کو شاید اس پر رحم آ گیا اور انہوں نے اپنی ماں کو سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ حمیدہ میری خاص ملازمہ ہے۔ ہمیں کون سا اسے تنخواہ دینی ہے' اسے مجھے سونپ دو...... ان کی اماں بڑے مشکلوں سے مانی پھر اللہ کی قدرت کہ وہ شدید بیمار ہو گئی اور دس پندرہ دنوں میں فوت ہو گئیں' پھر بعد میں میری خواہش پر بے جی نے میری اور حمیدہ کی شادی کر دی۔

ہم دونوں مرتے مر جائیں گے لیکن ان کی روح سے بھی نمک حرامی نہیں کریں گے' پہلے ہماری مالکن بے جی تھیں اور اب آپ ہو۔'' شمسو بابا نے پہلی مرتبہ اپنے اور اماں حمیدہ کے بارے میں بتایا۔

''بابا میں کوئی آپ کی مالکن نہیں ہوں میں تو آپ کی بیٹی ہوں اور ہمیشہ بیٹی ہی رہنا چاہتی ہوں۔'' میں نے ہاتھ پکڑ کر بابا کو اپنے برابر میں بٹھالیا اور ان کے کندھے سے سر ٹکالیا۔

''ہمیشہ خوش رہو میری بچی! اللہ پاک دونوں جہاں کی تمہیں خوشیاں نصیب فرمائے۔'' شمسو بابا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو اماں کی آواز آئی ''آمین'' اور میں نے جھٹ آنکھیں کھول دیں اور ان کا بھی ہاتھ تھام کر اپنے برابر میں بٹھالیا۔ اظہارِ تشکر سے دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں میں نے پیار سے اپنے ہاتھوں سے صاف کر دیا' پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے شمسو بابا کو کس لیے آواز دی تھی پھر کہا۔

''بابا! کیا آپ جانتے ہیں کہ امی نے میرے نام بینک میں ایک بہت بڑی رقم چھوڑی ہے' میں حیران ہوں کہ امی کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی' کہیں یہ ان کی سابقہ کمائی کی......!''

''نہیں بیٹی!'' شمسو بابا نے میری بات پوری بھی نہیں ہونے دی۔ وہ اس کا مفہوم سمجھ گئے کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں اس لیے بات کاٹ کر سختی سے کہا۔

''نہیں بیٹی! میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ان پیسوں میں بے جی کی وہ کمائی نہیں ہے' انہوں نے اپنے سارے پیسے سارے زیورات ایک خیراتی ادارے کو دے دیے تھے۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھیں' آپ کی ماں نے جو جواہرات دیئے تھے ان کی مالیت بہت زیادہ تھی' بے جی نے انہیں فروخت کرنے کے بعد یہ معمولی مکان خرید لیا تھا' کچھ رقم گھر کے خرچ کے لیے اپنے پاس رکھ لی' باقی بینک میں جمع کروا دی بعد میں زمینوں اور باغات کی جو آمدنی آتی اس میں سے گھر کے اخراجات کی رقم نکالنے کے بعد ساری رقم بینک میں جمع کرواتی رہتی تھیں۔ پھر اس رقم سے انہوں نے اور بھی زمینیں اور باغات خرید لیے' ایسا کر کے وہ آپ کا مستقبل مضبوط کرنا چاہتی تھیں اور یہ سارے کام میں انجام دیا کرتا تھا اس لیے تمہیں تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' شمسو بابا نے مجھے پوری طرح مطمئن کر دیا ورنہ مجھے یہ سوچ کر ہی کراہیت آ رہی تھی کہ یہ سارا پیسہ شاید امی کی سابقہ زندگی کی کمائی ہے' اگر ایسا ہوتا تو میں اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتی۔

اس وقت دروازے پر بیل ہوئی اور شمسو بابا نے حشام کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے حشام کو اندر بلوایا تو شمسو بابا سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگے۔

''بابا! آپ اسے اندر تو لائیں میں بعد میں اس کے بارے میں بتا دوں گی۔'' میں نے کہا۔

''بیٹی مجھے امید ہے کہ تم نے اپنی امی کی نصیحتوں کو فراموش نہیں کیا ہوگا۔'' بابا نے متانت سے کہا۔

''جی بابا! مجھے اچھی طرح سے یاد ہے' آپ بالکل بے فکر رہیں ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ صرف میرا اچھا دوست ہے اور اب میں اس کے ساتھ ایک نیوز چینل پر جاب بھی کرنے والی ہوں اور اسی سلسلے میں آج رات اس کے ڈیڈی سے ملنے کے لیے ان کے گھر بھی جاؤں گی۔'' میں نے بابا کو اچھی طرح مطمئن کر دیا تو وہ پُرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے حشام کو لینے باہر چلے گئے۔

میں نے حشام کا تعارف شمسو بابا اور اماں حمیدہ سے کروایا اور اماں سے کہا کہ حشام کے لیے دوپہر کا کھانا بنوائے' یہ آج ہمارے ساتھ ہی لنچ کرے گا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد حشام نے مجھے یاد

www.Paksociety.com

دلایا کہ میں نے اسے کس لیے آج گھر بلایا ہے تو میں جا کر امی کی الماری سے وہ تینوں چیزیں لے آئی۔ حشام نے بغور انہیں دیکھا اور رائے دیتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہارے والدین کوئی معمولی فیملی سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ یہ چیزیں تو کروڑوں کی ہیں لیکن ان کی مدد سے تم کس طرح انہیں تلاش کروگی۔''

''اللہ مالک ہے حشام! اگر اسے منظور ہوا تو وہ مجھے مل ہی جائیں گے' ورنہ تو اسی طرح جیتے رہیں گے جس طرح اب جی رہے ہیں۔'' میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی اور ایزی ہوتے ہوئے کہا میری بات سن کر حشام غور سے میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟'' میں اس کے اس طرح گھورنے سے گھبرا سی گئی۔

''میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کیا واقعی تمہارے لیے اس خیال سے پیچھا چھڑانا کہ تمہارے والدین کون ہیں' اتنا ہی آسان ہے جتنا تم ظاہر کررہی ہو......!'' اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''نہیں!'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''میرے لیے یہ ناممکن ہے لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ میں انہیں کس طرح تلاش کروں' میرا مطلب ہے کہ کوئی نقطہ تو ہو جس سے میں اپنی تلاش کا آغاز کروں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میرے والدین کے نام کیا ہیں اور یہ جو چیزیں میرے پاس ہیں انہیں کیا میں ہاتھ میں لے کر گھوموں کہ مجھے بتاؤ ان چیزوں کا تعلق کن لوگوں سے ہے۔'' میں نے روہانسی ہوکر کہا۔

''میرے ذہن میں ایک بات آرہی ہے۔'' حشام نے مسکراتے ہوئے چٹکی بجائی اور کہا۔

''کیا......کیا......؟'' میں نے بے تابی سے کہا۔

''اچھا پہلے تو شمسو بابا کو بلاؤ ان سے مجھے ایک بات پوچھنی ہے۔'' حشام بولا تو میں نے شمسو بابا کو بلوالیا۔ وہ آئے تو حشام نے ان سے پوچھا۔

''بابا آپ کو یاد ہے کہ وہ کون سی تاریخ اور سن تھا جب سرمئی آپ کو ملی تھی؟

''جی ہاں مجھے اچھی طرح سے یاد ہے وہ جولائی کی آخری تاریخ تھی...... ہاں یاد آیا اکتیس جولائی تھی اور سن اٹھاسی تھا۔'' شمسو بابا نے جواب دیا۔

''یہ سوال پوچھنے سے تمہیں کیا حاصل ہوا سوائے اس کے کہ تم نے میری عمر معلوم کرلی۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''پگلی لڑکی! مجھے تمہاری عمر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے چاہے تم نوے سال کی بھی ہو' رہو گی میری لڑا کو دوست ہی' میں یہ سوچ رہا تھا کہ میں ڈیڈی سے بات کروں گا کہ اگر وہ ہمیں اس سن کے اور ان تاریخوں کے پرانے اخبارات نکلوادیں تو ہم دیکھیں گے کہ ان میں کوئی ایسی خبر تو نہیں چھپی کہ کسی گھر سے کوئی بچی غائب ہو...... یا پھر برسات کی اس اندھیری رات میں کسی عورت کے ایکسیڈنٹ کی خبر......میرا مطلب ہے کہ......!'' حشام نے بات ادھوری چھوڑ دی اور میری جانب دیکھنے لگا۔

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے وہ عورت ہوسکتا ہے کہ گھر کی خادمہ ہو جو کسی وجہ سے انتقاماً اس گھر کا بچہ اٹھا کر بھاگ آئی ہو اور کسی انجان آدمی کے حوالے کردیا ہو اور کسی ایکسیڈنٹ میں اس کی موت واقع ہوگئی ہو۔'' میں نے وہ بات صاف صاف کہہ دی جو حشام کہنے میں جھجک رہا تھا۔ ''لیکن اگر ایسی کوئی خبر ہوگی بھی تو کیا اس کے بارے میں تفصیلات بھی چھپی ہوں گی کہ وہ عورت کون تھی......ارے چھوڑو ہماری پولیس تو اتنی ناکارہ ہے کہ وہ سامنے ہوتی واردات کی تفتیش سے جان چھڑاتی ہے جب تک ان کی جیب گرم نہ کی جائے ایک لاوارث کی کھوج کون کرے گا۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''تم نے پہلے ہی سے اتنی ساری باتیں سوچ لیں ذرا اخبارات تو ہاتھ لگنے دو۔'' حشام نے بُرا مان کر کہا۔

''اچھا بابا جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔'' میں نے ہار مانتے ہوئے کہا اور اتنے میں اماں نے آکر کھانا لگنے کی خبر سنادی۔

حشام نے لنچ کیا اور چلا گیا۔ بقول اس کے کہ جب شام کو میں اس کے گھر جاؤں گی تو اخبارات اس کے ہاتھ میں ہوں گے اور میں ہنس پڑی۔ وہ ایسا ہی تھا ہمیشہ کا جلد باز......جس کام کو کرنے کی ٹھان لیتا تھا کر کے ہی دم لیتا تھا۔

میں تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئی۔ اماں نے اب امی کی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ پہلے جب میں کالج اور اسکول سے آکر دوپہر کو ذرا دیر کے لیے لیٹتی تھی تو امی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی تھیں اور میں مزے سے سو جاتی تھی۔ اب یہ کام اماں کرتی تھیں اس لیے اماں بھی میرے پیچھے پیچھے میرے کمرے میں آگئیں اور میرے سرہانے بیٹھ کر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں پھر فوراً ہی بولیں۔

''دیکھو تو کب سے تم نے بالوں میں تیل نہیں ڈالا سارے بال سوکھے ہورہے ہیں۔ اس طرح تو بٹی سارے بال جھڑ جائیں گے۔ تمہیں یاد ہے بے جی کو تمہارے لمبے بال کتنے پسند تھے' وہ خود ان کا خیال رکھتی تھیں۔''

''ہاں اماں! اب امی نہیں رہیں تو میں نے بھی ان کا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کہ انہیں کٹوا ہی دوں......!''

''خبردار......!'' اچانک میرے کانوں میں حشام کی غصیلی آواز گونجی ایک مرتبہ میں نے گری میں بالوں سے گھبرا کر یہی فقرہ اس کے سامنے کہا تھا تو اس نے اسی طرح غصے سے کہا تھا۔

''ارے بیٹے میں ہوں ناں تمہارا خیال رکھنے کو۔'' اماں نے کہا اور اٹھ کر تیل لینے چلی گئیں اور نہ جانے کب تک وہ میرے سر میں مالش کرتی رہیں میں تو سوچکی تھی۔

شام کو اٹھی اور غسل کیا تو اپنے آپ کو بہت فریش فیل کیا' مجھے حشام کے گھر جانا تھا اس لیے میں تیار ہوگئی اور گھر سے نکلنے سے پہلے بابا اور اماں کو مخاطب کر کے کہا۔

''اچھا بابا اماں! میں جارہی ہوں آپ لوگ دعا کیجیے گا کہ جس مقصد کے لیے میں جارہی ہوں اللہ تعالیٰ مجھے اس میں کامیابی عطا فرمائے۔''

''بیٹا! ایک بات کہنی تھی......!'' شمسو بابا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''جی بابا کہیے!'' میں جھک کر کار کی چابی اٹھاتے ہوئے ان کی جانب مڑی۔

''میرا تو خیال یہ ہے کہ تم خوامخواہ اپنے والدین کی کھوج میں اپنے آپ کو ہلکان مت کرو۔ ان کا کوئی پتا نہیں ملنے والا......!''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں بابا!'' میں نے قدرے حیرانی سے کہا۔

''بس تمہاری پریشانی کے خیال سے کہہ رہا تھا۔'' انہوں نے نگاہیں نیچی کر کے بہت دھیمی آواز میں کہا تو میں مشکوک نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی کہ کہیں بابا مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے' اس لیے ان سے یہی سوال کیا تو وہ گڑبڑا گئے اور بولے۔

''قسم لے لو بٹی! میں کیوں تم سے کچھ

www.paksociety.com

چھپانے لگا۔"

اور میں بنا کچھ کہے خاموشی سے باہر نکل آئی باہر میری گرے کلر کی آلٹو کھڑی تھی یہ چھوٹی سی گاڑی مجھے بہت عزیز تھی میں چاہتی تو اس سے بڑی کار بھی خرید سکتی تھی لیکن کیوں کہ یہ مجھے امی نے خرید کردی تھی کہ چھوٹی گاڑی تم آسانی سے ہینڈل کرلو گی اس لیے میں اسے تبدیل نہیں کرنا چاہتی تھی کتنی ہی مرتبہ میں اس کی فرنٹ سیٹ پر امی کو اپنے ساتھ بٹھا کر شاپنگ کے لیے گئی تھی امی گھر سے باہر نکلتے ہوئے حجاب سے اپنے چہرے کو چھپائے رکھتی تھیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد میں حشام کے بنگلے پر پہنچ گئی۔ اس نے اپنے گھر کا ایڈریس بہت اچھی طرح سے مجھے سمجھا دیا تھا اس لیے مجھے کسی بھی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں نے کار سے اتر کر بیل بجائی تو گارڈ نے بڑا گیٹ کھول دیا اور کہا کہ میں گاڑی اندر لے آؤں میں گاڑی اندر لے گئی یہاں دو کاریں پہلے سے کھڑی تھیں لیکن اتنی جگہ باقی تھی کہ دو گاڑیاں مزید کھڑی ہوسکتی تھیں۔

میں کار سے اتری تو حشام میرے استقبال کے لیے وہاں موجود تھا اس نے بہت خوش دلی سے میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے اس کے بنگلے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ساتھ ہی چھوٹا مگر بہت خوب صورت لان تھا درمیان میں ہری بھری گھاس کا فرش اور چاروں جانب خوش نما پھولوں کی کیاریاں تھیں۔

"تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے خصوصاً یہ لان......!" میں نے حشام سے کہا۔

"پہلے یہ خوب صورت نہیں تھا لیکن تمہارے آنے سے یہ مہک اٹھا ہے ذرا ان پھولوں کو دیکھو کس طرح مہک کر خوشی کا اظہار کررہے ہیں۔" اس نے

گرامر

کلاس ٹیچر اپنے اسٹوڈنٹس کو گرامر پڑھا رہے تھے اور ماضی حال مستقبل کی گردانیں سمجھا کر سب سے سوال کیا کہ کوئی ایسا جملہ بنائیں کہ ماضی حال اور مستقبل کا استعمال کیا گیا ہو۔ سب نے ہاتھ کھڑے کردیئے۔ استاد بہت خوش ہوئے۔ ایک لڑکے کو کھڑا کیا کہ جملہ بناؤ۔ وہ فوراً کھڑا ہوا اور بولا سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔

(عابدہ اکرم غوری، راجن پور)

محبت سے چور لہجے میں کہا۔

"اُف! شروع ہوگیا تمہارے اندر کا رومانی ہیرو......!" میں نے اس کی بات کو مذاق میں اڑاتے ہوئے کہا۔

"تم رومانس کرنے ہی کہاں دیتی ہو کٹھور......" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اگر تم باز نہ آئے تو میں یہیں سے واپس چلی جاؤں گی۔" میں نے ایک بار پھر اپنے زور سے دھڑک جانے والے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے اسے دھمکی دی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ جب بھی حشام مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کوئی ایسا فقرہ کہتا تھا تو میرے دل کی دھڑکن کیوں بے قابو ہوجاتی تھی اور میں ہمیشہ اپنے دل کو قابو میں کرلیتی تھی اور ڈانٹ کر کہتی۔ "ہوش میں رہو حشام! صرف میرا اچھا دوست ہے اور کچھ نہیں۔"

"اچھا بابا غلطی ہوگئی لو کان پکڑ لیتا ہوں اندر چلو ممی اور ڈیڈی تم سے ملنے کے لیے بے تاب بیٹھے ہیں۔" اس نے شرارت آمیز لہجے میں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو میں اس کے سامنے اندر کی جانب بڑھ گئی اندر جاتے ہوئے میں نے اس سے سوال کیا

کہ اسے اخبارات ملے یا نہیں تو اس نے جواب دیا کہ ابھی نہیں لیکن مل جائیں گے۔

ہم ڈرائنگ روم میں پہنچے تو حشام کے ڈیڈی اور ممی سے ملاقات ہوئی دونوں بہت پیار اور محبت سے مجھ سے ملے اس کی ممی نے جب مجھے گلے لگا کر پیار کیا اور ڈیڈی نے اٹھ کر شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو نہ جانے کیوں میری آنکھیں چھلک پڑیں حشام کی ممی بولیں۔

"بیٹا! میں آپ کے جذبات سمجھ سکتی ہوں حشام نے مجھے تمہاری ساری کہانی سنادی ہے تمہارے انکل بھی اس سلسلے میں تمہارا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ اگر تمہیں تمہارے اپنے مل جائیں تو کیا ہی بات ہے اور اگر نہ بھی ملے تو بیٹا آج سے تم ہماری بیٹی ہو......!"

"بہت بہت شکریہ آنٹی......انکل!" میں نے ٹشو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا پھر انکل سے کہا۔ "انکل! ہمیں وہ اخبارات......!"

"ارے بھئی یہ سب باتیں تو ہوتی رہیں گی پہلے میری بیٹی کو اچھی سی چائے پلواؤ۔" انکل نے میری بات کاٹ کر کہا اور آنٹی ابھی آئی کہہ کر اٹھ کر چلی گئیں۔ جتنی دیر میں آنٹی ملازمہ کے ساتھ جو چائے کی ٹرالی لے کر آرہی تھیں واپس آئیں میں انکل سے اپنی ملازمت کے سلسلے میں باتیں کرتی رہی انہوں نے بتایا کہ ان کے ایک دوست ایک اخبار کے مدیر ہیں اور انہوں نے ان سے بات کرلی ہے تم دونوں ان کے دفتر چلے جاؤ وہ تمہیں تمہاری مطلوبہ تاریخوں کے اخبارات نکلوا کردے دیں گے رہی بات جاب کی تو ایک نیوز چینل میں آسامی خالی تھی تو تمہاری اور حشام کی جاب کا بندوبست وہاں کردیا گیا ہے۔

دراصل وہ خود ایک جرنلسٹ تھے اور ایک نیوز چینل میں بطور بیورو چیف کام کرتے تھے اس لیے صحافی برادری میں ان کے خاصے گہرے تعلقات تھے اس لیے مجھے ایک امید سی بندھ گئی تھی کہ اگر پرانے اخبارات کے ذریعے کوئی کلیو ملا تو مزید پیش رفت ہوسکتی ہے۔

حشام اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور اس کے والدین نہ صرف اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے بلکہ اس کے ساتھ دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ حشام کے والدین سے میری ملاقات بہت خوش گوار رہی۔

آنٹی تو ضد کررہی تھیں کہ میں ڈنر ان کے ساتھ کروں لیکن مجھے جانے کی جلدی تھی اس لیے میں حشام کے ساتھ اخبار کے دفتر چلی گئی۔

محترم الیاس ہاشمی صاحب نے ہمیں حشام کے والد طلال واحدی صاحب کے ریفرنس سے فوراً اپنے کمرے میں بلوالیا۔ انہوں نے ہمیں ان تاریخوں کے اخبارات بھی دکھائے لیکن اتفاق سے ایسی کوئی بھی خبر ہماری نگاہ سے نہیں گزری۔

میں بہت بد دل ہوئی اور اخبار ہاتھ سے رکھ ہی رہی تھی کہ آخری صفحے کے سب سے نیچے ایک دو کالمی خبر پر میری نگاہ ٹھہر گئی۔ وہ خبر برسات کی اس رات میں ایک عورت کے بارے میں تھی۔ خبر یہ تھی کہ "ایک جواں سالہ عورت پولیس کو ایک روڈ پر بے ہوشی کی حالت میں ملی ہوش آنے پر اس نے بتایا کہ وہ کسی گھر میں ملازمت کرتی ہے اور بیماری کی وجہ سے گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔"

اس کے بعد کے اخبارات میں کوئی اور خبر نہیں تھی میں نے حشام کی توجہ اس خبر پر دلائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

■

www.Paksociety.com

گڑیا

برادرم عمران احمد قریشی
السلام علیکم!
اگر اللہ تعالیٰ انسانی ذات میں کوئی کمی پیدا کرتا ہے تو اسے دوسری صلاحیتیں وافر مقدار میں عطا کرتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ شخص خود یا پھر اس کے ارد گرد رہنے والے لوگ ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے بجائے تمام تر انسانی احساسات کو کچل کر اسے معاشرہ پر بوجھ بنا دیتے ہیں۔
یہ کہانی ایک ایسے انسان کی ہے جو معاشرہ کار آمد شہری بننا چاہتا تھا مگر غرض کے اسیروں نے اسے کھلونا بنا دیا تھا۔
امید ہے یہ کہانی آپ کو ضرور پسند آئے گی۔

والسلام
نوشاد عادل
کراچی

دروازے کی گھنٹی بجی اور ساتھ ہی کچن سے امی کی آواز آئی۔ ''صائمہ! بیٹا جا کر دروازہ کھولو' بھائی آیا ہوگا۔''

میں نے اپنی گڑیا رکھی اور تیزی سے کمرے سے نکل کر باہر کے دروازے کی طرف لپکی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بھیا اندر آئے۔ میں نے جھٹ ہتھیلی پھیلا دی۔ ''بھیا! میری چیز۔''

بھیا نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھیکے سے انداز میں مسکرا کر بولے۔ ''ارے' وہ تو میں بھول گیا۔ چلو بعد میں لادوں گا بلکہ ابھی لا کر دیتا ہوں۔'' وہ باہر جانے کے لیے واپس مڑے۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''رہنے دو بھیا آپ تھکے ہوئے ہو کالج کا راستا بھی لمبا ہے۔ آپ اندر آ جاؤ۔''

بھیا نے رک کر مجھے دیکھا اور دروازہ بند کر کے میرے ساتھ کمرے میں آ گئے۔ انہوں نے میری گڑیا اٹھا کر کہا۔ ''تم آٹھویں جماعت میں پڑھتی ہو اور تم نے اب تک گڑیا سے کھیلنا نہیں چھوڑا۔''

''بھیا آپ خود ہی تو لا کر دیتے ہیں گڑیا۔'' میں نے یاد دلایا۔ ''اور اب خود ہی منع کر رہے ہیں۔''

''اچھا اب میں گڑیا نہیں لاؤں گا۔'' بھیا نے اپنا بیگ اتار کر رکھ دیا۔ جوتے کمرے سے باہر ہی اتار چکے تھے۔ آج ان کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

''کیا ہوا بھائی' تکلیف زیادہ ہو رہی ہے؟'' میں نے غور سے انہیں دیکھا۔ ''سر دبا دوں؟''

''نہیں' نہیں رہنے دو سر میں درد نہیں ہو رہا۔'' انہوں نے منع کر دیا۔ ''بس تھوڑی تھکن ہے آرام کروں گا تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

اتنے میں امی کی آواز آئی۔ ''صائمہ بھائی کے لیے کھانا لے جاؤ۔''

میں نے بھیا سے کہا۔ ''بھیا آپ جب تک منہ ہاتھ دھوئیں میں کھانا لاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آ گئی۔ بھیا مجھ سے تقریباً پانچ سال بڑے تھے۔ بس ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ امی ابو کو ہم دونوں سے بے حد محبت تھی بھیا سے محبت کے ساتھ ساتھ انہیں بڑی توقعات بھی تھیں ظاہری بات ہے وہ ان کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ امی بتاتی ہیں کہ بھیا بڑی منتوں' مرادوں اور دعاؤں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ان کی پیدائش پر رشتے داروں اور محلے میں دل کھول کر مٹھائی تقسیم کی گئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چھوٹی تھی تو بھیا گھر میں میرے ساتھ کھیلتے تھے۔ امی انہیں محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتی تھیں۔ وہ زیادہ تر گھر میں ہی رہتے تھے۔ صرف اسکول جاتے یا پھر مدرسے' جب میں اسکول جانے لگی تو گھر میں بھیا ہی مجھے پڑھاتے تھے۔ وہ میرے بڑے بھائی تھے اور ساتھ ہی ایک اچھے دوست بھی۔ امی اور ابو کی خواہش تھی کہ بھیا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنیں۔ بھیا کو بھی امی ابو کی خواہش کا احساس تھا۔ اس لیے وہ دل لگا کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہوں نے میٹرک میں اے گریڈ حاصل کیا تھا اور اب کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ابو نے انہیں بہت اچھے کالج میں داخلہ دلوایا تھا۔ حالانکہ اس سلسلے میں انہیں بہت بھاگ دوڑ کرنا پڑی تھی۔ تعلقات بھی استعمال کیے اور کافی پیسے بھی خرچ کیے۔ لیکن بھیا کو اس کالج میں داخلہ مل گیا تھا ان کا کالج بہت دور تھا۔ دو بسیں بدل کر جاتے تھے اس طرح واپسی بھی ہوتی تھی۔

میں جب امی سے کھانا لے کر کمرے میں آئی تو بھیا بیڈ پر بیٹھے ہوئے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ ان کے چہرے پر عجیب سی اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھی اور بیڈ کے پاس آ کر بھیا کو غور سے دیکھنے لگی۔

بھیا کو میری موجودگی کا احساس ہوا تو ان کی محویت ٹوٹ گئی۔ وہ جلدی سے بیڈ سے اترے اور بولے۔ ''آ جاؤ تم بھی کھا لو میرے ساتھ۔''

میں نے ان کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے بھیا۔ آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔ کوئی بات ہو گئی ہے کیا؟''

بھیا نے زبردستی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجالی۔ ''کس بات کی پریشانی۔ میں ٹھیک ہوں......! تمہیں تو پتا ہے کہ کالج سے آتے آتے بسوں میں دھکے کھاتے کھاتے برا حال ہو جاتا ہے۔ بس تھوڑی تھکن سی ہو رہی ہے۔''

میں نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا۔ ''تو اب مجھ سے بھی چھپائیں گے آپ؟''

بھیا ہنس دیے۔ ''کیا چھپا رہا ہوں میں۔'' انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ ''یہ دیکھو کچھ بھی تو نہیں ہے ہاتھوں میں' اچھا آ جاؤ کھانا کھا لو۔''

''کھا لیا ہے میں نے۔'' میں نے مختصر جواب دے کر پوچھا۔ ''تو آپ نہیں بتائیں گے نا؟''

''بھئی جب کوئی بات ہے ہی نہیں تو بتاؤں کیا؟'' بھیا نے کھانا شروع کر دیا۔

میں انہیں دیکھتی رہی۔ وہ سر جھکائے کھانے میں مصروف تھے۔ شاید میری طرف دانستہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے کہ میں ان کی آنکھوں میں موجود جھوٹ نہ دیکھ لوں۔

''صائمہ......!'' امی کی آواز دوبارہ آئی۔

''میں خاموشی سے کمرے سے باہر آ گئی۔ بھیا چاہے نہ بتائیں لیکن......! اپنے بھیا کا دکھ میں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ بس میں اسے کبھی زبان پر نہیں لاتی تھی اور نہ کبھی لاؤں گی۔

☆☆

کپڑے تہہ کرتے کرتے مجھے عدیل کا خیال آیا۔ وہ پانی پینے کے لیے باورچی خانے میں گیا تھا لیکن بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں بھی اپنے کام میں اتنی مصروف ہوئی کہ اس کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ پھر بچی کو

بھی دیکھنا تھا۔ جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بڑی مشکلوں سے سوئی تھی۔ میں نے ایک نظر اپنی سوئی ہوئی دو سالہ بیٹی پر ڈالی وہ گہری نیند میں تھی۔ میں کمرے سے نکلی اور آواز لگائی۔

''عدیل...... عدیل......!'' مگر جواب نہ آیا۔

اچانک میری نظر دروازے پر پڑی اس کی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ عدیل گلی میں چلا گیا تھا۔ میں نے پلٹ کر بیٹی کو دیکھا اور فیصلہ کرنے لگی کہ اسے چھوڑ کر گلی میں عدیل کو دیکھوں یا نہیں کیونکہ کبھی کبھی وہ سوتے میں ایک دم ڈر جاتی تھی اور پھر کسی کو اپنے قریب نہ پا کر زور زور سے رونے لگتی تھی۔ ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ مجھے گلی سے عدیل کے رونے کی آواز آئی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں بیٹی کا دھیان جھٹک کر گلی کے دروازے کی جانب لپکی۔ جیسے ہی دروازہ کھولا تو سامنے عدیل کو زمین پر گرے دیکھا۔ وہ رو رہا تھا میں نے لپک کر اسے اٹھایا۔

''کیا ہوا' کیا ہو گیا کس نے مارا ہے میرے بیٹے کو؟'' میں نے چیخ کر کہا۔

کچھ دور چند بچے اور بچیاں موجود تھیں۔ وہ ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''بتاؤ کس نے مارا ہے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''وہ' وہ کاشف نے دھکا دیا تھا۔'' ایک بچی نے سہمی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''پھر وہ بھاگ گیا۔''

میں نے عدیل کے کپڑوں پر لگنے والی مٹی جھاڑی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا۔ میں اسے لے کر گھر میں آ گئی۔

''منع کیا تھا نا' باہر نہیں جایا کرو۔ تم میری بات کیوں نہیں مانتے۔ دیکھ لیا انجام خراب بچے ہیں گلی کے ہمیشہ وہ تمہارے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔''

میں نے عدیل کو پیار سے سمجھایا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی اور وہ بہت معصومیت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار ہو کر میں نے اسے گلے لگا لیا۔

''وعدہ کرو اب باہر نہیں جاؤ گے۔ گھر میں اتنے کھلونے تو ہیں اور پھر بہن بھی تو ہے تمہاری اس کے ساتھ کھیلا کرو۔''

''وہ چھوٹی ہے مجھ سے نہیں کھیلتی۔'' عدیل نے انگلی سے آنکھ مسلتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں تھوڑے دنوں بعد دیکھنا وہ بڑی ہو جائے گی تو خوب کھیلے گی۔'' میں نے اس کے بالوں پر سے مٹی جھاڑی۔ ''چلو آؤ منہ ہاتھ دھلا دوں پھر دوسرے کپڑے پہن لینا۔ آؤ شاباش اگر منی اٹھ گئی تو پھر کام کرنے نہیں دے گی۔''

''امی یہ لوگ میرے ساتھ کھیلتے کیوں نہیں ہیں؟'' عدیل نے بھولپن سے سوال کیا۔ ''جب میں جاتا ہوں تو مجھے بھگا دیتے ہیں۔''

''اس لیے کہ وہ خود گندے ہیں۔ تمہیں بھی کوئی ضرورت نہیں ان کے پاس جانے کی۔ چلو آؤ منہ ہاتھ دھو لو۔ پھر کھانا کھا لینا اس کے بعد مدرسے بھی تو جانا ہے۔'' میں نے کہا۔ عدیل نے سر ہلا دیا۔ میرا بیٹا بہت اچھا ہے پیار سے ہر بات مان لیتا ہے۔ کبھی میں نے یا اس کے ابو نے اسے ڈانٹا نہیں تھا۔ بڑی دعاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں عدیل سے نوازا تھا۔ میرا بیٹا لاکھوں میں ایک تھا۔ ہم دونوں کی آنکھ کا تارا۔ بیٹی بھی دل و جان سے عزیز تھی لیکن ہر ماں باپ کی امیدیں اپنے بیٹوں سے بندھی ہوتی ہیں۔ اپنی بساط سے بڑھ کر ہم اسے پڑھا رہے تھے۔ وہ مدرسے میں دینی تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اسے علاقے کے سب سے اچھے اور مہنگے انگلش اسکول میں داخل کروایا تھا۔ اس پر ہمیں محلے اور خاندان کے کئی لوگوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں ٹوکا بھی تھا۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اتنے مہنگے اسکول میں داخلہ دلانے کی؟'' عدیل کی چچی نے کہا تھا۔ ان کے لہجے میں حسد اور طنز کی آمیزش واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔ ''میں نے بھی تو اپنے جواد کو عام سے اسکول میں داخل کروایا ہے۔ بچے نے پڑھنا ہی تو ہوتا ہے یہاں پڑھ لے یا وہاں پڑھ لے۔ ایک ہی بات ہے۔''

''بس اس کے ابو نے داخل کروا دیا ہے۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

''برا نہیں ماننا نسیمہ' اس کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔'' عدیل کی چچی نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ دیا۔ میں تڑپ کر رہ گئی لیکن منہ سے ایک لفظ نہ کہا۔ دل میں آئی تھی بہت کچھ سنا دوں' مگر خاموش رہی۔ اس قسم کی بہت سی باتیں مجھے سننے کو ملی تھیں۔ اب تو میں نے ان لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دی تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کس کس کو روکتی۔ ویسے بھی مجھے کسی سے کیا لینا دینا۔ میں تو چاہتی تھی کہ میرا عدیل پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن جائے تو پھر میں فخر سے سر اٹھا کر ان لوگوں کو جواب دوں اب بولو کیا کہتے ہو؟ مجھے اور عدیل کے ابو کو یقین تھا کہ وہ دن ضرور آئے گا۔

☆☆

لنچ ٹائم میں' میں نے اپنا ٹفن کیریئر کھولا ہی تھا کہ صابر صاحب آ گئے۔ وہ اپنا لنچ ساتھ لائے تھے۔ پھر انہوں نے ایک شادی کارڈ بھی ٹیبل پر رکھ دیا۔ میں نے کارڈ اٹھایا۔

''یہ کس کی شادی کا کارڈ ہے؟'' میں نے کارڈ کو دیکھا۔

''پڑھ لو کھول کے' پتا چل جائے گا۔'' صابر صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے اب تمہاری یادداشت بھی ساتھ چھوڑنے لگی ہے۔ بتایا تو تھا کہ میری لڑکے علی کی شادی ہو رہی ہے۔''

''ارے ہاں۔'' مجھے ایک دم یاد آ گیا۔ میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''واقعی میری یادداشت کمزور ہونے لگی ہے۔ مبارک ہو بھئی ایک مرتبہ پھر۔''

''خیر مبارک۔ بس لڑکا اچھی جاب پر لگ گیا تو ماں کو فکر ہو گئی اس کی اور پھر مجھے بھی اس کی جاب کی وجہ سے بڑا سہارا ہو گیا ہے۔'' انہوں نے کھانا بھی شروع کر دیا تھا۔ ''پہلے سارے گھر کا بوجھ میرے ہی کندھوں پر تھا اب یوں سمجھو کہ آدھا بوجھ ہو کر رہ گیا ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' میں نے مبہم سا جواب دیا۔

''تمہارا لڑکا کیا کر رہا ہے ابھی؟''

''انٹر میں پڑھ رہا ہے۔ اسے تو جاب کرنے میں ٹائم لگے گا۔'' میں نے بھی کھانا شروع کر دیا۔

''وقت تو پر لگا کر اڑ رہا ہے۔ دیکھ لینا پتا بھی نہیں چلے گا اور تمہارا بیٹا بھی تمہارا بوجھ ہلکا کر دے گا۔'' انہوں نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔

''بڑی امیدیں ہیں مجھے اور میری بیوی کو اپنے بیٹے سے۔'' میں نے چند ثانیے خاموشی کے بعد کہا۔

''سب کو ہوتی ہیں فکر نہیں کرو۔ بہت جلد تم بھی اپنے بیٹے کی جاب کی خوشی سناؤ گے۔'' صابر بھائی بولے۔ ''چلو اب ذرا کھانے پر توجہ دو۔ باتیں تو چلتی رہتی ہیں۔''

میں سر جھکا کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔

☆☆

بس ایک جھٹکے سے سگنل کے پاس آ کر رک گئی۔ دوسری طرف کا ٹریفک رواں ہو گیا تھا۔ میں بس کے پچھلے دروازے کے سامنے اندر کھڑا تھا۔

میں باہر دیکھنے لگا۔ میرے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جس میں میری لکھی ہوئی کئی کہانیاں تھیں۔ مجھے آج کئی ڈائجسٹوں اور رسائل کے دفاتر جا کر یہ کہانیاں دینی تھیں۔ گرمی کافی زوروں پر تھی۔ میں دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ وہی ٹریفک کا ہجوم، لوگوں کی آمد و رفت دکھائی دے رہی تھی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں کی طرف رواں دواں تھے۔ دکانیں بھی کھل چکی تھیں۔ اچانک میری نظر فٹ پاتھ پر کھڑے ایک لڑکے پر پڑی۔

وہ عجیب سا لڑکا تھا۔ عام لوگوں سے کافی مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ میری نظریں اس پر چپک کر رہ گئیں۔ اس کی عجیب سی شخصیت میری دلچسپی کا محور تھی۔ وہ کبڑا تھا۔

زیادہ سے زیادہ اس کی عمر اٹھارہ، انیس سال ہوگی۔ کالج کا یونیفارم پہنے ہوئے تھا۔ سانولی رنگت اور نظر کا چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ اس کی کمر پر اونٹ کے کوہان جیسا نکلا ہوا کُب اس کی شخصیت کو مسخ کر رہا تھا۔ اس کے کُب کی وجہ سے اوپر کا دھڑ سکڑا سمٹا سا ہوگیا تھا۔ جبکہ دھڑ کے مقابلے میں اس کی ٹانگیں لمبی لمبی دکھائی دیتی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ خاصا مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔

میں ابھی بڑی محویت سے اس کا جائزہ لے رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا وہ بھی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔ مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اور میں نے اس پر سے نظریں ہٹالیں۔ میری یہ محویت کہیں اس کی دل آزاری کا سبب نہ بنے۔ میں سڑک پر آگے کی جانب دیکھنے لگا۔ اتنے میں سگنل کھل گیا اور بس آگے بڑھنے لگی۔ میں نے چور نظروں سے اس کبڑے کو دیکھا وہ اب تک مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کبڑے کے سامنے سے دو لڑکے ہنسی مذاق کرتے ہوئے گزرنے لگے تو کبڑے نے مجھ پر سے نظریں ہٹا کر انہیں بڑی یاسیت سے سر تا پا دیکھا۔ میں چونکہ قلم کار تھا لہٰذا مجھے اس کے دلی جذبات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ کبڑا اپنے ہم عمر نارمل اور بے عیب لڑکوں کو دیکھ کر کیا سوچتا ہوگا۔

میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پھر جب میری منزل آ گئی تو اس کا خیال بھی دل سے نکل گیا۔ ایک ہفتے کے بعد مجھے پھر اسی راستے سے جانا پڑا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس بس میں، میں سوار تھا وہ عین اس سگنل پر آ کر رکی۔ تب میں نے اسی کبڑے کو دیکھا جسے ایک ہفتے قبل دیکھا تھا۔ وہ گزرتے ہوئے لوگوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ شاید اپنا اور ان کا جسمانی تقابل کر رہا تھا۔ اس بار اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ نا جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں بس کے آگے بڑھنے سے پہلے نیچے اتر گیا اور اس کی جانب بڑھا۔ تب اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مدہم سی الجھن ابھر آئی تھی۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔

”یار یہ اردو بازار کس طرف پڑے گا۔“ میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

وہ تھوڑا سنبھلا اور آگے کی جانب اشارہ کر کے بتانے لگا۔ ”اردو بازار تو دو سگنل آگے ہے۔ یہاں سے کسی بھی بس میں بیٹھ جائیں سب اسی طرف جا رہی ہیں۔“

”یعنی کہ میں پہلے اتر گیا۔“ میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ ”ابھی ابھی بس سے ہی اترا ہوں۔ کسی نے غلط بتا دیا تھا۔“ پھر چند لمحات خاموش ہو کر ٹریفک کو دیکھتا رہا۔

”تم اسکول میں پڑھتے ہو۔“ میں نے پلٹ کر اس سے پوچھا۔

”جی میں کالج میں پڑھتا ہوں۔“

”تو کالج جا رہے ہو۔“

”نہیں، کالج سے تو آ رہا ہوں۔“ وہ تھوڑا اگڑ بڑا رہا تھا۔

”گھر دور ہے کیا تمہارا؟“

”وہ تو قریب ہے یہاں سے۔“

”تو پھر تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو گھر کیوں نہیں جاتے؟“ میں بات سے بات نکال رہا تھا۔ میرا مقصد صرف اس سے باتیں کرنا اور اس کے بارے میں جاننا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ میں ایک لکھاری ہوں اور مجھے لکھنے کے لیے کہانیوں کی تلاش رہتی ہے۔ اس لڑکے میں مجھے بہت دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ ساتھ ہی مجھے یقین تھا کہ اس سے مجھے ایک زبردست کہانی کا آئیڈیا مل سکتا ہے۔ لیکن اس آئیڈیے کے حصول کے لیے مجھے محنت کرنی پڑے گی اور ٹائم بھی دینا ہوگا۔ اس قسم کے افراد اپنی شخصیت کو سخت خول میں مقید رکھتے ہیں۔ انہیں اس خول سے نکالنا آسان نہیں ہوتا۔

میری بات کا اس پر نا جانے کیا اثر ہوا کہ وہ ایک ...م پانا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے دور جانے ...۔ وہ چلتے ہوئے بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ پہلی بار میں نے غور کیا کہ اس کے کندھے سے ایک بیگ بھی ...لٹک رہا تھا۔ میں بھلا اسے اتنی آسانی سے کہاں جانے دیتا۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔

”ارے بات تو سنو بھائی، یار۔ میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا کہ گھر کیوں نہیں جاتے اور تم ناراض ہو کر چل دیے۔“ میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ ...ی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا اور نا اس نے اپنی ...رلم کی تھی۔ ”میرا مطلب تو کچھ اور تھا اچھا میری سنو یار دو منٹ رک تو جاؤ۔“

وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ ”کیا بات کرنی ہے آپ کو میں تو آپ کو نہیں جانتا۔“

”مگر میں جانتا ہوں۔“ میں نے یہ کہہ کر اسے حیران کر دیا۔

”جانتے ہیں...... مجھے ......مگر کیسے؟“ وہ واقعی خاصا حیران اور قدرے تذبذب میں پڑ گیا تھا۔

”بات یہ ہے کہ..... میں نے تھوڑے دن پہلے بھی تمہیں دیکھا تھا۔“ میں نے تمہید باندھے بغیر بات شروع کر دی۔ ”یقین کرو کہ تمہیں دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ تم میرے دوست کامران سے بہت ملتے ہو۔“

”کامران لیکن، میں کامران تو نہیں ہوں۔“ اس کے لہجے میں تجسس ابھر آیا اور میں یہی چاہتا تھا۔

”میں نے کب کہا کہ تم کامران ہو۔“ میں بڑی چالاکی سے اسے الجھانے میں کامیاب رہا تھا۔ ”میں نے تو یہ کہا ہے کہ تم میرے دوست کامران سے بہت ملتے ہو۔ اصل میں دو سال پہلے وہ کہیں لا پتا ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کو یہ سمجھا ضرور تھا کہ تم کامران ہو لیکن جب میں تمہارے قریب آیا تو پتا لگا کہ تم وہ نہیں ہو۔“

”لگتا ہے وہ آپ کا بہت قریبی دوست تھا۔“ اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

”بہت، بچپن کا ساتھی تھا میرا۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا ”تمہیں دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا کہ میرا دوست کامران میرے سامنے آ گیا ہے۔ مگر، مگر خیر چھوڑو اچھا یار۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں نے بلا وجہ تمہیں پریشان کیا۔“ میں جانے کے لیے مڑا تو اس نے آواز لگائی۔

”ایک منٹ رکیں۔“ وہ میرے نزدیک آ گیا۔ ”مجھے اپنے رویے پر افسوس ہے آپ کی دلی کیفیت اور جذبات کا مجھے علم نہیں تھا..... سوری۔“

"تمہارا انداز بالکل کامران جیسا ہی ہے۔" میں نے اسے غور سے دیکھا واقعی اب مجھے بھی اس سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ وہ بہت معصوم تھا۔

"آپ مجھے کامران سمجھ سکتے ہیں۔ بلکہ اپنا گمشدہ دوست کامران ہی سمجھیں شاید اس سے آپ کو تھوڑی خوشیاں مل جائیں۔"

میں نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لوگ ہمارے قریب سے گزر رہے تھے لیکن اس شہر کی ایک خوبی یہ تھی کہ کوئی کسی کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ سب جلدی میں ہوتے ہیں چاہے کوئی کام ہو یا نہ ہو۔

☆☆

کالج کی چھٹی ہو چکی تھی۔ تمام لڑکے باہر نکل رہے تھے میں اپنے دوستوں کے گروپ کے ساتھ باہر نکلا۔ فیضی نے پارکنگ سے اپنی کار نکالی اور ہم پانچوں دوست اس میں بیٹھ گئے۔

"ہاں بھئی! بریانی کون کھلا رہا ہے؟" فیضی نے کار آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"جمال کھلائے گا آج یہ اپنے باپ کے کافی پیسے مار کر لایا ہے۔" ناصر نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"مارے نہیں ہیں نکالے ہیں۔" جمال نے بے شرمی سے کہا اور سب ہنس دیے۔

"ارے وہ دیکھو وہ کارٹون جا رہا ہے۔" فیضی نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں نے کچھ دور فٹ پاتھ پر عدیل کو جاتے دیکھا وہ ہماری کلاس میں پڑھتا تھا۔ پوری کلاس ہی اس کا مذاق بناتی تھی۔ اور خاص طور پر فیضی تو اس کا پیدائشی دشمن تھا۔ حالانکہ وہ غریب سب کی باتوں کو برداشت کرتا تھا اور منہ سے ایک لفظ نہیں کہتا تھا۔ اکثر میں فیضی کو سمجھاتا تھا کہ اس بے چارے کو تنگ نہ کیا کرے۔

"لگا اس کے پیچھے گاڑی تھوڑی تفریح لیتے ہیں۔" بابر بھی بول پڑا۔

"چھوڑ یار۔" میں نے منع کیا۔ "کیا تم لوگ اس بے چارے کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ کبھی تو بخش دیا کرو اسے روز کلاس میں بھی تنگ کرتے ہو اب باہر بھی تفریح کی سوجھ رہی ہے۔"

"ایک تو یہ وسیم اس کی بڑی حمایت کرتا ہے کہیں یہ اس کا بچھڑا ہوا بھائی تو نہیں ہے۔" بابر نے کہا اس بات پر زوردار قہقہہ لگا یا میں جھینپ کر باہر دیکھنے لگا۔

فیضی نے کار عدیل کے نزدیک لے جا کر زور سے بریک لگائے۔ ٹائر زور سے چرچرائے۔ عدیل بوکھلا کر چند قدم پرے ہو گیا۔ پھر اس نے ہم لوگوں کو دیکھا تو دوبارہ آگے بڑھ گیا۔ فیضی آہستہ آہستہ کار چلانے لگا اور تیز آواز میں بولا۔

"او بھائی ہیرو کہاں جاتا ہے آجا کبھی ہمیں بھی گھاس ڈال دیا کر۔" جمال کھڑکی سے گردن نکال کر بولا۔ "استاد تیرے نخرے تو کمال کے ہیں۔ دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اللہ تیری اکڑ سلامت رکھے۔"

"پاگل ہوا ہے کیا۔" ناصر ہنسنے لگا۔ "یہ اکڑ نہیں رہا اس بے چارے کی چال ہی ایسی ہے۔"

"نہیں کرو یار جانے دو اسے۔" میں نے اپنے دوستوں کو سمجھایا۔ "تم لوگ بھی حد کرتے ہو۔ کسی کے پیچھے پڑتے ہو تو ہاتھ دھو کے پڑتے ہو۔"

فیضی نے جھنجلا کر کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے بابر نے ٹھیک ہی کہا ہے تیرے بارے میں، تو اس کارٹون کا بچھڑا ہوا بھائی ہے۔ چپ چاپ بیٹھا رہ ورنہ تیری بریانی کینسل۔"

میں خاموش ہو گیا۔ میں بھی پہلے ان کے ساتھ مل کر مذاق اڑاتا تھا۔ وہ کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ خاص طور پر فیضی کا شمار تو ان لوگوں میں آتا تھا جو اچھے خاصے انسانوں میں عیب ڈھونڈ کر طنز کا نشانہ بناتے تھے۔ عدیل اس کی ہٹ لسٹ میں پہلے نمبر پر تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ پڑھنے میں بہت ہوشیار تھا اور بہت محنت سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لیکن اپنے جسمانی عیب کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار رہتا تھا۔ ایک بار تو فیضی نے بھری کلاس میں اس کا اتنا مذاق بنایا تھا کہ اس غریب کے آنسو نکل آئے تھے۔ اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا کہ ہم لوگ بہت برا کرتے ہیں۔ تب سے میں اپنے دوستوں کو اس کا مذاق اڑانے سے روکتا تھا لیکن وہ میری بات کو چٹکیوں میں اڑا دیتے تھے۔ ساتھ ہی مجھے ان کی دس باتیں سننے کو ملتی تھیں۔

فیضی اور باقی دوست گاڑی میں سے عدیل کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس پر جملے کستے رہے گاڑی دھیرے دھیرے عدیل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ بہت سے لوگ دیکھ بھی رہے تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی وہ گاڑی میں بیٹھے لڑکوں کو سرزنش کر سکے۔ آخر عدیل ایک بس میں سوار ہوا تو اس کی جان چھوٹی۔

☆☆

مجھے سب یاد ہے۔ بچپن کے وہ دن جب میں گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے چپکے سے باہر نکل جاتا تھا۔ مگر کوئی بھی میرے ساتھ کھیلنا پسند نہیں کرتا تھا اور اگر کوئی بچہ میرے ساتھ کھیلتا بھی تھا تو اس کی ماں یا بھائی وغیرہ اسے مجھ سے الگ کر دیتے تھے کہ اس کے ساتھ نہیں کھیلا کرو۔ میں چھوٹا تو تھا کچھ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ بعض بچے تو جیسے میرے دشمن بن گئے تھے۔ ان میں محلے کا ایک بچہ کاشف بھی تھا۔ وہ اکثر مجھے دھکا دے کر گرا دیتا اور کہتا کہ تم ہمارے ساتھ نہیں کھیلا کرو۔ پھر آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آنے لگا کہ لوگوں کو مجھ سے کیوں نفرت ہے۔ مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میری جسمانی ساخت عام بچوں سے بہت مختلف ہے۔ میری پشت پر ایک بھدا سا کب نکلا ہوا تھا۔ جو پیدائشی تھا۔ کبھی کبھی میں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر کب دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وقت سے پہلے مجھے بہت سی باتوں اور رویوں کی سمجھ آنے لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ دنیا بہت بے حس اور سنگ دل ہے۔ سچے رشتے صرف قریبی ہی ہوتے ہیں۔ میری بہن صائمہ، مجھ پر جان چھڑکتی تھی اور میں بھی اسے دل و جان سے عزیز رکھتا تھا۔ میرا بچپن زیادہ تر اس کے ساتھ کھیلتے کودتے گزرا تھا مگر، مگر میں کبھی کبھی اس کے چہرے پر بھی کرب کی پرچھائیاں دیکھتا تھا۔ ان پرچھائیوں کو وہ مجھ سے چھپانے کی کوشش بھی کرتی تھی اسے میرے دکھ کا احساس ہوتا تھا لیکن کبھی اس نے اظہار نہیں کیا تھا۔

میرے والد عبدالصمد مجھ سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے تھے کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی اچھی نوکری کروں گا اور جلد از جلد ان کا بازو بن سکوں گا۔ وہ اس آس کے سہارے محنت کیے جا رہے تھے اور زندہ تھے، لیکن وہ بھی کبھی کبھی دل گرفتہ و رنجور دکھائی دیتے تھے۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی مگر میں اب ان کی دلی کیفیت سمجھنے لگا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے دل و جان سے ہمیشہ تعلیم پر توجہ دی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ اس گھر کا سہارا مجھے ہی بننا ہے۔

اسکول میں، میں نے ہمیشہ پوزیشن ہی اٹھائی تھی۔ یہ بات دیگر ہے کہ اسکول کے دن میں نے کس قدر کٹھن اور اذیت میں گزارے تھے۔ وہاں بھی مجھے لڑکوں کے طنز اور تمسخرانہ باتوں کا سالوں تک سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان لوگوں کے لیے میں ایک

تفریح کی چیز تھا۔ بعض اوقات میں اس قدر عاجز اور بے زار آ جاتا تھا کہ رونا آ جاتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اپنی کمر پر چپکا ہوا وہ مکروہ گوشت کا غلیظ لوتھڑا کاٹ کر پھینک دوں جس نے مجھے تماشا بنا کر رکھ دیا تھا اور زندگی کی خوشیوں سے محروم کر رکھا تھا۔

اسکول کے بعد میں کالج آیا تو میرے والد نے اپنی مالی استطاعت سے بڑھ کر مجھے اچھے کالج میں داخل کروا دیا۔ اس کام کے لیے انہیں بہت سے پیسے بھی خرچ کرنے پڑے تھے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ابو نے قرض بھی لیا تھا۔ بس وہ چاہتے تھے کہ میں اچھے کالج میں پڑھوں۔ میری بدنصیبی نے مجھے یہاں بھی نہیں بخشا۔ اسکول کے بعد میں نے سوچا تھا کہ کالج میں شاید اچھے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ لیکن یہاں تو پہلے ہی دن سے مجھے لڑکوں نے تماشا بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ لوگ مجھے ایسے دیکھ رہے تھے کہ جیسے میں انسان کے بجائے کوئی اور ہی مخلوق ہوں۔ میرا دل ہی ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ میں ان لوگوں کو جواب دے سکوں۔ صرف خاموشی ہی میرا جواب تھا۔ اتنی ذلت اور رسوائی میں نے برداشت کی تھی کہ میرا دل یا پھر خدا بہتر جانتا ہے۔ لیکن میں گھر میں ان باتوں کا تذکرہ نہیں کرتا تھا۔ میں کسی طرح نہیں چاہتا تھا کہ امی، ابو یا صائمہ کو ان باتوں کا علم ہو۔

بس ایک میری ماں ہے واحد ماں، لگتا تھا کہ اسے مجھ میں کوئی عیب ہی دکھائی نہیں دیتا۔ میں ان کی اولاد جو ہوں۔ شاید اسی لیے وہ مجھے ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک سمجھتی ہیں۔ کبھی کبھی جب میں کالج کے لڑکوں کے طنز کے زہر میں لتھڑی ہوئی باتوں کو سن کر بہت زیادہ دل گرفتہ ہو جاتا ہوں تو اپنی اداسی چھپانے میں ناکام رہتا ہوں ایسے میں میرے چھوٹی بہن صائمہ میری آنکھوں میں تیرتی اداسی کا سبب بھانپ لیتی ہے۔ اس کے باوجود میں نے کبھی اسے کوئی بات نہیں بتائی تھی کہ دنیا والے میرے ساتھ کیسا رویہ رکھتے ہیں۔ بات صرف کالج تک محدود نہیں تھی۔ چاہے بازار ہو، دکان ہو یا بس کا سفر۔ ہر جگہ لوگ مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کبھی کوئی جملہ بھی کس دیتا تھا۔ بعض لوگ ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے تھے جیسے میں کوئی رحم کھانے کی چیز ہوں۔

ایسے میں میری دوستی راشد عزیز سے ہو گئی۔ وہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس نے دو تین ملاقاتوں میں کبھی میرے عیب کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اسے تو بس مجھ میں اپنا گمشدہ دوست کامران دکھائی دیتا تھا۔ اس کی اور میری دوستی اتفاقاً ہی ہوئی تھی۔ میں سڑک کے کنارے کھڑا تھا جہاں کبھی کبھی میں اس خیال سے کھڑا ہو جاتا تھا کہ ایک دم کسی گاڑی کے سامنے آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لوں مگر اسی جگہ راشد مجھے ملا تھا۔ اب اس کی اور میری ملاقاتیں ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک بار میں اسے گھر بھی لے گیا تھا اور امی سے بھی ملایا۔

"آنٹی آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کا بیٹا اتنا شریف اور سعادت مند ہے۔" راشد نے امی سے کہا۔

"یہ تو اللہ کا کرم ہے بیٹا۔" امی نے کہا پھر بولیں۔ "اچھا میں آتی ہوں تم باتیں کرو۔"

"ویسے عدیل، خوش قسمت تو تم بھی ہو۔" امی کے جانے کے بعد راشد نے کہا۔ "اتنی اچھی ماں ہیں تمہاری۔" میں مسکرا کر رہ گیا۔

پھر ہم اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ راشد مجھ سے میری زندگی کے بارے میں پوچھنے لگا۔ محتاط لفظوں میں تب میں نے اس کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ وہ بڑے غور اور انہماک سے میری باتیں سنتا رہا۔ میرے ضبط کے دریا پر لگا ہوا بند ٹوٹ گیا تھا۔ پہلی بار کوئی ایسا ملا تھا جو میرا دکھ جاننا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا دل کھول کر اس کے آگے رکھ دیا تھا۔

☆☆

آج وسیم کالج نہیں آیا تھا اس نے ایس ایم ایس کر کے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں بابر، ناصر اور جمال کلاس میں اپنی مخصوص نشستوں پر براجمان تھے۔ ایسے میں تمام کلاس فیلوز ہم سے الگ تھلگ ہی بیٹھتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ ہمارے نزدیک بیٹھنا اپنی شامت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔ ہم نے خود تو خاک پڑھنا تھا دوسروں کو بھی پڑھنے نہیں دیتے تھے۔ ویسے مجھے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں۔ میرا باپ شہر کا ایک بڑا بلڈر تھا۔ بڑے بڑے آرکیٹکٹس، پلازہ وغیرہ کی تعمیر کرانا اور پھر انہیں فروخت کرنا ان کا کاروبار تھا۔ کروڑوں روپوں کی ریل پیل تھی۔ اکلوتا تھا لہٰذا جانتا تھا کہ باپ کے بعد مجھے ہی اتنا بڑا کاروبار سنبھالنا ہے۔ بڑا آدمی ہونے کی وجہ سے میرے باپ کے تعلقات بھی بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ تھے۔ اس لیے مجھے کبھی کسی کی کوئی پروا نہیں ہوتی تھی۔ جو دل میں آتا کر گزرتا۔ میرے دوست بھی میری تال میں تال ملاتے تھے۔ کیونکہ میں ان پر پانی کی طرح پیسہ خرچ کرتا تھا۔

ابھی کلاس میں ٹیچر نہیں آئے تھے۔ سب اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے اچانک کبڑا عدیل کلاس میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔

"لے استاد آ گئی تفریح بلا لے ادھر۔" ناصر نے عدیل کو دیکھتے ہی کہا۔ اتفاق سے کبڑے کو ہمارے نزدیک سے ہو کر ہی گزرنا تھا۔ جیسے ہی وہ قریب سے گزرنے لگا میں نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کدھر چلے بھیا اونٹ جیسی چال چلتے ہوئے۔ آ جاؤ آج ہمارے ساتھ بیٹھو آ جاؤ۔ بڑی جگہ ہے یہاں۔" میں نے زبردستی کھینچ کر اسے درمیان والی نشست پر بٹھا دیا۔

کبڑے کے چہرے پر شدید گھبراہٹ تھی۔ وہ فرداً فرداً ہمیں دیکھ رہا تھا کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

"یار فیضی، آرام سے یار۔" بابر ہنسا۔ "کہیں اس غریب کا ہارٹ فیل ہی نہ ہو جائے۔"

"مجھے تو کبھی کبھی شک ہوتا ہے کہ یہ خودکش حملہ آور ہے۔" جمال نے انوکھی بات کہی۔

"پاگل تو نہیں ہو گیا ہے تو؟" ناصر نے دانت نکالے اور پیار سے عدیل کے بال سنوارنے لگا۔ "یہ غریب مسکین تجھے خودکش حملہ آور نظر آ رہا ہے۔"

"تو اور کیا۔" جمال اپنی بات پر قائم رہا۔ اس نے آگے بڑھ کر کبڑے کی کمر کے بھدے سے ابھار پر ہاتھ پھیرا۔ "یہ کیا ہے؟ یہ تو خودکش جیکٹ ہے بس اس نے جیکٹ الٹی پہنی ہوئی ہے۔"

جمال کی اس بات پر سب نے زوردار قہقہہ لگایا۔ عدیل کسمسا کر اٹھ گیا۔ بابر نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر زبردستی بٹھایا۔ "اچھا یار ناراض نہ ہو۔ ہم تو ایسے ہی تفریح کر رہے تھے۔ بیٹھ جا۔"

"دیکھ بھئی کیا نام ہے تیرا عدیل...... عدیل کبڑا۔" میں نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں تو ہمارے گروپ کا ممبر بن جا۔ مزے میں رہے گا پیارے۔"

"مم...... مجھے جانا ہے۔" وہ پھر ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس بار اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے بجائے شدید غصے کے تاثرات تھے۔

"وہ تو سب نے جانا ہے ایک نہ ایک دن۔" ناصر نے انگلی اٹھا کر اوپر کی طرف اشارہ کیا۔

"ہٹ جاؤ ہٹو میرے راستے سے۔" ایک دم کبڑا

زور سے چیخا اس کی تیز آواز کلاس میں گونج کر رہ گئی۔ تمام لڑکے پہلے ہی یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔

''ارے ارے۔'' میں نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا پھر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''یہ تو بولتا بھی ہے۔'' اس بات پر وہ ہنس پڑے۔

کلاس میں کسی بھی لڑکے کی ہمت نہیں تھی کہ وہ ہمیں ٹوک سکے۔ وہ لوگ خاموشی سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے اتنے میں ٹیچر آ گئے اور سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

آج چھٹی کے بعد ہمارا ارادہ کالج کے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے کا تھا۔ چھٹی ہوئی تو ہم لوگ کلاس سے باہر آ گئے۔ اچانک بابر نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے وہ دیکھو وہ کبڑا نکلا جا رہا ہے۔ یہ تو بڑا تیز نکلا کیا خیال ہے بھئی؟''

میں نے بابر کو دھکا دیا۔ ''خیال کے بچے پکڑ اسے اپنے مامے کو۔ آج یہ ہمارے ساتھ کرکٹ کھیلے گا۔''

بابر اور ناصر کبڑے کی طرف دوڑ گئے اور راستے میں ہی اسے جا لیا۔ کبڑا انہیں دیکھ کر رک گیا اور متوحش نظروں سے دیکھتا ہو کچھ بولا تھا اس پر ناصر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس دوران میں اور جمال بھی وہاں پہنچ گئے۔

''مجھے دیر ہو جائے گی۔ مجھے گھر جانا ہے۔'' کبڑا بول رہا تھا اس کے لہجے میں بے بسی غصہ اور التجا تھی۔ ''مجھے کرکٹ کھیلنا نہیں آتی دیکھو پلیز جانے دو۔''

''روز ہی وقت پر گھر جاتے ہو آج تھوڑی دیر ہو جائے گی تو کون سی آفت ٹوٹ پڑے گی۔ تھوڑا رک جا یار۔ ہماری خاطر۔'' جمال نے جاتے ہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''چل بھئی زیادہ نخرے مت دکھایا کر۔'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

''میں نہیں جاؤں گا۔ تم کچھ بھی کر لو۔'' اب اس کی بے بسی غصے میں تبدیل ہونے لگی۔

''بیٹا تیرے تو اچھے خاں بھی جائیں گے ہمارے ساتھ۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ورنہ ڈنڈا ڈولی کر کے لے جائیں گے۔''

کبڑے نے ایک دم ناصر کا ہاتھ جھٹک دیا اور تیزی سے ہمارے درمیان سے نکلتا چلا گیا۔

''ابے اس کی ایسی کی تیسی۔'' ناصر کے تو مرچیں لگ گئیں۔ وہ کبڑے کے پیچھے بھاگا۔ میں، جمال اور بابر ہنسنے لگے۔ ناصر اس کے پاس پہنچا اور دوبارہ ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن اس بار ایسی عجیب بات ہوئی کہ ہم لوگ دم بخود رہ گئے۔

جیسے ہی ناصر نے اس کا ہاتھ تھاما۔ کبڑے نے ایک عجیب سی چیخ نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ پر دانت گاڑ دیے۔ اگلی چیخ ناصر کے حلق سے نکلی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ کبڑا ایسی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ کبڑے پر عجیب سا جنون طاری ہو گیا تھا۔ ناصر پاگلوں کی طرح چیخیں مار رہا تھا اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کبڑے نے کسی جنگلی جانور کی طرح اس کے ہاتھ پر دانت گاڑ رکھے تھے۔ ناصر کی چیخیں دور دور تک گونج رہی تھیں۔

ہم تینوں بھاگم بھاگ قریب پہنچے۔ تب بھی کبڑے نے ناصر کی جان نہیں بخشی۔ ناصر اپنی تمام چوکڑیاں بھول چکا تھا۔ وہ اب سوائے چلانے کے کچھ نہیں کر رہا تھا۔ ہم تینوں کبڑے کو الگ کرنے کی کوشش کرنے لگے تب ہمیں پتا چلا کہ کبڑا جتنا کمزور اور ناتواں دکھائی دیتا ہے اتنا ہے نہیں۔ نا جانے اس کے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ ہمیں دانتوں تلے پسینہ آ گیا۔ مگر کبڑے کے دانتوں سے ناصر کا ہاتھ چھڑا نہ سکے۔

اچانک بابر چلایا۔ خون...... خون ناصر کے خون نکل رہا ہے۔''

خون کا سن کر ہمارے ہاتھ پیر پھول گئے۔ دیکھا تو واقعی ناصر کے ہاتھ سے خون نکل رہا تھا اور کبڑے کے منہ پر بھی خون لگا ہوا تھا۔ خون دیکھ کر ناصر کا رہا سہا حوصلہ ہوا ہو گیا۔ اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ تب ہم نے مل کر ایک جھٹکے سے کبڑے کو الگ کر دیا۔ دور سے کئی لڑکے بھی بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ہم شدید بوکھلاہٹ کا شکار تھے۔ کبڑے کے دانتوں نے اس کے ہاتھ کو چبا ڈالا تھا۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی ناصر گرنے لگا تو میں نے اسے پکڑ لیا۔

''فوراً اسے اسپتال لے چلو اٹھاؤ جلدی کرو۔'' میں چیخا۔ ایسے میں کبڑے کا خیال ہمارے ذہنوں سے یکسر نکل چکا تھا۔ ہمیں صرف ناصر کی فکر تھی۔ اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ پر ہم ناصر کو اٹھا کر کار تک آئے کچھ ہی منٹ بعد ہم اسپتال کی جانب اڑے جا رہے تھے۔

☆☆

ایک قلم کار بہت نرم دل ہوتا ہے۔ وہ کسی کے دل کے جذبات اور غم و خوشی کے احساسات کو عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر معنوں میں سمجھتا ہے۔ پھر اپنی تحریروں میں اسے خوب صورت لفظوں کے پیراہن میں پیش کرتا ہے۔

میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ عدیل سے میری بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ میں نے اب تک اسے ایک لمحے بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ اس میں کوئی جسمانی عیب ہے۔ اس بات کو عدیل نے بھی محسوس کیا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے اوراق میرے سامنے پلٹ دیے تھے۔

میں پروفیشنل رائٹر ہوں۔ لکھتا ہوں اور اس کا معاوضہ لیتا ہوں۔ مجھے لکھنے کے لیے نئی کہانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بار میں جو تحریر لکھ رہا تھا وہ عدیل کی تھی۔ وہی میرا مرکزی کردار تھا۔ اب تک میں نے اپنی کہانی تقریباً مکمل کر لی تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں قلم کار بہت رقیق القلب ہوتا ہے۔ وہاں بہت سفاک اور پتھر دل بھی ہوتا ہے اور مجھ میں یہ دونوں خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ میں بڑی سفاکی سے عدیل کی کہانی لکھ رہا ہوں۔

عدیل سے میری ملاقات اکثر ہوتی رہتی تھی۔ میں اس کے گھر جانے سے اس لیے تھوڑا کتراتا تھا کہ وہاں میں اسے ٹھیک سے کرید نہیں سکتا۔ اس کی والدہ اور بہن بھی ہوتی ہے۔ عدیل کے گھر کے نزدیک ایک بڑا پارک ہے۔ وہاں ہم دونوں ملاقات کر لیتے تھے۔ میں اسے اپنے گم شدہ فرضی دوست کامران کے من گھڑت قصے سناتا تھا جن پر وہ آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا تھا۔

اس روز بھی میں مقررہ وقت پر پارک جا پہنچا تھا۔ عدیل ابھی نہیں آیا تھا۔ اتنے میں میرے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ میں نے دیکھا وہ ایک ڈائجسٹ کے ایڈیٹر کی کال تھی۔

''جی فہیم صاحب، حکم؟'' میں نے کال ریسیو کرتے ہی کہا۔ ساتھ ہی میں ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔

''راشد صاحب پرچہ تکمیل کے مراحل میں ہے کمپوزنگ بھی ختم ہونے والی ہے مگر آپ نے اب تک وعدے کے مطابق اپنا ناولٹ نہیں بھیجا۔'' دوسری جانب سے کہا گیا۔

''آپ کبڑے کی بات کر رہے ہیں نا؟'' میں نے کہا۔

''سوری۔ آپ کی آواز ہلکی آ رہی ہے۔''

”میں یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ کبڑے کی کہانی کا پوچھ رہے ہیں نا؟“ اس بار میں نے خاصی تیز آواز میں کہا۔

”جی ہاں‘ جی ہاں‘ اسی کا پوچھ رہا ہوں۔“ فہیم صاحب نے کہا۔

”بس وہ کل یا پرسوں میں خود لے کر حاضر ہوجاؤں گا۔“ میں نے بدستور آواز تیز رکھی۔ ”بس اس کہانی کا اختتام رہ گیا ہے۔ آپ کو بتایا تھا نا کہ یہ ایک سچی کہانی ہے۔ اس کے لیے مجھے ایک کبڑے لڑکے سے دوستی کرنا پڑی ہے۔ بس سمجھ لیں اسی کے واقعات ہیں بڑی محنت لگی ہے۔ فہیم صاحب! ٹائم الگ خرچ ہورہا ہے۔“

”بے فکر رہیں معاوضہ بھی اچھا ملے گا۔ سارے دلدر دور ہوجائیں گے۔“ فہیم صاحب کی ہنستی ہوئی آواز آئی۔ ”چلیں تو پھر ٹھیک میں پرسوں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”اوکے اللہ حافظ۔“ میں نے بات ختم کرکے موبائل جیب میں رکھ لیا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا چند قدم آگے جاکر پلٹا اور پتھر کا بن گیا۔

بینچ کے عقب میں عدیل کھڑا تھا۔

اس کی حالت عجیب ہورہی تھی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ چہرے پر وحشت تھی اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بے یقینی کے عالم میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری زبان خشک ہوکر تالو سے چپک گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ یقیناً اس نے سب کچھ سن لیا تھا۔ شاید اب وضاحت کے لیے میرے پاس کچھ باقی نہ بچا تھا۔

اچانک عدیل پلٹا اور تیزی سے دور ہوتا چلا گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور نہ اسے روکنے کی کوشش کی۔ میرا کھیل ختم ہوچکا تھا۔ چند منٹ تک میں یونہی سنگی بت کی مانند کھڑا رہا۔ عدیل جاچکا تھا۔ مجھے افسوس تھا لیکن اندر کا سفاک اور مطلب پرست قلمکار مطمئن بھی تھا کہ میرا کام پورا ہوچکا اب مجھے اس کبڑے کی دوستی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔



خوف ناک کالی آندھی تھی۔ سخت اندھیرا اور تیز چنگھاڑتی آسیبی ہواؤں کے جھکڑ۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ رات زیادہ ہوچکی تھی۔ سب سو رہے تھے۔ باہر موسم پرسکون اور ٹھہرا ہوا تھا۔ لیکن میرے وجود میں آندھی چل رہی تھی۔ میری نگاہوں کے سامنے لوگوں کے قہقہے لگاتے‘ تمسخر اڑاتے اور جملے کستے چہرے آرہے تھے۔ کبھی فیضی کا چہرہ ابھرتا اور وہ مجھے دیکھ کر ہنسنے لگتا۔ پھر راشد عزیز کا چہرہ ابھرا۔ جس نے سب سے بڑھ کر میرے دل پر ٹھیس لگائی تھی۔ اس کے وہ جملے نشتر کی طرح میرے دل میں پیوست ہورہے تھے۔ جو اس نے پارک میں موبائل پر کسی سے کہے تھے۔ صرف یہ چند افراد ہی نہیں تھے۔ میری زندگی میں ایسے بے شمار لوگوں کا دخل تھا جنہوں نے مجھے انسان تو کیا جانور سے زیادہ حقیر سمجھا تھا۔ کبھی بس میں سفر کرتے ہوئے لوگوں کی حقارت اور مذاق کا نشانہ بنتا رہا۔ اسکول میں گزرا ہوا وقت ایسا تھا جیسے دہکتے ہوئے کوئلوں پر لیٹا ہوں۔ مجھے یاد نہیں گھر والوں کے علاوہ کبھی کسی نے مجھے حقیقی محبت دی ہو یا نارمل انسان کا درجہ دیا ہو۔ یہ تو وہ دنیا ہے جو اچھے خاصے بے عیب انسانوں میں بھی عیب تلاش کرتی ہے مجھ میں تو پھر بھی عیب تھا۔

میں آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا وجود اب تک زلزلے کی زد میں تھا۔ بار بار راشد کے جملے کانوں میں گونج رہے تھے ناصر والے واقعے کے بعد میں کئی دن سے کالج بھی نہیں جارہا تھا۔ ہر جگہ

میری ذات تضحیک کے نشانے پر لے لی جاتی تھی۔ میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوکر خود کو غور سے دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ مجھے آئینے میں ایک مضحکہ خیز جسم دکھائی دے رہا تھا۔ شاید لوگ ٹھیک ہی مذاق اڑاتے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کا قصور نہیں میں ہوں ہی ایسا کہ مذاق بنایا جائے۔

تو پھر...... تو پھر کیا فائدہ ایسی زندگی کا۔ ابھی تو میرے سامنے زندگی کی طویل شاہراہ تھی۔ بہت لمبا سفر طے کرنا تھا۔ کیا باقی سفر بھی ایسے ہی گزرے گا؟ لوگوں کے طعنے‘ طنز اور قہقہے سنتے ہوئے؟ کیا مجھ میں اتنی ہمت ہے؟ میں نے خود سے سوال کیا اور جواب نفی میں ملا۔

میں نے اپنی قمیص اتاری اور آئینے میں خود کو دیکھا۔ گوشت کا ایک بھدا اور مکروہ وجود نظر آیا۔ آج مجھے بھی خود سے کراہیت محسوس ہورہی تھی۔ میں نے تھوڑا ترچھا ہوکر اپنی پشت پر موجود کب دیکھا۔

”کبڑا......!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

اور میں ہنسنے لگا بے بسی کی انتہا تھی۔ بھلا اس سے بڑھ کر بے بسی اور بے چارگی کیا ہوسکتی ہے کہ انسان خود پر ہنسنا شروع کردے۔ میں جانتا ہوں کہ میں اندر سے بہت کمزور ہوں۔ شاید میں اس دنیا کے بے حس انسانوں کی نفرت اور حقارت کا مزید سامنا نہ کرسکوں۔ کمزوروں کا شیوہ یہی تھا کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ ظلم سے لینے کے بجائے خود اپنی ذات کو نقصان پہنچا کر لیتے ہیں۔ میں نے چند روز پہلے کالج میں ناصر کے ہاتھ پر کاٹ لیا تھا۔ یہ کوئی پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک یہ حرکت میں بہت سے افراد کے ساتھ کرچکا تھا۔ خاص طور پر اسکول کے زمانے میں ایسے کئی واقعات ہوئے تھے۔ جب بھی مجھے ذہنی اذیت دے کر عاجز کیا گیا تھا اور میری ذہنی کیفیت کو اس نہج پر پہنچایا گیا کہ مجھ پر جنونی حالت طاری ہوجاتی تھی۔ تب میں ان لوگوں سے لڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ جسمانی طور پر میں اس قابل نہیں تھا صرف ایک یہی طریقہ مجھے آتا تھا کہ میں خود کا مذاق اڑانے والے کو کاٹ لوں۔ فیضی اور ناصر وغیرہ نے بھی مجھے اتنا تنگ کردیا تھا کہ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا اور وہ حرکت کر بیٹھا تھا۔ میرے دل و دماغ میں طوفان تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔



ڈائجسٹ کے تازہ ترین شمارے میں میرا ناولٹ ”کبڑا“ شائع ہوگیا تھا۔ ایڈیٹر کو ناولٹ بے حد پسند آیا تھا۔ میں نے عدیل سے اس کی زندگی کے بارے میں جو کچھ معلوم کیا تھا اسے صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا تھا۔ مجھے اس ناولٹ میں اپنی جانب سے کچھ لکھنا نہیں پڑا تھا۔ سوائے اختتام کے۔ ناولٹ کے اختتام پر میں نے لکھا تھا کہ کبڑے نے ظالم معاشرے کے سفاکانہ اور ناروا رویے سے تنگ آکر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا تھا۔ اس کی محبت کرنے والی ماں اپنے بیٹے کی ناگہانی موت پر نیم پاگل ہوگئی تھی۔ بہن کے لیے یہ صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ باپ کے ارمانوں اور امیدوں کا خون ہوگیا تھا۔ اس کی دنیا بھی تاریک ہوچکی تھی۔ یہ صرف عدیل کی موت نہیں تھی اس کے ساتھ گھر کے تین افراد بھی زندہ درگور ہوگئے تھے۔ ان کے علاوہ کسی کو بھی عدیل کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ان کے معمولات زندگی پہلے کی مانند رواں دواں تھے۔ انہیں تو عدیل کی موت کا تھوڑا سا افسوس بھی نہیں ہوا تھا۔ انہیں تو عدیل جیسا پھر کوئی اور مل جائے گا۔ جسے وہ اپنے مذاق کے نشانے پر رکھ

سکیں۔ بس ناولٹ کا یہ اختتام میں نے اپنی جانب سے لکھا تھا۔

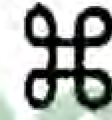
آج مجھے ناولٹ کی پے منٹ کے لیے بلوایا گیا تھا اور میں بس میں ڈائجسٹ کے آفس جا رہا تھا۔ بس جب اس سگنل کے پاس پہنچی تو مجھے یاد آیا کہ پہلی بار میں نے اسی جگہ عدیل کو کھڑے دیکھا تھا اور اسی جگہ میں نے اس سے دوستی کا آغاز کیا تھا۔ ایک بار عدیل نے باتوں باتوں میں مجھے بتادیا تھا کہ وہ سگنل پر اکثر کیوں کھڑا ہوتا تھا۔ جب اسے بہت زیادستایا جاتا تھا تو وہ خودکشی کے ارادے سے یہاں کھڑا ہوجاتا تھا کہ کسی بھی لمحے سڑک پر کود کر کسی گاڑی کے سامنے آجائے گا اور ہر قسم کی ذہنی اذیت سے نجات حاصل کرلے گا لیکن پھر اپنے گھر والوں کا سوچ کر وہ اپنا ارادہ ترک کردیتا تھا۔

بس اسی سگنل پر آ کر رک گئی۔ میں بس کی آخری نشست پر دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ جب میں نے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ خون کی گردش میں ایک دم اضافہ ہوگیا۔ لگتا تھا کہ جسم میں دوڑنے والا خون سست ہوگیا ہے۔ عین اس جگہ......اسی مقام پر......سڑک کے کنارے...... فٹ پاتھ پر......وہی کبڑا لڑکا کھڑا تھا جسے میں نے اپنی کہانی کا مرکزی کردار بنایا تھا۔ ہاں وہ عدیل ہی تھا۔ کیا اتفاق تھا کہ بس عین اس جگہ کھڑی ہوئی کہ وہ اور میں صرف چند گز کی دوری پر رہ گئے۔ عدیل بھی مجھے دیکھ چکا تھا۔ لگتا تھا کہ وقت پر انجماد طاری ہوگیا ہے۔ ہر شے اپنی جگہ ٹھہر گئی تھی۔ عدیل کے چہرے پر ایک عجیب سی گمبھیرتا چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں سگنل کھل گیا اور بس آگے بڑھنے لگی۔ میں بس کے عقب میں ٹوٹے ہوئے پلاسٹک کے شیشے سے عدیل کو دیکھنے لگا۔ وہ اب تک مجھے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے یقین تھا کہ میں پلٹ کر اسے دیکھوں گا۔

میرے دیکھتے ہی عدیل ایک دم اچھل کر ایک تیز فتار بس کے سامنے آگیا۔ بس والے کے پاس بریک لگانے کا ٹائم بھی نہ تھا۔ عدیل گیند کی طرح بس کے اگلے حصے سے ٹکرا کر اچھلا اور کئی فٹ دور جا گرا۔ تصادم اتنا شدید تھا کہ ٹکرانے کی آواز اس شور میں بھی مجھے سنائی دی تھی۔

میرا دماغ ماؤف ہوچکا تھا۔ اچانک ہی یہ سب کچھ ہوگیا تھا جس کے بارے میں میرے وہم وگمان میں نہ تھا کہ میری تحریر کا اختتام حقیقت میں بدل جائے گا۔ سڑک پر ایک غضب کا شور برپا ہوگیا تھا۔ لوگ بھاگتے ہوئے آرہے تھے ٹریفک رکا ہوا تھا۔ کچھ افراد نے بس کے ڈرائیور کو پکڑ کر اتار لیا تھا اور مار رہے تھے۔ ایک افراتفری پھیل گئی تھی۔ پھر یہ مناظر دور ہونے لگے۔ میں جس بس میں سوار تھا وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ شاید لوگ اسے ایک حادثہ سمجھ رہے تھے۔ بعض خودکشی بھی کہہ رہے ہوں گے لیکن میرے نزدیک یہ قتل تھا......ہاں قتل......اور اس کے قتل میں مجھ سمیت بہت سے افراد شریک تھے۔



کرب مسلسل

قابل احترام بھائی عمران احمد'
السلام علیکم!
اللہ تعالیٰ آپ کو بمعہ اسٹاف صحت تندرستی عطا فرمائے۔ عورت اس کائنات کی سب سے عظیم ہستی ہے جس کے بطن سے پیغمبر' اللہ کے ولی بڑے بڑے دانش ور جنم لیتے ہیں۔ اس کے پیروں تلے اللہ تعالیٰ نے جنت رکھی ہے۔ جہاں یہ عظیم ہے وہیں مظلوم بھی ہے مگر اسے مظلوم بنانے میں کسی اور کا نہیں خود اس کی اپنی صنف کا زیادہ ہاتھ ہے جو ماں کے روپ میں تو بچوں پر اپنی جان وار جاتی ہے مگر جب ساس بہو یا مالکن بنتی ہے تو اس کا رویہ ہی تبدیل ہوجاتا ہے۔ یہ تحریر ہمارے معاشرے کی ایک عورت کی ہے اس کی مظلومیت کا ذمہ دار کون ہے اس کا فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔

والسلام
قمر جہاں
حیدر آباد' سندھ

"بی بی مجھے دو دن کی چھٹی چاہیے۔ میری بچی بیمار ہے اور کل سے اسپتال میں داخل ہے۔ ابھی بھی میں وہیں سے آرہی ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ پیسے بھی دے دیں تو مہربانی ہوگی تاکہ میں اپنی بچی کی دوادارو کرسکوں۔" اتنی تفصیلی بات اور وہ بھی ایک نوکرانی کے منہ سے سن کر بیگم اکرام کے تو پتنگے لگ گئے اور وہ تو مانو غصے میں ابلتی' کھولتی جلتے توے پر جابیٹھیں۔

"مہارانی ابھی تو تمہیں یہاں کام کرتے ہوئے صرف دس دن ہوئے ہیں اور تم دو دن کی چھٹی مانگ رہی ہو۔ جبکہ ایک دن کی چھٹی تم اپنے قاعدے اور اصول کے مطابق کرہی چکی ہو اوپر سے ایڈوانس پیسے؟ کیوں تمہارے باپ نے یہاں بینک کھول رکھا ہے؟ جب چاہو یہاں رقم لے جاؤ' ہاں چھٹی میں تم کو دوں گی اور وہ بھی صرف ایک دن کی۔ اگر زیادہ دن کی چاہیے تو لے میں مجھے کوئی اور ملازمہ دے کر جاؤ۔ مگر آج کام تو تم کو کرنا ہی ہوگا اور رہا سوال پیسوں کا' تو اسے دل سے نکال دو مہینہ پورا ہونے پر حساب کرنا۔" اتنا کہہ کر وہ غیظ وغضب کے عالم میں لہراتی بل کھاتی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ مگر ان کی دہاڑ سے گھر کے دوسرے افراد اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل چکے تھے' جن میں ان کی بہوئیں اور بچے شامل تھے۔

فاطمہ روتی ہوئی اپنے کام میں جت گئی۔ جبکہ دونوں بہویں امبرین اور مہرین اپنی ساس بیگم اکرام کے انداز اور الفاظ پر غور کرنے لگیں۔ فاطمہ ان کی نئی ملازمہ تھی اور کچھ دن پہلے ہی آئی تھی۔

وہ دونوں سگی بہنیں تھیں اور ایک ہی گھر میں بہ یک وقت بہو بن کر آئی تھیں۔ دونوں دیورانی' جٹھانی بن کر بھی بہت محبت اور سلوک سے رہتی تھیں۔ گزشتہ پانچ سال سے وہ اس گھر میں تھیں اور پل پل مسز اکرام کی فطرت کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھتی تھیں۔ دونوں کے دو دو بچے بھی تھے۔ سب مل جل کر نہ صرف پیار ومحبت سے رہتے بلکہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتے۔

www.Paksociety.com

بیگم اکرام ان کے دور پرے کے چچا کی بیوی تھیں۔ نوجوانی ہی میں دو بچوں کے ساتھ بیوہ ہوگئی تھیں۔ ان کی ساس ایک روایتی اور ظالم خاتون تھیں۔ جب تک زندہ رہیں انہیں چین سکون نہ لینے دیا۔ دراصل وہ انہیں سبز قدم گردانتی تھیں۔ کیونکہ ان کی شادی کی رات ہی گھر میں ڈاکو گھس آئے۔ نہ صرف لوٹ مار کی بلکہ مزاحمت پر ان کے سسر کو بھی موت کے گھاٹ اتار گئے۔ یوں ویسے سے پہلے ہی شادی والے گھر میں موت کا سناٹا پھیل گیا۔ اس لیے مسز اکرام جن کا نام رابعہ بیگم تھا منحوس اور معتوب ٹھہرائی گئیں۔ مگر اکرام اللہ نے اپنی بیوی کا بہت ساتھ دیا۔ ہر ہر قدم پر انہیں اپنی ماں کے ظلم و ستم سے بچایا' وہ اکثر و بیشتر ان پر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ رابعہ بیگم کے یہاں دو بیٹے اور ایک بیٹی نے جنم لیا۔ بیٹے تو زندہ رہے مگر بیٹی پیدائش کے کچھ ماہ بعد ہی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ تھوڑا عرصہ گزرا تو خود اکرام اللہ بھی معمولی بیماری کے بعد چل بسے۔ بہت سی زرعی اراضی اور موجودہ بڑے سے مکان کے علاوہ انہوں نے بینک میں بھی کافی کچھ اپنے دونوں بیٹوں کے نام چھوڑا تھا۔ چونکہ وہ خود گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے لہٰذا پنشن کی شکل میں تاحال مسز اکرام کو ماہانہ رقم مل رہی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے دونوں بیٹیوں کی تعلیم مکمل کروائی مگر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت میں کافی حد تک چڑچڑاپن' بے زاری اور زبان میں زہریلا پن پیدا ہوگیا تھا۔ بیٹوں کی شادی کے بعد ان کی زبان تو اور بھی دودھاری تلوار بن چکی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنی اس خصوصیت کا اطلاق اپنی دونوں بہوؤں پر کرتی رہتی تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے بھی اکثر ان سے نالاں رہتے اور وہ خود ان سے شاکی۔

فاطمہ کی کہانی بھی اس زمانے کی فرسودہ روایات کے گرد گھومتی تھی۔ اس کے باپ عبداللہ نے اس کی ماں حاجرہ سے پسند کی شادی کی تھی۔ گاؤں کے سالانہ میلے میں اس نے حاجرہ کو اپنی سکھی سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھولتے دیکھ لیا تھا اور وہیں پر دل ہار گیا۔ میلے سے واپسی پر حاجرہ اور دیگر لڑکیوں کا پیچھا کرکے اس نے اس کا گھر دیکھ لیا اور اپنی ماں زہرا کو بصد ضد اور بحث و تکرار حاجرہ سے شادی کرانے پر راضی کر ہی لیا۔ مگر چونکہ غریب ماں باپ کی بیٹی تھی اس لیے وہ اپنے جہیز میں زہرا کی حسب منشاء چیزیں نہ لاسکی۔ یوں رات دن عبداللہ کی ماں اپنی زبان کے تیروں سے اسے چھلنی کرتی رہتی اور وہ سننے پر مجبور رہتی۔ ایک سال بعد عبداللہ کے یہاں خوشی کے آثار پیدا ہوئے۔ جس دن حاجرہ کے یہاں فاطمہ نے جنم لیا' اسی رات کھیتوں سے گزرتے ہوئے عبداللہ کو سانپ نے ڈس لیا۔ اس طرح فاطمہ منحوس ثابت ہوئی۔ پھر اس کی دادی زہرا' اسے فاطمہ کے بجائے منحوس کے نام سے پکارتی۔ دن بدن وہ مزید زہریلی ہوتی چلی گئی۔ رات دن دونوں ماں بیٹیوں پر اپنا زہر انڈیلتی رہتی۔ فاطمہ جب تھوڑی بڑی ہوئی تو حاجرہ اپنی ساس زہرا کے حکم پر گاؤں کے پٹواری اور منشی کے یہاں کام کرنے چلی جاتی۔ جو وقت بچتا اسے کھیتوں میں لگاتی۔ اس طرح گھر کا چولھا جلتا اور خود زہرا سارا دن اپنی ہمسائی عورتوں سے حاجرہ کے بارے میں نفرت انگیز باتیں کرکے وقت گزارتی۔ ننھی فاطمہ کا ذہن ان باتوں کو سن سن کر طرح طرح کی سوچوں کی آماجگاہ بن جاتا۔ اور وہ بڑی ہوتی گئی۔

تھوڑا وقت اور سرکا' ایک دن عبداللہ کی ماں زہرا شدید گرمی سے بے حال ہوکر جلدی جلدی غسل خانے کی طرف جارہی تھی جو صحن کے دوسرے سرے پر تھا۔ کچھ دیر پہلے ہمسائی کے ساتھ اس کے بچے آئے تھے جنہوں نے کیلے کھا کر سارے صحن میں چھلکے پھیلا رکھے تھے۔ جلدی کے مارے زہرا وہ چھلکے نہ دیکھ سکی اور اس بری طرح پھسلی کہ اپنی کولھے کی ہڈی تڑوا بیٹھی۔ ہمسائی چونکہ دیوار پار ہی تھی' شور شرابا سن کر اندر آئی' اس وقت فاطمہ دادی کے حکم پر اس کے حقے کے لیے تمباکو لینے گئی ہوئی تھی۔ ہمسائی نے چیختی پکارتی زہرا کو دیگر پڑوسیوں کی مدد سے اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ جلد ہی حاجرہ کو خبر کی گئی اس وقت وہ پٹوارن کے گھر کپڑے دھو رہی تھی۔ اس لیے اسے آنے میں کافی وقت لگ گیا۔ کیونکہ پٹوارن نے اجازت ہی دی کہ وہ ادھورا کام چھوڑ کر چلی جائے۔ جب وہ گھر پہنچی تو شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ زہرا کی پوری ٹانگ سوج کر کپا بن چکی تھی۔ اور اس کی درد سے در و دیوار ہل رہے تھے۔ ہمسائی نے اپنی سوجھ بوجھ سے اس کی ٹانگ پر تیل اور ہلدی کا لیپ کر رکھا تھا۔ مگر اسے کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ پھر گاؤں کے لوگوں نے اسے ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا۔ گاؤں کا واحد سرکاری اسپتال بھی تقریباً کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ سواری کا بھی کوئی مناسب انتظام نہ تھا۔ اس لیے صبح ہونے تک اس مسئلے کو چھوڑ دیا گیا۔ پٹواری اور منشی کے یہاں جیپ اور گاڑی دونوں تھیں مگر وہ ایک کمی کمین کو کیسے اپنی گاڑی میں بٹھاتے لہٰذا کورا جواب دے دیا گیا۔ گاؤں کے چند افراد مل کر اسے چارپائی سمیت اسپتال لے جانے پر راضی ہوئے۔ اس طرح دوپہر کے بعد زہرا اسپتال پہنچی' اس وقت تک تمام ڈاکٹر جاچکے تھے صرف ایمرجنسی میں ایک ڈاکٹر کھانے کے بعد بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ایک دو نرسیں بھی نظر آرہی تھیں۔ ڈاکٹر نے معمولی سا معائنہ کیا اور بجلی نہ ہونے کی وجہ سے ایکسرے نہ ہونے کا عذر تراش لیا۔ جبکہ ایمرجنسی کے لیے جنریٹر بھی موجود تھا۔ لہٰذا دوسرے دن صبح نو بجے کے بعد ڈیوٹی ڈاکٹر نے آکر زہرا کی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ اس نے گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے داخل کرنے کا کہا۔ کولہے کی ہڈی نہ صرف ٹوٹی ہوئی تھی بلکہ شدید قسم کی ضرب لگنے کی وجہ سے گہرے زخم بھی اندرونی طور پر تھے۔ جو بروقت مناسب طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے کافی خراب ہوچکے تھے۔ تین دن بعد سب لوگوں کو زہرا کی چوٹ کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ زہرا کو داخل کرنے کے کچھ دن بعد اس کا آپریشن کرکے کولہے تک ٹانگ کاٹ دی گئی کیونکہ پوری ٹانگ میں زہر سرایت کرچکا تھا۔ اس لیے کافی دن اسپتال میں رہنے کے بعد زہرا جانبر نہ ہوسکی اور اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اب حاجرہ اور اس کی بیٹی فاطمہ گھر میں اکیلی رہ گئیں۔

فاطمہ بڑی ہورہی تھی۔ بہ مشکل چودہ سال کی ہوئی تو وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ گاؤں کے چوہدری کے یہاں کام پر جانے لگی۔ منشی اور پٹواری کی بیویوں نے ان دونوں کو اپنے یہاں کام دینے سے منع کردیا تھا۔ ان دنوں چوہدری کا منجھلا بیٹا سعد شہر سے گاؤں آیا ہوا تھا۔ وہ شہر میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے رہتا تھا۔ ساتھ ہی دوسرے مشاغل بھی جاری و ساری تھے مگر ان کے

متعلق صرف چوہدری کو ہی علم تھا۔ باقی گاؤں والے لاعلم تھے۔

اس نے جو فاطمہ کا بے مثال حسن دیکھا تو لٹو ہوگیا اور اس پر ہاتھ صاف کرنے کا سوچنے لگا۔ وہ آتی جاتی فاطمہ کے راستے میں کھڑا ہو جاتا اور اس سے طرح طرح سے اپنی جھوٹی محبت کا اظہار کرتا۔ کچھ دن تو فاطمہ نے اس کی حرکتیں اور باتیں برداشت کیں لیکن ایک دن اس نے اپنی ماں حاجرہ سے اس کا ذکر کردیا۔ حاجرہ تو یہ سنتے ہی پریشان ہوگئی۔ اس نے اپنے پاس پڑوس اور جاننے والوں سے فاطمہ کے لیے کوئی مناسب رشتہ تلاش کرنے کا کہا۔ اب وہ خود فاطمہ کو چوہدری کے یہاں کام پر لے کر جاتی اور ساتھ ہی لاتی۔ سعد کچھ دنوں کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کے پروگرام پر نکلا ہوا تھا۔ خدا جانے وہ کس قسم کا شکار کررہا تھا۔ یہ تو بس خدا ہی جانتا تھا۔

آخر کار گاؤں کا ہی ایک رہائشی وزیرا اپنے بیٹے سمیر کے لیے فاطمہ کا رشتہ مانگنے حاجرہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہ حاجرہ کو اس وقت سے جانتا تھا جب سے وہ بیاہ کر گاؤں میں آئی تھی۔ اس کے بیٹے سمیر نے آٹھ جماعتیں پاس کی ہوئی تھیں اور اس وقت وہ شہر کی ایک مل میں بطور ورکر کام کررہا تھا۔ گاؤں والے اس کی شرافت کی قسم کھاتے تھے۔ ویسے تو اللہ جانتا ہے' پھر جونہی سمیر ماہانہ چھٹی پر گاؤں آیا فاطمہ سے اس کی منگنی کردی گئی اور شادی ایک ماہ بعد ہونا طے پائی سمیر نے اس اچانک افتاد پر بہت واویلا مچایا مگر باپ کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ جونہی سعد شکار سے لوٹا حاجرہ نے فاطمہ کو حویلی جانے سے بخار کا کہہ کر روک لیا اور یہ حقیقت بھی تھی۔ فاطمہ کو مسلسل کئی دن سے بخار آرہا تھا' اور وہ پیلی پھٹک پڑ گئی تھی۔ اب صرف اکیلی حاجرہ کام پر جاتی اور دروازے کو باہر سے تالا لگا جاتی۔ چوہدرائن کے فاطمہ کی طبیعت پوچھنے پر اس نے کہا کہ فاطمہ کا بخار ٹوٹ ہی نہیں رہا ہے اسے ملیریا ہوگیا ہے اور مسلسل علاج کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس کی خالہ آ کر اسے شہر لے گئی۔ جبکہ اس کی کوئی خالہ تھی ہی نہیں۔ جس وقت چوہدرائن کی حاجرہ سے گفتگو ہورہی تھی سعد بھی وہیں دالان میں ہی موجود تھا۔ لہٰذا اسے بھی فاطمہ کی غیر حاضری کے متعلق علم ہوگیا۔ دوسرے دن علی الصبح سعد بھی شہر واپس چلا گیا۔ کیونکہ اس کی چھٹیاں ختم ہوچکی تھیں۔ اور نیا سیشن شروع ہوگیا تھا۔

پھر سمیر سے فاطمہ کی شادی ہوگئی۔ کچھ دن تو فاطمہ سمیر کے ساتھ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتی رہی' اس مرتبہ سمیر کافی دن گاؤں میں رہا تو لوگوں سے ملنا ملانا بھی ہوتا رہا۔ ایک دن اسے سعد کے ایک منہ چڑھے ملازم سے سعد اور فاطمہ کے بارے میں کچھ سن گن ملی۔ فاطمہ سے پوچھ تاچھ پر وہ فاطمہ سے مطمئن نہ ہوا۔ حالانکہ فاطمہ نے اسے بلا کم و کاست ساری بات بتادی تھی مگر وہ اپنی سادگی میں ماری گئی۔ رات دن سمیر اسے سعد کے حوالے سے طعنے دیتا۔ جب بھی چھٹی میں آتا فاطمہ کو شک کے تیروں سے چھلنی کرتا رہتا کہ ''تمہیں سعد یاد آتا ہوگا کیونکہ تم اکثر کھوئی کھوئی اور خاموش رہتی ہو'' جبکہ وہ اس ڈر اور خوف سے چپ رہتی کہ اگر کبھی سعد اور سمیر کی ملاقات ہوگئی تو وہ سمیر کو اس کے متعلق کوئی اور ہی کہانی نہ سنادے۔ سمیر کی بات کے جواب میں فاطمہ خاموش رہتی تو بھی سمیر اسی کو مجرم گردانتا اور اگر جواب دیتی تب بھی معتوب

ٹھہرائی جاتی۔ یوں وہ ذہنی طور پر حد درجہ پریشان ہوگئی۔ بات کرتے کرتے بھول جاتی' اکثر و بیشتر کام کرتے کرتے ہاتھ روک کر خلا میں تکنے لگتی۔ اسی دوران فاطمہ امید سے ہوگئی مگر سمیر کو کوئی خوشی نہ ہوئی جبکہ اس کے ماں باپ اس خبر کو سن کر بہت خوش ہوئے۔ سمیر نے فوراً فاطمہ سے کہہ دیا کہ ''اگر لڑکی ہوئی تو وہ فاطمہ کی چھٹی کردے گا۔'' گویا لڑکا یا لڑکی پیدا کرنا انسان کے بس کی بات ہے۔ (نعوذ باللہ) پھر خدا کی شان کہ فاطمہ نے ایک لڑکی کو جنم دیا۔ سمیر نے اپنے عہد کے مطابق فاطمہ کو فوراً طلاق دے کر اسے اس کے گھر بھجوا دیا اور لڑکی سے بھی کوئی واسطہ نہ رکھنے کا اعلان کردیا۔ اس مرتبہ اس کے ماں باپ بھی مجبور ہوگئے۔ اس کے سر پر تو شیطان سوار تھا سو وہ اپنی سی کر گیا۔ اس طرح فاطمہ بے آسرا ہوگئی۔ مگر اس کو اپنی ماں حاجرہ کا سہارا تھا اور ویسے بھی خدا کا سہارا تو تھا ہی۔ ایک بار پھر دونوں ماں بیٹیاں مل کر خوب روئیں۔ اس مرتبہ ان کے ساتھ ایک تیسری آواز ننھی عاصمہ کی بھی شامل تھی جو اپنی ماں اور نانی کے غم میں برابر کی شریک تھی۔ فاطمہ نے اپنی بیٹی کا نام عاصمہ رکھا تھا۔ اتنا تو فاطمہ اپنی رخصتی پر بھی نہیں روئی تھی۔ گاؤں میں طرح طرح کی باتیں فاطمہ سے متعلق پھیل رہی تھیں جن کو پھیلانے والا کوئی اور نہیں بلکہ صرف اور صرف سمیر تھا۔ ان دونوں کا اب گاؤں میں رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگیا تھا۔ اس لیے حاجرہ نے اپنا مکان بیچنے کا فیصلہ کرلیا مگر جاتی کہاں؟ رضیہ اس کی دکھ سکھ کی ساتھی بھی تھی' اس نے حاجرہ کا مسئلہ سن کر شہر میں اپنی چچازاد زرینہ سے رابطہ کیا اس کا شوہر ایک پراپرٹی ڈیلر تھا۔ ایک دن وہ زرینہ کے ساتھ رضیہ کے گھر آیا پھر حاجرہ سے مل

alislampk.com
ملک کا منفرد دینی و اصلاحی رسالہ
ماہنامہ
الاسلام
کراچی
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیر ادارت
قیمت: 20 روپے
دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد
خوابوں کی تعبیر: حافظ عبدالقیوم نعمانی
اسلام اخوت بھائی چارے اور تہذیب شائستگی کا
اپنے دین کو جاننا اور سمجھنا ہر مسلمان پر فرض
اپنا ضابطہ حیات ہے
دنیائے اسلام کے تمام مسالک سے متعلق
علماء کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل
وہ سب کچھ جو آپ جاننا اور پڑھنا چاہتے ہیں
پتا: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی
فون: 35260771/2 فیکس: 35260773
alislamkhi@gmail.com

www.Paksociety.com

www.paksociety.com

کر مکان دیکھا۔ رضیہ اور اس کے شوہر نے اسے حاجرہ کی دکھ بھری کہانی سنائی اور شہر میں اس کے لیے کچی آبادی میں کوئی معمولی سا مکان دیکھنے کی بات بھی کی۔ اس نے ہامی بھرلی' واپس جا کر اس نے ایک ہفتے بعد رضیہ کو حاجرہ کا مکان دیکھنے کے لیے ایک پارٹی کے آنے سے متعلق فون کر کے مطلع کیا۔ اس کے علاوہ اس نے کچی آبادی میں حاجرہ کے لیے ایک کچے پکے مکان کا بندوبست بھی کر دیا تھا جو بہت سستا تھا۔ آنے والوں کو بھی حاجرہ کا مکان پسند آیا۔ انہوں نے اسے خریدنے کا عندیہ بھی دے دیا۔ کچھ دن بعد زرینہ کے شوہر نے رضیہ کی موجودگی میں تین لاکھ کا چیک حاجرہ کے حوالے کیا۔ اب مکان کتنے کا بکا یہ تو وہ جانتا ہوگا یا اللہ اس کے علاوہ حاجرہ کے لیے شہر میں مکان کا بندوبست بھی ہو چکا تھا۔ حاجرہ نے اپنا سامان سمیٹا اور دونوں ماں بیٹیاں شہر میں جا کر رہنے لگیں۔ زرینہ کے شوہر نے فاطمہ اور حاجرہ کو ساتھ لے جا کر ایک بینک میں اکاؤنٹ کھلوا کر ان کا چیک جمع کرا دیا۔ تب ان دونوں نے سکون کا سانس لیا۔

کہتے ہیں کہ اگر بیٹھ کر کھایا جائے تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جاتا ہے۔ تقریباً ایک سال تک بیٹھ کر کھانے سے ان کے پاس موجود رقم کافی حد تک ختم ہوگئی۔ مکان میں تعمیری کام کے علاوہ 'نل بجلی اور گیس کے کنکشن بھی لگوائے گئے۔ اس کے علاوہ حاجرہ کی بیماری' گھر کا خرچہ' بچی کا دودھ اور دوا دارو کے ساتھ ساتھ ہزار طرح کے خرچے۔ لہٰذا اب بینک میں موجود رقم صرف چند ہزار روپے رہ گئی۔ تب پھر فاطمہ نے گھروں میں کام کرنے کا سوچا کیونکہ وہ پڑھی لکھی نہ تھی ورنہ کوئی ڈھنگ کا کام سوچتی۔ لے دے کر ایک ہی راستہ باقی بچا تھا۔ سو اس نے آس پاس کے لوگوں سے ذکر کیا۔ لیکن وہ بستی تو خود غریب لوگوں کی تھی۔ اسی دوران رضیہ کی کزن زرینہ اس کی خیر خبر لینے آ پہنچی۔ یوں وہ اس کی نوکری کا وسیلہ بن گئی۔ اس نے فاطمہ کے گھر سے کافی دور ایک صاحب ثروت گھرانے میں مسز اکرام سے بات کروادی۔ مسز اکرام سے زرینہ کی کئی سالوں سے صاحب سلامت تھی۔ یوں فاطمہ اس گھر میں کام کر رہی تھی۔ مگر اس کی لڑکی بہت بیمار تھی۔ اور دو دن سے اسپتال میں بھی داخل تھی۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کو شدید ٹھنڈ لگی تھی کیونکہ دن میں تو حاجرہ اس کو رکھتی تھی' جبکہ وہ خود بھی بیمار تھی۔ فاطمہ مسز اکرام ہی کے علاقے میں ایک اور گھر میں کپڑے دھونے کا کام بھی کرتی تھی' تاکہ آمدنی میں اضافہ ہو سکے سارے دن پانی میں کام کرنے کے بعد فاطمہ شام کو گھر جاتی تو بچی کو فیڈ کرواتی تو وہ ٹھنڈ اس کو گھیر لیتی۔ دوسرے' حاجرہ بھی دن میں اس کو دودھ کبھی ٹھنڈا تو کبھی گرم دیتی۔ اور بعض اوقات تو فیڈر بھی بغیر دھلی ہوتی۔ اس طرح نہ صرف بچی کی سانس کی نالی بلکہ پھیپھڑے بھی متاثر ہوئے۔

فاطمہ کی یہ کہانی تمام گھر والوں نے زرینہ کی زبانی سنی جو مسز اکرام کے یہاں آتی جاتی رہتی اسی نے فاطمہ کو یہاں نوکری بھی دلائی تھی۔ فا روزانہ پیدل چل کر کام پر آتی کیونکہ بس کا کو روٹ نہ تھا اور رکشے کا کرایہ برداشت کرنا اس بس سے باہر تھا۔ فاطمہ روتی گئی اور کام بھی نمٹا گئی۔ کیونکہ اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ ا عرصے میں دونوں بہنیں امبرین اور مہرین اسی بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ دونوں کی یہی تھی کہ "یا اللہ اس مظلوم کی بچی پر رحم کر۔" اسے زندگی بخش دے۔ جب فاطمہ اپنے جانے کا بتانے کے لیے لاؤنج میں آئی تو امبرین نے اسے پانچ سو روپے پکڑا دیئے اور ہونٹ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً سر جھکا کر گھر سے باہر نکل گئی۔ اس کے ہونٹ چپ مگر دل سے امبرین اور مہرین کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں۔

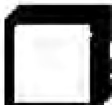
فاطمہ بھاگم بھاگ اسپتال پہنچی تو پتہ چلا کہ بچی کو تیز بخار اور بے ہوشی ہے۔ نہ ہی ڈرپ چڑھ رہی تھی' رک چکی تھی' ڈاکٹر بھی پریشان اور فکر مند تھے۔ گو کہ سرکاری اسپتال تھا مگر اچھے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ "ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے میری بچی کو بچا لیں۔" اس کی کرلاتی چیخ سے ڈاکٹر احمد بھی ایک لمحے کو لرز کر رہ گئے۔ "بی بی اللہ پر بھروسہ رکھو اسی سے دعا کرو۔ بے شک وہ تنکے میں جان ڈالنے والا ہے۔" انہوں نے سنسناتی آواز میں کہا۔ پھر فاطمہ وہاں رکی ہی نہیں۔ اس نے فوراً اسپتال سے دوڑ لگائی اور گھر آ کر ہی دم لیا۔ کپڑے لیے اور غسل خانے میں گھس گئی۔ نہا کر فوراً دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے بہتری کی دعا کی اور اپنی بیٹی کی زندگی کے لیے التجا کرنے لگی۔ مگر پتہ نہیں کون کتنی زندگی لکھوا کر لایا ہے۔

ابھی وہ سجدے میں پڑی رو رو کر اللہ سے بچی کے لیے دعا کر رہی تھی کہ رکشہ رکنے کی آواز آئی۔ گود میں بچی کو لیے حاجرہ کمرے کے اندر آئی۔ اس نے سجدے سے سر اٹھا کر دیکھا اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔ حاجرہ خاموشی سے بچی کو پلنگ پر لٹا کر سر جھکا کر آنسو بہانے لگی۔ وہ فوراً اٹھی' بچی کو دیکھا تو وہ خاموش تھی۔ اس نے سینے پر دوہتڑ مارا اور بین کرنے لگی۔ رونے کی آواز سن کر اردگرد کے مکانوں کی عورتیں جمع ہونے لگیں۔ پھر فاطمہ کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب اس کی بچی سفر آخرت پر روانہ ہوگئی۔ وہ ہوش میں آئی تو اس کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ وہ بالکل خاموش ہو چکی تھی۔ آج بھی وہ خاموش ہے۔ حاجرہ زبردستی اس کے منہ میں کچھ ڈال دے تو ڈال دے ورنہ وہ خود تو ہوش و خرد سے بیگانہ ہی ہے۔ جبکہ خود حاجرہ بھی اپنی بیماری' تفکرات اور پریشانیوں کی وجہ سے نڈھال ہو چکی ہے۔ محلے والے ہی ترس کھا کر ان کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔

قارئین یہ ایک فاطمہ ہی کی نہیں پتہ نہیں کتنی لڑکیوں کی کہانی ہے جو روزانہ ہمارے اس روایتی معاشرے میں دہرائی جاتی ہے۔ مگر ہم لوگ بالکل خاموش تماشائی بنے تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی آواز اس سنگدل معاشرے کے خلاف نہیں اٹھاتے۔

"بھلا اکیلا چنا بھی کبھی بھاڑ پھوڑ سکتا ہے؟"

ہمارا مذہب' ہمارا دین' ہمارا قرآن اور ہمارا نبی تو ہمیں کچھ اور ہی تعلیم دیتا ہے اور ہم مکمل طور پر اس سے انحراف کرتے ہیں پھر بھی خود کو مسلمان کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ کیا مسلمان کی شان اور پہچان یہی ہے کہ کسی کو کمتر گردانے؟ اور کسی دکھی کو اور دکھی کرے؟ اگر کسی کے دکھ کا ہم مداوا نہیں کر سکتے تو اس کو اور دکھ بھی نہ دیں۔ آج بھی عورت اسی موڑ پر کھڑی ہے جہاں ساڑھے چودہ سو سال پہلے کھڑی تھی۔ خدا جانے یہ بے حسی کب ختم ہوگی؟



انوکھا انتقام

محترم عمران قریشی!
امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔
جاگیردارانہ معاشرے میں سانس لینے والوں کی اپنی ایک سوچ اور مزا ہوتا ہے۔ وہاں پیسے سے زیادہ جذبات اور انا کی اہمیت ہوتی ہے۔ خواہ کوئی غریب ہو یا امیر اپنی ناک اونچی کرنے کے لیے دھن دولت آن بان حتیٰ کہ جان تک داؤ پر لگا دیتے ہیں یہ سچی کہانی اسی دیہاتی معاشرے کے ایک شخص کی ہے۔ اس نے بیوی سے کیسا انتقام لیا اسے پڑھ کر آپ افسوس بھی کریں گے اور مسکرائیں گے بھی۔

والسلام
عبدالمالک کیف

نائلہ حجلہ عروسی میں اپنے دلہا کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس دن کے لیے اس نے کیا کیا سپنے دیکھے تھے۔ اس کی شادی اس کی پسند سے ہو رہی تھی اسے وہ ملا تھا جسے اس نے چاہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس کی زندگی میں آ جائے گا اس لیے آج وہ بہت خوش تھی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ظفر اس کے بیڈ پر آ کے بیٹھ گیا اور نائلہ کے دل کی دھڑکن بے ترتیب سی ہونے لگی اور ظفر نے چپکے سے اس کا گھونگھٹ اٹھایا۔

"ماشاء اللہ! چندے آفتاب چندے ماہتاب!"

ظفر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور وہ شرم و حیا سے سمٹ سی گئی۔ ظفر نے منہ دکھائی میں اس کے ہاتھ میں پانچ سو کا نوٹ رکھا۔

تھوڑی دیر بعد ظفر اٹھ کے باہر چلا گیا۔ مہمان وغیرہ آ جا رہے تھے۔ شام تک گہما گہمی رہی۔ کچھ مہمان چلے گئے جو باقی بچے وہ وہیں رک گئے۔ رات ہو گئی تھی ظفر بھی اپنی دلہن کے پاس آ گیا تھا۔ پھر دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

نائلہ کے جذبات عجیب ہو رہے تھے کچھ ڈر اور خوف اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے اس کے چہرے پر اور بدن میں اک عجیب سی سرشاری تھی لیکن ظفر ایسی کوئی پیش قدمی نہیں کر رہا تھا جس سے پتا چلتا کہ ان کی شادی کی پہلی رات ہے۔ اس نے اب تک اسے کو چھوا بھی نہ تھا۔ اس نے کہا۔

"میں بہت تھک گیا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ سائیڈ میں نیم دراز ہو گیا۔ دیر تک وہ یونہی بیٹھی رہی۔ پھر اس نے بھی اپنا آنچل سمیٹا اور چپکے سے لیٹ گئی۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی اور ظفر بے خبر سو رہا تھا۔ نائلہ کے دل میں اچانک اس کی سرد مہری پر دل میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ شادی کی پہلی رات دلہا کو کیا ہو گیا کہ وہ دلہن کے ناز نخرے اٹھانے کی بجائے بے خبر سو رہا ہے۔ سوچتے سوچتے جانے کب وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

❁......☆......❁

ظفر اور نائلہ کے گھروں کا فاصلہ زیادہ نہ تھا گاؤں کا ماحول تھا آتے جاتے میں نائلہ اکثر ظفر کو دیکھا کرتی تھی۔ وہ پورے گاؤں میں سے اسے منفرد نظر آتا تھا۔ وہ انٹر کا طالب علم تھا اور بہت ہی خوبرو اور مضبوط جسم، خوب صورت بال نائلہ اسے دیکھ کر آہیں بھرا کرتی تھی۔ مگر وہ اسے دیکھتا بھی نہ تھا۔ وہ بھی کم حسین نہ تھی۔ تیکھے نینوں

والی، سڈول جسم، لمبے گھنے سیاہ بال، یوں مٹک مٹک کے چلتی تھی کہ محلے کے نوجوان اسے دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ وہ بلا کی ذہین تھی، کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ ظفر سے اس نے ایک دو بار بات کرنے کی کوشش کی پر اس نے نائلہ کو گھاس نہ ڈالی۔ اسے بہت غصہ آیا کہ لوگ اس کی ایک مسکراہٹ پر جان دینے کو تیار ہیں اور یہ موصوف اسے دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔ ایک دن گاؤں میں ظفر کی بہن کی شادی تھی بہت سارے مہمان آئے ہوئے تھے۔ نائلہ نے بلور رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ظفر اس وقت مہمانوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھا۔ ظفر کی دو بہنیں تھیں جس میں سے ایک کی شادی ہو رہی تھی اور دوسری پندرہ سال کی تھی۔ اس کے ماں باپ کی اپنی کچھ زمینیں تھیں جن پر ان کی گزر بسر ہو جاتی تھی۔

نائلہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی اور بڑی مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے والدین کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا تھا۔ ان لوگوں کا گزران بھی کھیتی باڑی ہی تھا۔ اس دن بھی نائلہ نے ظفر کو متوجہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی مگر اس نے کوئی دھیان نہ دیا۔ شادی کے دو دن بعد جب کہ گرمیوں کا موسم عروج پر تھا۔ ظفر اپنی بھینس کو پانی پلانے کی غرض سے گھر سے نکلا۔ گھر کے قریب ہی کچھ فاصلے پر ایک ٹیوب ویل تھا۔ اتفاق سے وہاں کوئی اور نہ تھا۔ بھینس پانی میں بیٹھ گئی تو اسے مزا آ گیا تھوڑی دیر بعد ظفر اسے کھینچنے لگا تو اس نے جیسے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس کھینچا تانی میں بھینس نے جھٹکا دیا تو ظفر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دھڑام سے پانی میں آ گرا۔ ایسے ہی وقت میں نائلہ وہاں کپڑے دھونے کی غرض سے آ نکلی یا شاید ظفر کو کہیں سے دیکھ لیا تو بہانہ بن گیا کپڑے دھونے کا۔ اس نے جو ظفر کو دیکھا تو ہنسنے لگی، ظفر ایک دم سے اٹھا مگر اسے شرمندگی ہونے لگی۔

"جب تم شادی کرو گے، تو ایک لڑکی کو کیسے سنبھالو گے جب ایک بھینس نہیں سنبھال سکتے۔"

نائلہ نے ایک آنکھ دباتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ بات آئی گئی ہو گئی نائلہ نے تو مذاق میں اس سے چھیڑ خانی کی تھی مگر ظفر کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ایک لڑکی ہو کر اتنا بڑا طعنہ کیوں دیا۔ اسے سوتے جاگتے میں نائلہ کی طنز بھری آواز سنائی دینے لگی اور اس نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ شادی کرے گا تو نائلہ کے ساتھ ورنہ نہیں۔ یوں کافی تگ و دو کے بعد اور نائلہ کی رضامندی کو دیکھتے ہوئے نائلہ کے ماں باپ نے ظفر کے گھر والوں کو ہاں کر دی یوں دونوں بہت خوش تھے۔ نائلہ تو بہت خوش تھی کہ اس کی دعائیں قبول ہو گئی تھیں۔ یوں پلک جھپکتے میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔

❁......☆......❁

ان کی شادی کو مزید کچھ دن گزر گئے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ہنسی مذاق، باتیں کرتا رہتا تھا۔ کچھ دن رشتہ داروں کی دعوتیں وغیرہ میں مصروف رہے۔ نائلہ یوں تو بہت خوش تھی مگر ظفر اپنے کمرے میں پہنچ کر جانے کیوں سرد مہری دکھاتا تھا اور وہ ایک ہی بستر پر رہتے ہوئے بھی اس سے دور ہوتا۔ وہ دلہن تھی پیش قدمی کیسے کر سکتی تھی۔ شرم و حیا آڑے آ جاتی تھی۔ رات ہوتے ہی اس کے بدن میں جانے کیسی ادھم بازی شروع ہو جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ جان گئی کہ ظفر میں مردوں والی کوئی بات نہیں ہے وہ پریشان رہنے لگی۔ کب تک برداشت کرتی آخر ایک دن اپنی ماں کو حقیقت بتا دی۔ اس کی ماں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر یہ بات کسی اور سے مت کہنا۔" مگر اس کے ساتھ بات

وہیں کی وہیں رہی اور ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ نائلہ بجھی بجھی سی رہنے لگی، اس کے ہزاروں ارمان چکنا چور ہو گئے۔ گاؤں میں وہ کوئی بچہ دیکھتی تو شدید خواہش جاگ اٹھتی کہ اس کے ہاں بھی بچہ ہو اور اسے گھر سونا سونا سا لگتا۔ اس سلسلے میں اس نے ظفر سے کبھی بات کی تو وہ ہر دفعہ ٹال جاتا یا خاموشی اختیار کر لیتا یا چپ چاپ گھر سے نکل جاتا۔ ایک دن نائلہ کی ماں نے اس سے کہا۔

"بہت ہو چکی، تم میکے آ جاؤ۔ ظفر لینے آئے گا تو ہم طلاق کا مطالبہ کر دیں گے۔" وہ پریشان سی ہو گئی، اس طرح وہ طلاق لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ظفر سے محبت کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کئی جوڑے تو ایسے زندگی گزار رہے ہیں جن کی اولاد نہیں مگر پھر سوچتی یہاں تو معاملہ ہی الگ ہے۔ ظفر اس سے ایسے دور رہتا ہے جیسے میں اسے کھا جاؤں گی۔ پورا ایک سال تو سلگتے ہوئے اس نے یہ بات چھپائی تھی، مگر اب گھر والے اس پر زور دینے لگے تو وہ اور پریشان ہو گئی تھی۔ اب نائلہ کی ماں نے دبے دبے لفظوں میں اپنے خاوند کو بھی بتا دیا اور کہا۔

"اس طرح ہم اپنی دھی کی زندگی برباد نہیں کر سکتے، تو کچھ کرو۔"

اس نے جواب دیا۔ "ہم اگر طلاق کا مطالبہ کر دیں گے تو لوگ کیا سوچیں گے۔ کچھ سوچتے ہیں۔" وہ پریشان سا ہو گیا۔

بات چپکے چپکے دونوں گھروں تک پہنچ گئی۔ چہ مگوئیاں ہونے لگیں اور نائلہ کے گھر والوں نے فیصلہ کر لیا کہ طلاق کا مطالبہ کر دیا جائے۔ دوسرا سال ہونے کو تھا۔ یہ ماہ و سال نائلہ نے جس کرب اور دکھ سے گزارے تھے وہی جانتی تھی۔ اک اک پل کانٹوں کی سیج پہ جیتی رہی تھی۔ اتنے عرصے بعد بھی ظفر میں کوئی بدلاؤ نہ آیا۔ وہ تھوڑی بہت کوشش کرتی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا بہت بار کہا کہ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو مگر وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کے ٹال جاتا۔ نائلہ کی ایک سہیلی تھی جس سے وہ اپنے دل کی بات کہا کرتی تھی جس کی دو سال پہلے نائلہ کی شادی سے صرف پندرہ دن پہلے شادی ہوئی تھی اور وہ کراچی میں رہائش پزیر تھی۔ وہ گاؤں آئی ہوئی تھی اور جب وہ نائلہ سے ملنے آئی تو نائلہ نے باتوں ہی باتوں میں ساری بات بتا دی تو وہ بھی پریشان سی ہو گئی اس کی سہیلی عارفہ نے کچھ سوال کیے، جس کے نائلہ نے جواب دیئے پھر اس نے نائلہ کو ایک مشورہ دیا۔

❁......☆......❁

آج وہ بہت اداس تھی ظفر کے ہاں اس کی آخری رات تھی کیونکہ صبح اس کے ماں باپ نے سختی سے کہا تھا کہ ہمیشہ کے لیے گھر آ جائے اور وہ مجبور ہو گئی تھی کیونکہ اب اسے بھی غصہ آ گیا تھا کب تک برداشت کرتی۔ اس رات اس نے عارفہ کی بات کو ذہن میں رکھ کر اس پر عمل کرنے کی ٹھانی۔ ایک آخری حربہ آزمانا چاہتی تھی۔ اس نے خوب بن سنور کے اپنے کمرے میں قدم رکھا، قیامت خیز جلوؤں کو دیکھ کر ظفر کے دل و دماغ میں آگ سی بھڑک اٹھی تھی مگر وہ خاموش اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آج نائلہ نے جیسے شرم و حیا کا لبادہ اتار پھینکا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ظفر کے سوئے جذبوں میں بھونچال کیسے آتا ہے۔ وہ دھیرے دھیرے ظفر کی جانب بڑھنے لگی۔ اک ادائے دلربا سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ظفر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں میں انگارے دھک رہے ہوں۔ اتنے عرصے بعد نائلہ نے پیش قدمی کر کے ظفر کے سوئے ہوئے جذبات کو تیلی دکھا دی تھی۔ اس کے جسم میں منجمد برف جیسے پگھل

رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب اپنے آپ پر قابو پانا ناممکن ہے۔ یوں نائلہ حالت مدہوشی میں اس سے چمٹ گئی اور محبت کی انتہا کر دی۔ پھر اسے لگا جیسے بے جان بُت میں جان پڑ گئی ہو پھر ظفر نے اس پر چاہتوں کی بارش برسا دی اور اسے ایسا مست و مدہوش بنا ڈالا جیسے ان کی شادی کی پہلی رات ہو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ وہی ظفر ہے ان کی ساری رات کیف و سرور کے عالم میں گزری۔

❁......☆......❁

صبح ہوئی تو ظفر اس سے پہلے نہا دھو کے فریش تھا۔ وہ بھی کچھ ہی دیر میں تیار ہو کر کمرے میں آئی تو وہ اسے گھور رہا تھا۔ نائلہ شرما سی گئی اور اس نے نائلہ کی کمر میں بانہیں ڈال دیں۔

"اتنے عرصے بعد آپ کا یہ روپ دیکھا۔" نائلہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"وہ روپ بھی تمہاری وجہ سے تھا اور یہ روپ بھی تم نے عطا کیا۔" ظفر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کہا۔

"اب بتاؤ جان! میرے ساتھ کوئی لڑکی بستر پر ...ئے گی کہ نہیں۔ میرے ساتھ رات گزار سکتی ہے کہ ...ہیں۔" ظفر نے اسے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ وہ ...لم سی گئی اور اسی وقت اس کے ذہن میں جھماکا سا ...وا برسوں پرانی ایک بات اس کے ذہن کے دریچوں سے اچھل کر اس کے سامنے آ گئی۔ اس نے اپنا سر ...ام لیا اور بیڈ پر بیٹھ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد بولی۔

"تو...... تو کیا تم نے وہ سب انتقام میں کیا؟" ...ا نے حیران ہو کے پوچھا۔

"تم نے ایک مرد کو طعنہ دیا تھا۔" مردانگی کا سوال "عورت ہو کے تم نے بڑی بات کہہ دی تھی۔ ...ی بھی انسان کے دل کو چھوٹی سی بات اتنی گراں گزرتی ہے کہ انسان اسے بھلا نہیں سکتا اور دھیرے دھیرے اس کے دل و دماغ میں آگ سی بن کے جلتی رہتی ہے اور انسان چاہ کر بھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا اور کچھ دیر توقف کر کے کہا۔ "تمہارے ساتھ ایک ہی بستر پر راتیں گزاری ہیں۔" ایک جوان بیوی کے ہوتے ہوئے جس طرح اس کے ساتھ سو کر بھی برداشت کیا ہے میں جانتا ہوں۔ کئی دفعہ میری قسم ٹوٹتے ٹوٹتے بچی کہ جانے دو یار! چھوڑ سب، مگر اپنے آپ سے جو وعدہ کیا تھا یاد آ جاتا تمہاری کہی ہوئی وہ بات یاد آ جاتی تھی۔ میں نے اسی دم قسم کھائی تھی کہ تمہیں ایک دن جواب ضرور دوں گا اور اس لیے تم سے شادی بھی کی۔" ظفر نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

نائلہ جیسے سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی ایسا بھی کر سکتا ہے کہ انتقام لینے کے لیے شادی کرے اور وہ بھی چھوٹی سی بات کے لیے۔

"مگر میں نے تو صرف اس دن تمہیں چھیڑا تھا یونہی مذاقاً کہی ہوئی بات کو اتنی سنجیدگی سے لیا تم نے......" وہ بہت ہی اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تم مرد لوگوں کا کیا بھروسہ تم گھر سے باہر کیا کیا کرتے پھرتے ہو؟" نائلہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئی اور شکی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"جو شخص تمہارے بقول (چھوٹی سی بات) کو انتقام لینے کے لیے یہ سب کرتا ہے وہ گھٹیا کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہاری قسم! ان دو سالوں میں کیا تم سے پہلے بھی کسی لڑکی کو چھوا تک نہیں۔" ظفر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور نائلہ کے بدن سے جیسے کسی نے روح تک نکال دی تھی۔

www.Paksociety.com

تنہائی کا سانپ

محترم مدیر نئے افق'
السلام علیکم!
انسان کی فطرت تضادات کا مجموعہ ہے۔ وقت اور حالات اس کے اندر تبدیلیاں لاتے ہیں کبھی خیر کا پہلو ابھرتا ہے تو کبھی شر کی شرارتیں اسے اپنا اسیر بنا لیتی ہیں۔ عموماً شر انسانی فطرت میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ عام حالات میں کامیاب بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن در حقیقت ایسے لوگ جیت کر بھی ہار جاتے ہیں۔ یہ کہانی بھی ایک ایسے ہی شخص کی ہے جس نے دولت کے حصول کے لیے ایک انوکھا طریقہ ڈھونڈا تھا اور پھر خود اپنے جال میں پھنس گیا۔

انجم فاروق ساحلی
لاہور

فوزیہ لاہور میں رہتی تھی جب کہ دور افتادہ قصبے نارروال میں قیام پذیر ایک شخص شوکت علی اس کی زندگی میں خوشیوں کا امین بننے والا تھا۔ فوزیہ تنہائی کا شکار تھی جب کہ وہ مرد بھی تنہا تھا۔ دونوں خط وکتابت پھر ای میل' موبائل پر ایس ایم ایس وغیرہ کے ذریعے آشنا ہوئے پھر انہوں نے اپنی تنہائی کو مستقل طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور شادی کے لیے رضامند ہوگئے۔

اس نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ اس کی عمر پچپن سال ہے' پہلی بیوی مرچکی ہے اور کوئی بچہ وغیرہ نہیں ہے۔ میں اپنی تنہائی کو رشتہ ازدواج سے بدلنے کا خواہش مند ہوں۔ اس نے اپنی ایک تصویر بھی ہمراہ بھیجی تھی۔ جس سے فوزیہ کو اندازہ ہوا کہ وہ لمبے قد اور کسرتی جسم کا ایک ایسا آدمی ہے جس کے نقش ونگار ہلکی سی افسردگی کی جھلک لیے ہوئے تھے لیکن دیکھنے والے کے لیے ان میں کسی قدر جاذبیت اور کشش موجود تھی۔

نارروال جہاں اس کا گھر تھا۔ یہاں کئی ایکٹر رقبے پر پھیلا ہوا اس کا زرعی فارم تھا۔ جس میں بے شمار پھل دار درخت اور سبزیوں کے چند کھیت تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے فارم میں ایک چھوٹا سا صاف ستھرا مرغی خانہ بھی کھول رکھا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ شخص شوکت علی خاندانی بڑھئی تھا کچھ ملازمتیں بھی کرچکا تھا۔ وہ اتنا کمالیتا تھا کہ اپنے اخراجات کے علاوہ بچت بھی کرسکے۔ چنانچہ بینک میں اس کے چار لاکھ روپے جمع تھے۔

یہ تمام ضروری معلومات تو فوزیہ کو آپس کی خط وکتابت سے حاصل ہوگئی تھیں لیکن وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جن کا ایک عورت کو اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق جاننا ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس شخص کی ذاتی پسند ناپسند کیا ہے؟ کھانے پینے کے سلسلے میں وہ کیا چاہتا تھا؟ فراخ دل یا کنجوسی کا قائل ہے؟ صفائی پسند ہے' باتونی ہے یا خاموش طبع ہے؟ خودغرض اور لالچی تو نہیں؟ شکی مزاج اور وہمی تو نہیں' کیا وہ بااعتماد ازدواجی زندگی کی مکمل عمارت استوار کرنے کا اہل ہے یا نہیں۔

یہ سب تو فوزیہ جان چکی تھی لیکن "تنہائی کا ساتھی" نامی آواز جس کے ذریعے وہ متعارف ہوئے تھے۔ وہ صرف عورت ومرد کی مشترکہ دلچسپیوں' شوق اور رجحانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنی تھوڑی سی فیس

کے عوض مناسب افراد کے نام و پتے مہیا کردیا کرتا تھا۔ باقی مراحل ممبروں کو خود اپنی ذمہ داری پر طے کرنا پڑتے تھے۔

فوزیہ خود بھی ایک پچاس سالہ خاتون تھی۔ جس کے سفر میں تنہائی اس کی رفیق سفر تھی' اسے کوئی مناسب شریک حیات نہیں مل سکا تھا۔ ایک دو سے گپ شپ ہوئی لیکن وہ دغا باز اور جھوٹے ثابت ہوئے چنانچہ وہ تنہائی سے کھیلتے ہوئے اس عمر تک آ پہنچی تھی۔ اب وہ محسوس کرتی تھی کہ اسے زندگی کی تھکن کے بعد خاوند کے روپ میں کسی مونس' ساتھی اور ہمدم کی اشد ضرورت لاحق تھی۔ ایک شخص جس کی موجودگی سے فوزیہ کو اپنی ذات ایک مکمل حیثیت میں دکھائی دے سکے۔ بہت عرصے سے وہ تکمیل ذات کی خواہش کے گہرے احساس سے دوچار تھی۔ اس کے چاروں طرف تنہائی کی فصلیں بلند ہوتی چلی گئی تھیں' وہ رفاقت کے لطف ومزے سے محروم تھی۔ وہ تو جیسے کسی ساتھی کے محبت بھرے دو بول سننے کو ترس گئی تھی۔

ایک شوہر ہو خواہ وہ کیسا بھی ہو۔ بدصورت' خوب صورت' مکار' بدفطرت لیکن بہر حال ہو تو سہی...... تنہائی کی صلیب ٹوٹے اور وہ شاد کام ہو۔ شادی کے فیصلے کے بعد فوزیہ نے کرائے کا فلیٹ چھوڑ دیا اور ساز وسامان فروخت کرکے جمع پونجی چیک بک اور ایک عدد کپڑوں کے صندوق کے ساتھ دیارِ شوق کی طرف روانہ ہوگئی۔

والدین کے ایک حادثے میں ہلاک ہونے کے بعد وہ گھر کی رونق' چہل پہل' ماں کی آغوش' باپ کی شفقت سے محروم ہوگئی تھی۔ وہ چونکہ اکلوتی اولاد تھی اس لیے کوئی بہن بھائی بھی ساتھ نہ تھا۔ اس کی کفالت اس کے چچا نے اپنے ذمے لے لی تھی جو مہربانی محبت اور شفقت سے اس کی پرورش کا فرض ادا کرتے رہے لیکن میٹرک میں پہنچتے ہی جب اسے پتا چلا کہ چچا اس کے والد کا بینک بیلنس صاف کرچکے ہیں تو اسے چچا سے نفرت ہوگئی۔ چچی اور ان کے بچے بھی اس کے دل میں نہیں اتر سکے تھے۔ وہ مطلب غرض اور بناوٹ کے پیکر تھے۔ اس نے چچا کو چھوڑ دیا اور ملازمت کرنے لگی۔ اب تنہائی کا ناگ اس کے وجود کے اردگرد اپنے بل کستا چلا گیا۔ کالج' دوستی یا بیرونی ماحول تو صرف وقتی رفاقت فراہم کرتا تھا۔ انسان مستقل مزاج ہوتا ہے۔ صرف گھریلو زندگی ہی اسے حقیقی خوشیوں سے ہمکنار کرسکتی ہے۔ چنانچہ وہ بازار سے گزرتے ہوئے بھی تنہائی کے شدید احساس سے دوچار رہتی تھی۔

نارروال ایک قصبہ نما شہر ہے۔

اس کے پلیٹ فارم پر فوزیہ کو ایک دراز قد اور کسرتی جسم کا شخص اپنا منتظر ملا۔ جو یقیناً شوکت علی ہی تھا۔ اسے دیکھتے ہی فوزیہ جان گئی کہ وہ اپنی تصویر سے کافی بہتر ہے۔ اس کی گلابی جلد میں عجیب سی ملائمت تھی جو اس تصویر سے ظاہر نہیں تھی۔ دراز قامت نیلی آنکھیں سنہرے بال اور شخصیت میں مردانہ وجاہت نمایاں تھی۔ اسے دیکھ کر فوزیہ سوچ میں گم ہوگئی کہ ایسا پُرکشش آدمی اسے پسند بھی کرے گا یا نہیں کیونکہ اس نے اپنی تصویر اسے نہیں بھیجی تھی۔

شوکت علی آگے بڑھا اور اپنا ہاتھ تعارف کے بعد مصافحے کے لیے بڑھایا۔ اس کی لمبی انگلیوں کے گلابی ناخن بے حد صاف ستھرے تھے۔ فوزیہ کو یہ دیکھ کر تعجب کی حد تک مسرت ہوئی۔ بھورے رنگ کا بہترین اور بے داغ سوٹ اس کے قد وقامت پر انتہائی دیدہ زیب دکھائی دے رہا تھا۔ فوزیہ گومگو کی کیفیت میں کھڑی تھی کہ اجنبی کہیں اسے مسترد نہ کردے کیونکہ وہ اس مرد کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ اچانک اس کی

www.Paksociety.com

سماعت سے ایک مہربان آواز ٹکرائی۔

"تم اپنی عمر سے خاصی کم اور نوجوان دکھائی دیتی ہو۔ پہلی نظر میں تو میں تمہیں پینتالیس برس کی نہیں سمجھ سکا تھا۔" (فوزیہ نے خط میں خود کو پینتالیس سالہ ظاہر کیا تھا)۔ یہ ایک جملہ اس کی روح تک کو سرشار کر گیا۔ وہ کھل اٹھی اور پُرتبسم لبوں سے اس شخص کا شکریہ ادا کیا جو صرف چند لمحے کی اس پہلی ملاقات میں فوزیہ کو بے حد پسند آ گیا تھا۔

"آپ کی ذرّہ نوازی ہے مسٹر شوکت!" فوزیہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کہیں تمہارا شادی کا ارادہ بدل تو نہیں گیا مجھے دیکھ کر۔" شوکت اپنے سراپا پر ایک نظر ڈال کر مجسم سوال بن گیا۔

"اوہ نہیں مسٹر شوکت! آپ تو اپنے نام کی مانند شان دار آدمی ہیں، کسی بھی عورت کے خواب کی مانند۔"

"تو پھر ہمیں اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنی اپنی چیک بک (بینک کتاب) ایک دوسرے سے بدل لینی چاہیے۔"

"بالکل!" فوزیہ نے زپ کھولی اور چیک بک نکال کر لرزتی ہوئی انگلیوں سے اپنے شریک حیات کو پیش کر دی۔ شوکت علی نے بھی یہی کارروائی دہرائی۔ یہ تجویز بھی شوکت نے اپنے خطوط میں پیش کی تھی کہ وہ شادی کرنے سے پیش تر اپنا اپنا جمع شدہ سرمایہ ایک دوسرے کے حوالے کر دیں گے اور پھر کسی ایک ہی بینک میں مشترکہ اکاؤنٹ کھول لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ شوکت کا خیال تھا کہ وہ ایک خاص تعلق قائم کر رہے ہیں، کوئی ہلکا پھلکا رومانس نہیں لڑا رہے۔ اس لیے اعتماد کی فضا میں یہ تعلق استحکام فراہم کرتے ہوئے گہری محبت میں بدل جائے گا۔ ایک عملی آدمی کی حیثیت سے وہ چاہتا تھا کہ بالکل ابتدا میں دونوں طرف سے اس بات کا یقین کامل ہو جائے کہ ان کو مستقبل کے نام پر کسی قسم کا دھوکا نہیں دیا جا رہا۔ فوزیہ نے دیکھا شوکت کی چیک بک میں اس کا بینک بیلنس صرف چار لاکھ روپے تھے جب کہ اس کی چیک بک کی رقم پچیس لاکھ روپے تھی۔ پانچ لاکھ روپے تو اس نے ملازمت کرتے ہوئے پس انداز کیے تھے اور بیس لاکھ اس کو اپنے مہربان پڑوسی محمد علی کے چھوڑے ہوئے ورثے سے ملا تھا۔ محمد علی اس کے والد کے بہت اچھے دوست اور غم گسار بھی تھے وہ بچپن میں کھیلنے کے لیے محمد علی صاحب کی بیگم کے پاس چلی جایا کرتی تھی کیونکہ وہ بے اولاد تھیں۔ ان کا گھر اس زمانے میں بھی بڑا کشادہ خوب صورت اور شان دار تھا۔ وہ اپنی بیوی کی وفات کے بعد سفرِ آخرت پر رخصت ہوئے تھے اور اپنی جائیداد رفاہی اداروں یتیم خانوں کے لیے چھوڑ گئے تھے جس میں سے بیس لاکھ روپے فوزیہ کو وصیت کے مطابق مل گئے تھے۔ وہ ان کی گود میں بچپن میں بالکل ان کی بچی کی مانند ہی کھیلی تھی۔

بینک کی کتاب کا جائزہ لینے کے بعد شوکت نے فوزیہ کو اس کی کتاب واپس کر دی اور پھر اپنی چیک بک کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

"سب سے پہلے میں تمہیں اپنے گھر لے چلتا ہوں تاکہ تم شادی کی تیاری کر سکو۔ پھر ہم سب سے پہلے نارووال کے بینک جا کر اپنا مشترکہ اکاؤنٹ کھولیں گے پھر کورٹ میرج کے لیے چلیں گے، میں بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا۔ میں نے بینک کے ایک آدمی کو تمہارے چیک کیش کرانے کے لیے گیارہ بجے کا وقت دے رکھا ہے، گھر جاتے ہوئے راستے میں میں اسے چیک دیتا جاؤں گا۔ لاؤ اپنے چیک مجھے دے دو۔"

فوزیہ نے لمحاتی کشمکش کے بعد اپنا پرس پھر کھولا اور

سارے چیک نکال کر اس کے حوالے کر دیئے۔ بغیر ایک لفظ کہے شوکت سامان کے کمرے کی طرف چلا گیا اور فوزیہ وہیں اجنبی پلیٹ فارم پر تنہا کھڑی رہ گئی۔

شوکت تھوڑی دیر بعد سرخ رنگ کی ٹوپی والے ایک مزدور کو ساتھ لیے نمودار ہوا۔ مزدور نے فوزیہ کا سامان اٹھایا اور باہر کھڑے ایک پرانے ماڈل کے ٹرک میں رکھنے لگا۔

فوزیہ کا صندوق خاصا وزنی تھا، دونوں مردوں کو کافی قوت صرف کرتے ہوئے ٹرک پر لادنا پڑا۔ مگر ریلوے مزدور رخصت ہوتے ہی خود شوکت نے صندوق کا کنڈا تھام کر اس کا رخ موڑا اور سامنے کا حصہ ٹرک کے اندرونی حصے کی جانب موڑ دیا۔ یہ صندوق دو مزدوروں نے ہی فوزیہ کے فلیٹ سے پک اپ پر چڑھایا تھا اور پھر اسے اسٹیشن پر گاڑی میں رکھ کر واپس لوٹے تھے۔

میرا ہونے والا شوہر مضبوط اور توانا جسم کا مالک ہے۔ فوزیہ نے فخر سے سوچا۔ سامان کی درستگی سے نمٹ کر شوکت کود کر نیچے آیا اور ٹرک کا دروازہ کھولتے ہوئے کہنے لگا۔

"چلو بیٹھو، ہمیں جلدی یہاں سے چل دینا چاہیے۔ ممکن ہے وہ بینک والا شخص ہمارا مزید انتظار نہ کر سکے۔"

راستے میں واقعی پانچ منٹ کے لیے ایک جگہ رک کر شوکت واپس آ گیا اور پرانا ٹرک اس کے فارم کی طرف دوڑنے لگا۔ گھر اپنی وسعت اور ساخت کے اعتبار سے فوزیہ کو بہت پسند آیا۔ اس میں ہر وہ چیز موجود تھی جس کا شوکت نے اپنے خط میں تذکرہ کیا فراخ اور آرام دہ چھ کمرے جن کی دیواروں پر گہرے رنگ کیے ہوئے تھے۔ تمام ضروریات سے مزین کچن، فرنیچر کا ڈیزائن اگرچہ قدیم طرز کا تھا مگر آرام دہ اور دلکش دکھائی دیتا تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشوں پر کہیں کہیں جمی ہوئی گرد اس گھر میں کسی عورت کے نہ ہونے پر شکوہ کناں تھی۔

فوزیہ فلیٹ میں گزر بسر کرتے ہوئے بہترین ہاؤس کیپر بن چکی تھی۔ وہ فوراً ان خرابیوں کو بھانپ گئی اور اس گھر کے لیے اپنی اہمیت کے احساس سے وہ بے حد مطمئن اور خوش بھی ہوئی اس نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ کہاں کہاں کی ہوئی تھوڑی سی تبدیلی اس مکان کے حسن میں اضافے اور دلکشی کا باعث بن سکتی ہے۔

شوکت فوزیہ کا سامان بیڈ روم میں اٹھا لایا تھا گھر کی تینوں خواب گاہیں وسیع اور صاف ستھری تھیں اور ہر کمرے میں گیس کے ہیٹر کا بھی بندوبست تھا۔ شوکت نے گھڑی میں وقت دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ابھی کورٹ جانے میں اتنا وقت ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس کا متوقع گھر بخوبی دکھا سکتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے دکھائے جانے والے تینوں بیڈ روم فوزیہ کو بے حد پسند آئے، ایک بہت بڑا غسل خانہ بھی موجود تھا۔ جس میں گیس سے گرم رکھنے کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے پرانی طرز کا ایک ہیٹر لگا ہوا تھا۔

باہر کا بڑا کمرا جو کہ بطور ڈرائنگ روم استعمال کیا جا رہا تھا اس کے لیے بھی ایک بڑا پرانی طرز کا ہیٹر موجود تھا۔ اس کے بعد والے کمرے میں جس سے ڈرائنگ روم کا کام لیا جا رہا تھا۔ اسے گرم رکھنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ اس کے متعلق شوکت کا کہنا تھا کہ ڈرائنگ روم اور کچن سے آنے والی گرم لہریں اس کے لیے کافی ثابت ہوتی ہیں۔

گھر کے رہائشی امور سے آگاہ ہونے کے بعد فوزیہ نے شوکت سے پوچھا کہ میں کپڑے وغیرہ کہاں دھویا کروں گی، یہاں کوئی نوکر تو نظر نہیں آ رہا۔ شوکت نے اسے صحن کے بڑے برآمدے کے سامنے باغیچے میں گھرا ہوا کپڑے دھونے کا مقام دکھایا جو فوش

سے دوانچ گہرا چکور فرش کا ٹکڑا تھا' جس کے سامنے سرکاری نلکا اور ہینڈ پمپ بھی موجود تھا۔ ایک واشنگ مشین بھی دکھائی دے رہی تھی۔ باغیچے میں دو مضبوط تاریں بھی کپڑے سکھانے کے لیے لگی ہوئی تھیں۔ فوزیہ نے اندازہ لگایا واشنگ مشین پرانی طرز کی ہے۔ فوزیہ نے چل پھر کر اس مقام کا جائزہ لیا' اچانک ایک قریبی پھل دار امردد کے درخت کے اردگرد بنے ہوئے گول دائرے میں اسے ٹوٹی ہوئی سرخ اور سبز چوڑیوں کی ایک جھلک دکھائی دے گئی۔ وہ کچھ چونک پڑی لیکن اس نے شوکت پر ظاہر نہ کیا کہ اس نے کچھ ایسا دیکھا ہے جس کی اسے توقع نہ تھی' اس نے سوچا شاید کسی ملازمہ یا رشتہ دار خاتون کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے کچھ ٹکڑے یہاں پڑے چمک رہے ہیں' اس وقت شوکت کی پشت اس کی طرف تھی' پہلے اس نے سوچا کہ اسے کریدے لیکن پھر اس نے ارادہ ترک کردیا کہ اتنی جلدی بدگمانی کا مظاہرہ اچھا نہیں ہوتا۔ اب وہ شوکت کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی گھر کے باقی مقامات دیکھنے لگی۔ پھر وہ باہر نکل آئے' یہ فارم کا علاقہ تھا جس کے لیے باغیچے کی دیوار میں ایک دروازہ موجود تھا اور پختہ روش دور تک نکلتی چلی گئی تھی۔ فوزیہ کی نگاہوں نے محسوس کیا کہ وہ اس سے بڑی جگہ ہے جس کا ایک ایکڑ تک شوکت نے تذکرہ کیا تھا۔ کچھ علاقہ کاشت کے لیے مخصوص تھا۔ سامنے حدِ نظر تک پھل دار اونچے درختوں کا خاصا وسیع باغ تھا۔ ان سب سے ذرا ہٹ کر خاردار تار کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ جس کے اندر لکڑی کے خوشنما پنجرے بنے ہوئے تھے ان میں اس وقت بھی مرغیوں کی خاصی تعداد موجود تھی' کچھ مرغیاں باہر ٹہل رہی تھیں۔ ایک تالاب بھی دکھائی دیا جس میں چند بطخیں تیرتی ہوئی خوب صورت دکھائی دے رہی تھیں۔ اسی جگہ پھولوں کی کیاریاں بھی موجود تھیں۔

اس سارے علاقے میں ایک ہی چھوٹی سی عمارت تھی جسے بقول شوکت گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اس گودام سے پھر فوزیہ کی طبیعت میں قدرے ناگواری کا احساس پیدا ہوگیا۔ جب اس کے کھلے دروازے سے کود کر ایک بلی باہر آ گئی اور کچھ بلیوں کی آوازیں اندر سے بھی سنائی دینے لگیں۔

"کیا یہ بلیاں بھی پالتو ہیں؟" فوزیہ نے تشویش سے ظاہر کیا۔

"تقریباً' کیوں؟" وہ اس کے سوال پر حیران سا ہوگیا۔

"مجھے بلیوں سے شدید نفرت ہے۔ میں تو انہیں بالکل برداشت نہیں کرسکتی۔" فوزیہ نے چہرہ اُدھر سے پھیرلیا۔

"تم انہیں زیادہ نہیں دیکھو گی کیونکہ یہ عام طور سے گودام کے اندر ہی رہتی ہیں۔ میں پورا خیال رکھوں گا کہ یہ یہاں سے باہر نہ جانے پائیں۔ ایسے گھروں میں جہاں اناج کے گودام ہوں یا غلہ وغیرہ پیدا ہوتا ہو وہاں انہیں رکھنا ضروری ہوتا ورنہ چوہے ناک میں دم کردیتے ہیں۔" چوہوں کا خیال بلیوں سے کہیں زیادہ کراہیت اور نفرت کا باعث تھا۔ چنانچہ فوزیہ نے بلیاں ہی برداشت کرنے کو ترجیح دی۔

"کیا تمہارے پاس کوئی اور جانور بھی ہے؟" فوزیہ نے اٹک اٹک کر پوچھا۔

"ایک سفید رنگ کا کتا تھا جو مرچکا ہے۔" شوکت نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے فوزیہ کی طرف غور سے دیکھا۔ "اب میرے خیال میں تم جاکر نہالو' تاکہ ہم تیار ہوکے کورٹ جاکر شادی کرلیں۔" "ہمیں بینک کے آدمی سے بھی ایک گھنٹے کے اندر اندر ملاقات کرنی ہے۔" شادی اور اس کی تیاری کے ذکر نے فوزیہ کو شرمانے پر مجبور کردیا۔ ابھی

چند لمحے قبل وہ طویل سفر سے یہاں پہنچی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک مرد اسے ایک ایسے کام کا حکم دے رہا تھا جو ان دونوں کی زندگیوں میں سے تنہائی کے اس خوف ناک حصار کو یکسر ختم کرسکتا تھا جس میں دونوں قید ہوکر رہ گئے تھے۔ فوزیہ عمارت کی طرف چل پڑی تاکہ شادی کی تیاری کرسکے۔

تو اس طرح فوزیہ مسز شوکت بن کے اس کی زندگی میں داخل ہوگئی جو ابتداء میں مسرت انگیز تھا لیکن شوکت قطعی طور پر رومان پرور شخص نہیں تھا۔ وہ تو ضرورت سے زیادہ گفتگو بھی نہ کرتا تھا۔

ایک روز فوزیہ کو یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ مسکراتا بھی کم سے کم تھا پھر بھی فوزیہ اسے پاکر خوش تھی ایک دوسرے کے سہارے وقت کٹ جاتا تھا پھر وہ اس کے تصوراتی محبوب کی طرح تھا۔ توانا اور تندرست اور اپنی تمام تر طاقت اور توانائی کے باوجود وہ فوزیہ کے لیے ایک مہربان اور بامروت شخص تھا۔ احساسات کی خوش رنگی اور طمانیت نے فوزیہ کی صحت پر خوش گوار اثر ڈالا تھا اس کے عارضوں کا رنگ سرخی مائل ہوچکا تھا۔

اس نے گھر بھر کو اپنی سلیقے اور صفائی پسندی سے چند ہی دنوں میں بدل ڈالا تھا۔ پُرکشش انداز سے ترتیب دیا گیا فرنیچر ایک نیا ہی منظر پیش کررہا تھا۔ نئے خوش نما پردے اور دوسری ہر چیز ضرورت کے لیے منگوا کر پُرسہولت اور باذوق انداز اپنایا گیا تھا۔ بڑے برآمدے میں پودوں کے گملوں کو ترتیب سے جوڑ کر قریب لاتے ہوئے خوش نما منظر پیدا کیا گیا تھا۔ لان سے اٹھنے والی بیلیں بھی کھینچ کر پھیلا کر دیواروں تک لاکر سجائی گئی تھیں۔ جو زمین پر گر کر میلی کچیلی ہوچکی تھیں۔ شوکت نے فوزیہ پر حکم چلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ہر بات کو مشورے کے رنگ میں پیش کرتا تھا۔ مثلاً اگر وہ رات گیارہ بجے بستر پر جانے کا عادی تھا تو ڈرائنگ روم کی آرام دہ کرسی سے اٹھتے ہوئے وہ فوزیہ کو سونے کا مشورہ دیتا۔ بالکل اس طرح جیسے شادی سے قبل اسے سہ پہر کو فوزیہ کو نہانے' لباس تبدیل کرنے اور تیار ہونے کا مشورہ دیا تھا۔

فوزیہ جب بھی اپنی یا گھر کی ضرورت کا احساس دلانے کی کوشش کرتی تو شوکت عام طور پر خاموش ہی رہتا البتہ بعض کاموں میں اس نے فوری تعاون کیا تھا۔ مثال کے طور پر فوزیہ نے شوکت سے چند شیلف بنوانے کی فرمائش کی۔ شوکت نے اگلے روز ہی تعمیل کرتے ہوئے اپنی ورکشاپ سے لکڑی کے کچھ فالتو تختے لاکر صحن میں بیٹھتے ہوئے اپنی فنی مہارت کا مظاہرہ کرکے عمدہ اور بہترین شیلف بنا کے خود ہی فٹ کردیئے۔ بالکل اس جگہ جہاں فوزیہ نے ہاتھ کے اشارے سے ان کی کمی کا احساس دلایا تھا۔

فوزیہ نے محسوس کیا کہ دیگر عام مردوں کی طرح وہ بھی چھوٹی چھوٹی گھریلو باتوں کو قطعی نظر انداز کردیتا ہے۔ جیسا کہ ایک روز فوزیہ نے اس سے گھر کی اندرونی اور بیرونی دیواروں کے رنگ و روغن کے بارے میں کہا تو وہ خشک لہجے میں کہنے لگا۔

"میرے خیال کے مطابق ابھی اس مکان کو مزید دو سال تک کسی ایسی چیز کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور تمہیں معلوم ہے کہ اتنے بڑے مکان کے اچھے رنگ و روغن پر کافی پیسے خرچ ہوجاتے ہیں۔" فوزیہ کو اس کی یہ تاویل پسند نہیں آئی لیکن وہ خاموش ہوکر کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے ویران ماحول کو دیکھنے لگی۔ ان کی سوشل زندگی تو یہاں تھی نہیں۔ اس کا شوہر تنہائی پسند تھا۔ اس کا کوئی دوست' رشتہ دار بھائی وغیرہ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی ہمسایہ تھا۔ فارم کے آخری سرے پر خاردار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ایک احاطہ بنا ہوا تھا جس کے اندر کچھ پرانی اور کچھ نئی اور

www.paksociety.com

ابھری ہوئی قبریں تھیں۔ شوکت نے بتایا تھا کہ وہ اس کے والدین کی قبریں ہیں۔ جو بچپن میں ہی اس علاقے میں گھر لوٹتے وقت ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے تھے۔ اسے پہلے دور سے اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ خوانی کے لیے آنا پڑتا تھا لیکن جب اس نے یہ فارم خرید لیا تو پھر فاصلہ سمٹ گیا۔

فوزیہ نے اسے کئی بار کہا کہ مجھے اس قصبے کے کچھ لوگوں سے ملواؤ تاکہ کمپنی ڈویلپمنٹ ہوسکے لیکن شوکت ہر بار اسے ٹالتا ہی رہا۔ کوئی نہ کوئی عذر اور بہانہ بنا کے صاف کنی کترا کے اِدھر اُدھر نکل جاتا۔ فوزیہ نے محسوس کیا کہ اس کی تنہائی میں صرف شوکت علی ہی داخل ہوا تھا' زندگی کی باقی رنگارنگی اور رونق سے وہ ابھی تک محروم ہی تھی۔ شوکت نے فوزیہ سے کہا کہ وہ قصبے کی عورتوں کے پاس بلاجھجک جاسکتی ہے' اس پر کوئی پابندی نہیں لیکن وہ اس قصبے کے باتونی لوگوں سے الگ ہی رہنا پسند کرتا ہے۔ یہ لوگ کرید کرید کے سوالات کرتے ہیں۔ اس کی زندگی میں جھانکنے کی زبردستی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان سے دور رہنا ہی پسند کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ شوکت دس میل کے فاصلے پر واقع لکڑی کی ورکشاپ کا مالک بھی تھا۔ وہ صبح نو بجے کام پر نکلتا اور شام سات بجے کے قریب واپس لوٹتا تھا۔ فوزیہ اتنا عرصہ ٹیلی ویژن پر کیبل کے پروگرام دیکھتے ہوئے وقت گزارتی تھی یا گھر کی صفائی ستھرائی اور کچن میں مشغول رہتی۔

آج اتوار کا دن تھا۔ شوکت ورکشاپ گیا ہوا تھا۔ ورکشاپ میں کوئی بڑا آرڈر آیا ہوا تھا' جس کی تکمیل کے لیے اتوار کو بھی کاریگروں اور ملازمین کو بلوایا گیا تھا۔

فوزیہ برتن دھونے کے بعد موٹر بائیک لے کر قصبے کی سیر کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ قصبے کے وسطی مقام پر ایک پارک میں عورتوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لیے ایک اجلاس ہو رہا تھا جس میں سیاسی و سماجی راہنما عورتوں سے متعلق مختلف اداروں کے قیام ترقی اور ذہنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے مختلف تجاویز دیتے ہوئے عوام کی تائید اور ردعمل کا جائزہ لے رہے تھے۔ فوزیہ کو موٹر سائیکل سے اترتے دیکھ کر قصبے کی چند عورتوں نے خوشی کا اظہار کیا۔

آپس میں تعارف ہوا۔ عورتوں نے اسے ایک نزدیکی عمارت میں آنے کی دعوت دی' جس کے باہر خواتین سلائی سینٹر لکھا ہوا تھا۔ وہاں جاکر عورتوں کے ساتھ فوزیہ نے سلائی کڑھائی کے مختلف ڈیزائن کا جائزہ لیا پھر وہ سب مل کے ایک چھوٹے سے سرسبز و شاداب باغیچے میں بیٹھ گئیں۔ چائے کا دور چلنے لگا۔ فوزیہ سے بے تکلف ہونے والی نوجوان اور شوخ عورت عالیہ نے فوزیہ سے اس کے خاوند شوکت علی کا نام سنا اور فارم کے متعلق معلوم کرکے چونک پڑی اور اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا۔ فوزیہ چونک پڑی۔

"عالیہ بہن! کیا بات ہے' تم بالکل خاموش اور افسردہ ہوگئیں؟"

فوزیہ ڈیئر! وہ آدمی شوکت علی اور اس کا فارم دونوں منحوس ہیں۔ اس کی پہلی دونوں بیویاں یکے بعد دیگرے حادثات کا شکار ہوچکی ہیں۔ تفتیش میرے بھائی انسپکٹر کامران نے کی تھی اگرچہ کچھ ثابت نہیں ہوسکا لیکن دال میں کالا ضرور ہے۔ یہ آدمی تنہا اور پُراسرار سا ہے۔ یہ الگ تھلگ رہتا ہے' میل جول سوشل لائف سے دور رہتا ہے۔"

"پہلی دو بیویاں؟" فوزیہ بڑے زور سے چونکی پھر غم و غصے سے اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ "اس نے مجھے اس سے بے خبر رکھا ہے۔" فوزیہ نے پرتشویش

لہجے میں کہا۔

"ظاہر ہے اگر وہ تمہیں حقیقت سے باخبر کردیتا تو تم اس کے نزدیک نہ آتیں۔ اس کی پہلی بیوی کا نام نیلم اور دوسری کا نام زمرد تھا۔ وہ اپنے ناموں کی مانند حسین و جمیل بھی تھیں لیکن......؟" عالیہ سانس لینے کے لیے رک گئی۔ فوزیہ کی بے تابی بڑھ گئی۔

"لیکن کیا؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"لیکن دونوں کو اس کے منحوس گھر میں زندگی کی خوشیاں نہ مل سکیں اور دونوں حادثاتی طور پر ہلاک ہوگئیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ وہ حادثات نہیں تھے۔ نیلم سیڑھیوں سے گر کر ہلاک ہوئی تھی۔ شوکت اس وقت گھر پر نہیں تھا' باہر سے اندر داخل ہوا تھا جب اس نے نیلم کو سیڑھیوں کے سامنے مردہ پایا۔ دوسری بیوی زمرد اپنے بیڈروم میں سونے کے لیے داخل ہوئی وہ اپنی ایک سہیلی کی سالگرہ سے آرہی تھی' اس نے اپنے زیورات اتارے اور انہیں تجوری میں رکھنا چاہتی تھی کہ پردے کے پیچھے چھپے ڈاکو نے اس سے خنجر کے بل پر زیورات چھین لیے۔ زمرد نے مزاحمت کی اور ڈاکو نے اسے ہلاک کردیا اور خود فرار ہوگیا۔ بقول شوکت کے اس نے اپنی بیوی کی چیخ سنی اور اپنے گودام سے نکل کر اس کی طرف بھاگا' اس نے کلہاڑی لے کر ڈاکو کا پیچھا بھی کیا لیکن وہ بھاگنے میں کامیاب ہوگیا اور اس طرح یہ سرسبز و شاداب فارم کشادہ گھر اور باقی مال و متاع بھی شوکت کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ گھر اور فارم نیلم کی ملکیت تھا۔ اس کے بعد اس نے شادی کی ہے اور اب خدا جانے کیا ہو' اس نے اپنی دونوں سابقہ بیویوں سے "تنہائی کا ساتھی" نامی کلب یا ادارے کے توسط سے رابطہ قائم کیا تھا وہ دونوں عورتیں تنہائی کا شکار تھیں اور کسی اچھے جیون ساتھی کی تلاش میں تھیں لیکن انہیں موت کی تنہائی

aanchal.com.pk
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
پرچہ نہ ملنے کی صورت میں دفتر سے رابطہ کریں۔ فون 35620771/2

اپنے ساتھ لے گئی۔"

فوزیہ بار بار چونکتی رہی پھر تذبذب کی کیفیت کا شکار ہوکر سوچنے لگی کہ اتنی جلدی شکوک وشبہات کو دل میں جگہ دے یا اسے عالیہ کی منافرت سے تعبیر کرے۔ فوزیہ وہاں سے اٹھ کے کچھ فاصلے پر موجود لائبریری میں آئی۔ لائبریری کے ماحول میں اسے سکون وطمانیت کا احساس ہوتا تھا پھر علم اور آگہی بھی اس ذریعے سے حاصل ہوتی تھی۔ اس نے ایک لڑکے سے جوس کا گلاس منگوا کر پیا اور قدرے پُرسکون ہوکے اس نے متعلقہ میز پر بیٹھ کر وہ تمام اخبارات اندازے سے نکالے جن میں "تنہائیوں کا ساتھی" نامی کلب کے اشتہارات شائع ہوتے رہے تھے۔ ان کے ممبران کی تفصیل موجود تھی اور فہرست بھی جو ایک دوسرے کے ساتھ شادی کے بعد اچانک مرگئے تھے یا مارڈالے گئے تھے۔ ساری معلومات جمع کرنے کے بعد فوزیہ کو حیرت ہوئی کہ سب کے ساتھ ملتا جلتا حادثہ پیش آیا تھا۔ موت کسے نہیں آتی لیکن اتنے افراد کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتا جلتا حادثہ واقع ہونا منفی رجحانات کی عکاسی کررہا تھا وہ سوچنے لگی کہ اگر اس کا شوہر زر پسند آدمی ہے تو اسے اس سے محتاط رہنا ہوگا۔ وہ اس کی ہر ہر حرکت پر نظر رکھے گی۔ جب وہ موٹر بائیک پر گھر کی طرف واپس لوٹی تو اس کا ذہن شکوک وشبہات سے بھر چکا تھا' اسے شوکت کے ساتھ گھر کے باغیچے میں کپڑے دھونے کا مقام دیکھتے وقت ایک پودے کے نیچے مٹی میں سرخ سبز اور نیلی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی چمکتے ہوئے دکھائی دیئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ واقعی اس گھر کا ماحول دو عورتوں کی موت سے آلودہ ہو چکا تھا اور اب اسے بھی شاید خطرہ ہی لاحق ہے۔

رات کے وقت اس کا شبہ اور پختہ ہوگیا۔ شوکت خلوت میں اپنے لمحات رنگین بنانے کے بجائے اس کے پاس سے اٹھا اور ٹہلنے کے بہانے دوسری منزل سے اتر کے صحن عبور کرکے گھر کے عقبی دروازے سے باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ اس وقت پورا چاند عین اس کے سر پر چمک رہا تھا۔ فوزیہ نے مسرت انگیز لمحات کے خمار سے نکل کے کھڑکی سے شوکت کو عقبی راستے سے باہر جاتے دیکھا تو چونک اٹھی اور خود بھی پورا لباس پہن کے جوتے جلدی جلدی پاؤں میں ڈالے اور تیزی سے زینے کی طرف لپکی۔ وہ نیم غنودہ سی کی پڑی تھی جب شوکت اس کے گال کو چھیڑتے ہوئے کہا تھا کہ آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں وہ ذرا نیچے صحن میں ٹہلنے کے لیے جارہا ہے لیکن وہ تو عقبی دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔ شک کا ناگ اس کے دل میں سر اٹھانے لگا اور وہ زینہ طے کرکے دبے پاؤں عقبی دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ بھیڑا ہوا تھا۔ باہر نکل کے اسے دور شوکت فارم کی طرف مڑنے والی پگڈنڈی پر جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا دکھائی دیا۔ پورے چاند کی زرد روشنی میں وہ بالکل واضح اور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ سرد ہوا خاموشی' تاریکی اور ماحول کی پُراسراریت کے باوجود وہ بے پاؤں بھاگتی ہوئی شوکت سے قریب ہونے لگی' وہ اسکول کے زمانے میں بہت اچھی ایتھلیٹ رہی تھی اس لیے اسے کچھ وزنی جسم کے ساتھ بھی بھاگنے میں دقت نہ ہوئی۔ شوکت فارم سے گزرنے والی روش پر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا جارہا تھا' معلوم نہیں تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ اسے وہم دگمان بھی نہیں تھا کہ اس کی تیسری بیوی دبے پاؤں اس کے تعاقب میں بھاگ رہی ہوگی۔ اس کے خیال میں تو وہ بستر پر نیند کے مزے لوٹ رہی ہوگی۔ فوزیہ اکثر اس وقت سوجایا کرتی تھی۔ شوکت ایک بھرپور اور نشاط انگیز رفاقت کا ساتھی تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت کافی کشش رکھتی تھی لیکن اسے اپنی زندگی بھی پیاری تھی وہ غفلت میں تر نوالا ثابت نہیں ہونا چاہتی تھی۔

اچانک ایک الو کی چیخ نما آواز سے وہ چونک پڑی اور ٹھٹک گئی لیکن پھر تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ایک بار چند پرندے یک دم اس کے سامنے جھاڑیوں سے اڑتے ہوئے فضا میں بلند ہوگئے وہ جلدی سے نیچے بیٹھ گئی جب وہ اونچے اڑ گئے تو وہ پھر آگے بڑھنے لگی' ایک پرندہ اس کے شانے سے بھی ٹکرا گیا تھا۔ ایک بار کسی چھوٹے موٹے جانور کی آواز سن کر شوکت چونک کر مڑا تو فوزیہ جلدی سے ایک قریبی جھاڑی میں سرک گئی اور اس کی نگاہ میں آنے سے بال بال بچ گئی۔ سرد ہوا تیز ہوگئی تھی اور اس کے جھونکے شائیں شائیں کا شور مچاتے ہوئے درختوں اور جھاڑیوں سے گزرتے تو خاموشی کی روح لرز جاتی۔ چاند اب بادلوں کے سیاہ ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔

اچانک ایک موڑ مڑنے کے بعد شوکت رک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک جھونپڑی کے اندر داخل ہوگیا۔ یہ جھونپڑی فارم کی حدود سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک پرانے شکستہ مندر اور اردگرد پھیلی چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے درمیان واقع تھی۔ فوزیہ نے عورتوں سے سنا تھا کہ اس طرف بدروحوں کا مسکن ہے۔ یہ لوگ اچانک زلزلہ آنے سے مندر میں ہلاک ہوگئے تھے ان کی روحوں کو چین نہیں آیا تھا' وہ اب تک بھٹک رہی تھیں۔ کچھ گڈریوں نے اس طرف سے ڈراؤنی آوازیں بھی سنی تھیں۔ جب شوکت جھونپڑی سے باہر نکلا تو ایک کالے رنگ کا بدشکل سا آدمی جس کی سرخ سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں جو صرف ایک دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ شوکت کو کچھ سمجھاتا ہوا آگے آرہا تھا۔ شوکت نے ہاتھ میں کوئی ٹوکری نما شے اٹھا رکھی لیکن فوزیہ صحیح اندازہ نہ لگا سکی کہ وہ کیا ہے کیونکہ اس وقت چاند ایک سیاہ بادل کے پیچھے چھپ گیا تھا اور ماحول پر اندھیرا چھا گیا تھا۔

فوزیہ نے اب بے آواز واپس بھاگنا شروع کیا۔ اس کا شبہ یقین میں بدل چکا تھا۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ ہوسکتا ہے کہ شوکت کوئی ضروری چیز حاصل کرنے آیا ہو' جس کا اس نے اس سے تذکرہ مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن پھر گزشتہ دو بیویوں کا ہلاک ہونا اور شوکت کا ان کے معاملے کو اس سے چھپانا اس کے شکوک کو تقویت بخشنے لگا۔

وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ عقبی دروازے سے گزر کر زینہ عبور کرکے اپنی خواب گاہ میں چلی گئی اور لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ شوکت اس کے پاس نہ آیا اور اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔



اگلی صبح ناشتے کے بعد فوزیہ نے شوکت سے پوچھا کہ "اتنے بڑے گھر میں اس نے کوئی ملازم یا ملازمہ کیوں نہیں رکھی' اسے صفائی اور مختلف کاموں میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" تو شوکت نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"پیاری فوزیہ! کیا بتاؤں' میں نے دو تین لڑکوں کو ملازم رکھا تھا لیکن وہ سب کے سب چور نکلے میں تو صبح ورکشاپ چلا جاتا تھا وہ کچھ نہ کچھ کھسکاتے رہتے تھے' ایک ملازمہ بھی رکھی تھی لیکن اس نے مجھ پر جھوٹا الزام لگادیا کہ میں نے اس پر دست درازی کی ہے حالانکہ وہ خود مجھے بدکاری پر مائل کرنا چاہتی تھی۔ اس علاقے کے ملازم اور ملازمائیں بہت چور واقع ہوئی ہیں۔ دوسرے گھروں میں بھی چوروں سے مل کے کئی بار صفایا کروا چکی ہیں اس لیے میں اب ملازم یا ملازمہ رکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔"

www.paksociety.com

"لیکن میں اس کی ضرورت محسوس کرتی ہوں پھر دن بھر اتنے بڑے گھر میں تنہا رہنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ موبائل یا کیبل انسانوں کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتے۔" فوزیہ نے اپنی پرابلم کا اظہار کیا۔

شوکت سر جھکائے کچھ سوچتا ہوا خاموش رہا پھر ٹائم دیکھ کر ورکشاپ جانے کے لیے نکل گیا۔ فوزیہ نے اسی وقت موٹر بائیک پر قصبے کا چکر لگایا اور ایک بااعتماد لڑکے کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئی جو صفائی ستھرائی اور کچن کا کام بھی جانتا تھا' لڑکے کی عمر سترہ سال تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں اور جسمانی طور پر ہوشیار اور پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ فوزیہ کی ترجیح تو ملازمہ تھی لیکن ملازمہ کوئی مل نہیں سکی تھی پھر اس نے لڑکے کو ہی رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شام کے وقت لڑکے کو شوکت نے ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور خون کے گھونٹ بھر کے رہ گیا لیکن بولا کچھ نہیں۔ کھانے کے دوران لڑکے نے بار بار شوکت سے باادب طور پر اس کی فرمائش کے متعلق پوچھا' ان کے کمرے کی یا ٹرک کی صفائی کے بارے میں نہایت لجاجت سے جھاڑ پونچھ کے احکامات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن شوکت نے ٹال مٹول سے کام لیا کہ "فی الحال اسے بالکل ضرورت نہیں' وہ اپنے سارے کام خود کرتا ہے اور وہ بیگم صاحبہ کی خدمت پر مامور رہے۔"

"ٹھیک ہے صاحب!" ملازم رشید نے سر جھکا کر کہا۔



اگلے روز فوزیہ ملازم رشید کو گھر کا خیال رکھنے کا حکم دے کر قصبے کے بازار کی طرف نکل کھڑی ہوئی اس نے دور دراز علاقے کے ایک بازار میں اسلحے کی ایک دکان کے سامنے موٹر بائیک روکی' دکان کا جائزہ لیا اور پھر کچھ دور جا کے پارکنگ اسٹینڈ پر بائیک کھڑی کر دی اور پیدل چلتی ہوئی دکان کی طرف چلنے لگی اس نے اس وقت سرخ بالوں کی وگ اور سیاہ شیشوں والی بڑی عینک لگا رکھی تھی۔ کوٹ کے کالر اس نے کھڑے کر رکھے تھے سر پر چوڑے چھجے والا ہیٹ تھا۔ پرس میں وہ اپنے ساتھ کافی پیسے لائی تھی جو اس نے بینک سے نکلوائے تھے۔ وہ اسلحے کی دکان میں داخل ہوئی اور گھوم پھر کر دوسرے کچھ لوگوں کے ساتھ شوکیسوں میں سجے ہتھیار دیکھنے لگی۔ اسے نقرئی دستے والا ایک چھوٹا سا جدید ریوالور جو لندن کی ولسن اینڈ ولسن کمپنی کا بنا ہوا تھا۔ نکلوا کر خرید لیا اسے وہ بآسانی اپنے پرس میں رکھ سکتی تھی۔ پستول کی خریداری کے بعد رجسٹر پر اندراج کا مرحلہ آیا تو فوزیہ نے فرضی نام اور پتا لکھوا دیا۔ حلیہ بھی وہ تبدیل کیے ہوئے تھی کوٹ کے کالر کھڑے تھے سر پر ہیٹ اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ دکان دار شاید خوب صورت عورتوں کا دیوانہ تھا اس نے فوزیہ کے وجود پر ایک وحشیانہ سی نگاہ ڈالی اور رقم لے کر پستول مسکراتے ہوئے اس کی طرف سرکا دیا۔ فوزیہ نے پستول اپنے سرخ پرس کی اندرونی جیب میں چھپا کر رکھ دیا۔ جس کا اندازہ پرس کھولنے پر بھی شوکت کو نہیں ہو سکتا تھا۔

اب وہ واپس گھر روانہ ہوئی۔ ہنی مون کے طور پر تقریباً ایک ماہ خوش گوار انداز سے گزرا۔ ملازم لڑکا بڑی محنت اور لگن سے ہر کام میں اس کا ساتھ دیتا رہا۔ شوکت بدستور اس سے خائف رہا پھر مہینے کی آخری تاریخ کو صبح اچانک شوکت بدحواس سا فوزیہ کے کمرے میں داخل ہوا اور چلا کر بولا۔

"میری گھڑی' سونے کی چین اور بٹوہ غائب ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ یہاں کے لڑکے چور ہوتے ہیں۔ دیکھو! وہ کہیں بھاگ نہ جائے۔"

شوکت آگے اور فوزیہ پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے رشید کے سرونٹ کوارٹر میں داخل ہوئے۔ رشید کو تنخواہ مل چکی تھی' وہ اپنا اٹیچی کیس بند کرتے ہوئے چار دن کی چھٹی پر روانہ ہونے ہی والا تھا۔

"رشید! صاحب کی گھڑی' چین اور بٹوہ غائب ہے۔" فوزیہ نے مشکوک نگاہوں سے رشید کو گھورا۔ رشید فوراً شوکت کو سر سے پیر تک دیکھ کر بولا۔

"میڈم! مجھے اپنی والدہ کے دودھ کی قسم میں نے کچھ نہیں چرایا۔ میرا اٹیچی کیس دیکھ لیں۔" شوکت نے اٹیچی کیس کی ہر چیز الٹ پلٹ کر دی لیکن کچھ بھی برآمد نہ ہوا پھر وہ بھاگ کر کمرے کی دوسری چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگا۔ آخر اس کا بٹوہ' گھڑی اور چین بستر کے نیچے سے نکل آئی۔ شوکت خونخوار نظروں سے لڑکے کو گھورنے لگا۔

لڑکا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھنے لگا پھر چلا اٹھا۔

"میں چور نہیں ہوں' میں چور نہیں ہوں' اگر میں چور ہوتا تو میں یہ چیزیں اٹیچی کیس میں رکھ کے لے جا رہا ہوتا' بستر کے نیچے سے یہ چیزیں نہ ملتیں۔" فوزیہ بھی لڑکے کی دلیل سن کر شش و پنج میں پڑ گئی کہ لڑکا چور ہے یا نہیں۔

"ڈیئر فوزیہ! یہ چور حضرات بہت چالاک ہوتے ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ ہم اس کے کوارٹر کی طرف دوڑے آ رہے ہیں تو اس نے یہ چیزیں اٹیچی کیس سے نکال کے واپس بستر کے نیچے چھپا دیں۔" شوکت غصے سے کپکپا رہا تھا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"میں چور نہیں ہوں میڈم! میں نے چوری نہیں کی' میں تو رات کا کھانا کھا کے گھر سے باہر نکل آیا تھا پھر میں واپس اندر گیا ہی نہیں۔"

"پھر چیزیں کیسے تمہارے بستر کے نیچے چلی آئیں' کیا ان کے پر نکل آئے تھے؟" شوکت دہاڑا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں' ہو سکتا ہے آپ مجھے نکالنا چاہتے ہوں اور آپ......" رشید نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"دیکھا تم نے' ملازم کتنے نمک حرام اور زبان دراز ہوتے ہیں۔" شوکت اسے مارنے کے لیے لپکا۔ فوزیہ نے بمشکل اسے روکا۔ "اب تم یہاں سے نکل جاؤ' تمہاری ملازمت ختم ہو چکی ہے۔" شوکت گرجا۔

"ہاں شوکت صاحب میں جا رہا ہوں لیکن ذرا آپ بھی میڈم کو بتا دیں کہ آپ نے گودام میں کیا چھپا رکھا ہے جسے آپ بار بار رات کو دیکھنے جاتے ہیں۔" رشید نے اٹیچی کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ بالکل بکواس کر رہا ہے فوزیہ! گودام میں کچھ بھی نہیں' جا کر دیکھ لو۔" فوزیہ شش و پنج کے عالم میں کبھی شوکت کو دیکھتی اور کبھی لڑکے کی کیفیت' وہ اسے چور معلوم نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایک دن اس کی سونے کی انگوٹھی باتھ روم میں رہ گئی تھی لیکن صفائی کرتے ہوئے رشید نے اسے لا کر واپس دے دی تھی۔ وہ خاموشی سے انگوٹھی بھی تو غائب کر سکتا تھا لیکن اس نے چوری نہیں کی تھی اور اسے یاد بھی نہیں تھا کہ انگوٹھی کس جگہ اتار کر رکھ دی تھی۔ بہر حال رشید ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔ شوکت نے اسے برا بھلا کہا اور ساتھ ہی کہنے لگا کہ وہ پولیس کے چکر میں الجھنا نہیں چاہتا۔



وہ صبح مجھ کو لے کر قبرستان کی طرف آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں باغیچے کے تازہ سرخ پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکری تھی۔

"فوزیہ! میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے ایک دوست راحیل نے آج ہم دونوں کو دعوت پر بلایا

www.paksociety.com

www.paksociety.com

ہے۔ میں جانے سے پہلے اپنے والدین کی قبروں پر پھول چڑھانا چاہتا ہوں۔'' شوکت نے بڑھتی ہوئی صبح کی دھند اور بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ دھند ماحول پر حاوی ہوتی جارہی تھی۔ ٹھنڈک اور نمی بھی کافی بڑھنے لگی تھی۔

''شوکت مجھے اپنے ساتھ لپٹائے لیے جارہا تھا۔ میں نے عقل مندی کی تھی کہ صبح ہی اپنے پرس سے پستول نکال کر جیب میں ڈال لیا تھا۔ تیز تیز چلتے ہوئے فارم کو عبور کرکے ہم باہر نکلے اور قبرستان کی طرف چلنے لگے۔ چند قدم چلنے کے بعد جھاڑیوں میں بنا راستہ سامنے آ گیا۔ اب شوکت آگے بڑھا اور میں پیچھے رہ گئی۔ شوکت جلدی سے قبروں کی طرف بڑھا اور ان پر پھول چڑھانے لگا۔ میں بھی قریب چلی گئی' میرا ایک ہاتھ جیب میں چلا گیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ شوکت نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے میں نے بھی اٹھا دیئے۔ دعا ختم کرنے کے بعد میں نے خارجی راستے کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک شوکت سے کہا۔

''شوکت صاحب! آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔''

''کون سا جھوٹ؟'' شوکت ٹھٹک کر رک گیا اور مجھے گھورنے لگا۔ وہ سٹپٹا سا گیا۔

''یہی کہ یہ تمہارے والدین کی نہیں بلکہ تمہاری دونوں سابقہ بیویوں کی قبریں ہیں۔'' میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ شوکت اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی جس میں مایوسی کا عنصر تھا۔

''ڈیئر! میں نے اس لیے سابقہ بیویوں کا تذکرہ نہیں کیا تھا کہ پھر تم میرے نزدیک آنے کی کوشش نہ کرتیں بلکہ مجھے فوراً مسترد کردیتیں' میں نے اپنی اور تمہاری تنہائی کو دور کرنے کے لیے مصلحتاً ان کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں دنیا کا بدقسمت انسان ہوں۔ عورتیں میری زندگی میں آئیں لیکن موت کا پنجہ انہیں مجھ سے جدا کرتا رہا۔ میں دنیا کا محروم ترین انسان ہوں جو اتنے بڑے گھر کے باوجود بھی تنہا رہ گیا تھا۔''

''شوکت! تمہارے جھوٹ نے اس شادی کو بھی مشکوک بنا دیا ہے۔ پولیس کو اب تک شبہ ہے کہ اپنی دونوں بیویوں کو تم نے چالاکی سے ہلاک کیا اور عدم ثبوت کی بنا پر اب تک آزاد ہو' تم بالکل مفلس تھے' پہلی بیوی کے ورثے میں تمہیں یہ گھر فارم اور نہ جانے کتنا بینک بیلنس ملا ہوگا۔ جو تمہارے دوسرے بینک اکاؤنٹس میں موجود ہوگا۔ میں تمہارے کپڑے لٹکانے والی الماری کے عقب میں بنے خانے کو کھولنے میں کامیاب ہوچکی ہوں اس میں متعدد چیک بکس اور کثیر تعداد میں بینک میں جمع رقومات کے اعداد و شمار موجود ہیں۔ جو تم نے مجھ سے چھپائے اور صرف چار لاکھ رقم اثاثے کے طور پر ظاہر کی اور میرے بیس لاکھ کے ساتھ جمع کروائی۔'' میں نے سرد لہجے میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''اوہ! تو تم حقیقت کی تہہ تک پہنچ ہی گئی ہو تو پھر تمہیں بھی راستے میں نہیں بلکہ ابھی اور اسی وقت مرنا ہوگا۔ تمہاری موت سانپ کے کاٹنے سے ہوگی۔ یہی وہ چیز ہے جو اس چھوکرے کے بیان کے مطابق میں گودام میں دیکھنے جاتا تھا۔ وہ میں نے رات کو ہی لا کر یہاں چھپا دی تھی۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی شوکت نے اک گنجان جھاڑی سے سانپ کی پٹاری نکال لی۔

''شوکت صاحب!'' میں نے طنزیہ اور سرد لہجے میں کہا۔ ''جب تم یہ پٹاری خرید کر لائے تھے میں اس وقت بھی تمہارے تعاقب میں تھی۔ میں تمہاری دوسری بیویوں کی طرح تر نوالا نہیں ہوں۔''

''لیکن تم سانپ سے کیسے بچو گی۔ میرا بیان یہ

ہوگا کہ ہم قبروں پر فاتحہ خوانی کررہے تھے کہ سانپ کسی طرف سے آ نکلا اور اس نے میری تیسری بیوی کو ڈس لیا' میں نے سانپ کو مارنے کی کوشش کی لیکن وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا (اگر میں تمہیں ڈسوانے کے بعد اسے مارنے میں کامیاب نہ ہوا) اگر مارنے میں کامیاب ہوگیا تو پھر میرا بیان ہوگا میں نے غضب ناک ہوکر سانپ کو کچل کر رکھ دیا۔ میں ایک عورت کے ساتھ اکتا جاتا ہوں اس لیے مجھے بیویاں بدلنے کا شوق ہے اور ساتھ ہی مال بھی ہاتھ لگ جاتا ہے۔'' شوکت کسی سانپ کی مانند پھنکارا۔ اس لمحے پٹاری شوکت نے میری طرف کھول کر پھینک دی۔ سانپ پھنکارتا ہوا باہر نکلا۔ اسی لمحے میرا پستول باہر نکلا۔ میں فارم میں پستول چلانے اور نشانہ باندھنے کی مشق بھی کرچکی تھی' پہلی گولی نے ہی سانپ کا کام تمام کردیا' اس کا دو ٹکڑے ہونے والا وجود تڑپنے لگا۔ شوکت کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

''شوکت صاحب! میں نے تنہائی میں جاسوسی ناولوں کو اپنا ساتھی بنایا تھا جنہیں پڑھنے کے بعد انسان تر نوالا نہیں بنتا۔ میں بہت سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ اپنی پہلی بیوی نیلم کو تم نے دوسری منزل سے دھکا دیا' پھر اس کے مرنے کا جائزہ لے کر عقبی دیوار پھلانگ کر باہر چلے گئے اور دور نکل کر گھر کے صدر دروازے پر آ کر اطلاعی گھنٹی مسلسل بجانے لگے۔ دوسری بیوی زمرد کو بھی تم نے قتل کیا اس کے بیش قیمت زیورات چھپائے اور پھر گودام میں جا کر واپس بھاگ کر آئے اور کچھ علامتیں ڈاکے کی بنا کے ڈرامہ رچا دیا۔'' میری آواز شوکت کے ہوش اڑانے لگی' وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ اس نے میری طرف جست کی مجھے دبوچنے کے لیے لیکن میرے پستول کی گولی اس کے دل کے مقام پر لگی' خون تیزی سے نکلنے لگا' وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

''اُف! میرا دل پھٹ گیا ہے۔'' وہ بڑبڑا کر تڑپنے لگا۔

''ہاں! تمہارا دل پھٹ جانے کے ہی قابل ہے' جس دل میں زر کی ہوس اور عورتوں کی حرص کے علاوہ اور کچھ نہ ہو وہ اسی قابل ہے کہ پھٹ جائے۔'' میں نے چیختے ہوئے کہا۔ وہ طاقت ور اور سخت جان تو تھا' اچانک اٹھا اور میری طرف لپکا' اب وہ مجھ سے ایک گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے دوسرا فائر کیا' گولی اس کے نازک مقام پر لگی اور خون کے ابلنے کے بعد وہ مچھلی کی مانند تڑپنے لگا۔ اس کی کراہوں اور چیخوں سے ماحول گونجنے لگا۔

''جتنا بھی چیخو' تمہاری آواز کوئی نہیں سنے گا۔ تم نے خود ہی ویرانے میں ڈیرا لگا رکھا تھا۔'' میں نے نفرت سے تھوکتے ہوئے کہا۔ پھر میں بھڑک کر آگے بڑھی اور قریب المرگ شوکت کے لمبے سنہرے بال پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہنے لگی۔ ''خبیث انسان! میں نے اپنی تنہائی دور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تم تو تنہائی کے سانپ ثابت ہوئے۔ اب میرا بیان بھی یہی ہوگا کہ ایک ڈاکو میرے زیورات چھیننے کے لیے قبرستان سے آ نکلا' میرا خاوند اس سے الجھ پڑا اس نے میرے خاوند کو گولیاں ماردیں اور فرار ہوگیا۔ میں زیورات سمیت گھر کی طرف بھاگ نکلی تھی۔ سانپ کا ذکر گول کردوں گی۔ اسے مٹی میں دبا دیا جائے گا۔'' میری آواز اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند اترتی چلی گئی۔ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ مرنے کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں حیرت کا عنصر منجمد دکھائی دے رہا تھا۔

⌘



روبین احمد

مصباح رانی.....آزاد کشمیر

یہ ہی جگہ جہاں ہم سب مل کر بیٹھے ہیں
کل خدا جانے یہاں پر کون ہوگا
بچھڑنے والے تجھے دیکھ دیکھ کر سوچتا ہوں
تو پھر ملے گا تو کتنا بدل چکا ہوگا

وریشا جلیل.....حیدرآباد

خیال کو تیری آہٹ کی آس رہتی ہے
نگاہ کو تیری صورت کی پیاس رہتی ہے
تیرے بغیر کسی چیز کی کمی تو نہیں
تیرے بغیر طبیعت اداس رہتی ہے

جبران انصاری.....بورے والا

رخصت ہوا تو بات مری مان کر گیا
جو اُس کے پاس تھا وہ مجھے دان کر گیا
بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

ظفر احمد.....مظفر گڑھ

کتنا مشکل ہے زندگی کرنا
جس طرح تجھ سے دوستی کرنا
اک کہانی نہ اور بن جائے
تم ذرا بات سرسری کرنا

کومل فرید.....کراچی

تیرے نام کی تھی روشنی اسے خود ہی تُو نے بجھا دیا
جسے جلا سکی نہ دھوپ بھی اسے چاندنی نے جلا دیا
میں ہوں گردشوں میں گھرا ہوا مجھے آپ اپنی خبر نہیں
جو شخص تھا میرا رہنما اسے راستوں میں گنوا دیا

عابد حسین.....میر پور

دل میرا سوگوار اب بھی ہے
ہاں تیرا انتظار اب بھی ہے
ورد تھمتا نہیں کسی بھی صورت
آنکھ یہ اشکبار اب بھی ہے

سعدیہ خان.....جہلم

اس سمت چلے ہو تو اتنا اسے کہنا
باقی نہ سنیں صرف تنہا اسے کہنا
ہم نے ہلال عید کے ہاتھ بھجوایا یہ سندیسہ
کرتا ہے تمہیں کوئی یاد بہت اسے کہنا

اقصیٰ بٹ.....لاہور

محبتوں میں جینے والے خوش نصیب ہیں
محبتوں میں مرنے والے بھی عجیب ہیں
عظیم ہے ہماری داستان جانِ من
فاصلوں پہ رہتے ہیں لیکن قریب ہیں

نازش خان.....کراچی

ہم سے دور جاؤ گے کیسے!
دل سے ہمیں بھلاؤ گے کیسے!
ہم تو وہ خوشبو ہیں جو سانسوں میں بستی ہے
خود کی سانسوں کو روک پاؤ گے کیسے!

احمد وارثی.....لاہور

کب دیوانے دور ہوئے ہیں
دنیا سے مجبور ہوئے ہیں
ملنا ہو تو ڈھونڈ لو ہم کو
ہم تو تھک کر چُور ہوئے ہیں

ہما اسلم.....گوجرانوالہ

مجھ سے بچھڑ گیا جو گئے سال کی طرح
اس کا بھی حال ہوگا میرے حال کی طرح
آیا نہیں وہ رہ گئے رستے سجے سجائے
یہ سال بھی چلا گیا ہر سال کی طرح

عمارہ نیر.....شوگر مل کمالیہ

کہاں تجھ سے میرا سوال ہے میرے راستوں کو گلاب کر
مجھے آبلے بھی قبول ہیں ذرا دو قدم میرے ساتھ چل
میرے ہاتھ میں تیرا ہاتھ ہو کٹے عمر بھر اسی حال میں
یہی آرزو کی ہے ابتداء یہی انتہا میرے ساتھ چل

خرم.....سرگودھا

آتشِ عشق کو کیوں لوگ ہوا دیتے ہیں
ہم تو دشمن کو بھی جینے کی دعا دیتے ہیں

طٰہٰ.....سرگودھا

میرے دل کے نیم تاریک دریچوں میں
روشن تیرے ہجر کے دیئے رہتے ہیں

راحیلہ عمران.....فیصل آباد

ہر شام اس سے ملنے کی عادت سی ہوگئی
پھر رفتہ رفتہ اس سے محبت سی ہوگئی
شاید یہ تازہ تازہ جدائی کا تھا اثر
ہر شکل یک بیک تری صورت سی ہوگئی

طاہرہ اسلم.....احمد پور سیال

ملے ہیں یوں تو کئی رنگ کے حسین چہرے
میں بے نیاز رہا موجِ صبا کی طرح
تری قسم تیری قربت کے موسموں کے بغیر
زمیں پہ میں بھی اکیلا پھرا خدا کی طرح

رخسانہ سعید.....شیخوپورہ

پچھلے خواب کی یاد میں گم ہوں
میں گزرے ہوئے کئی سال سے
اے کاش کوئی مجھے نکال دے
اس طلسمِ ماضی و حال سے

امبرین قمر.....حیدرآباد

چند لمحے نشاط کے چُن کر زندگی سجالی ہم نے
بستے بستے دل کی بستی میں اپنی دنیا بسالی ہم نے
ساحل پہ جو بناتے آ آکر مٹا دیتیں موجیں
کوئی مٹائے گا کیسے تیری تصویر جو دل میں بنالی ہم نے

ثمینہ.....کراچی

تیری یادوں کے چراغوں کو جلایا ہر سال
تیری تصویر کو سینے سے لگایا ہر سال
مانگی ہے خدا سے تیرے ملنے کی دعا
بیٹھ کر تنہا ہاتھوں کو اٹھایا ہر سال

ریحانہ.....چوٹالہ

حسرتیں بے قیاس ہوتی ہیں
صورتیں غم شناس ہوتی ہیں
جن کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ہوتی ہے
اکثر ان کی آنکھیں اداس ہوتی ہیں

کاشف اعوان.....ہری پور ہزارہ

وقت کی آنچ سے پتھر بھی پگھل جاتے ہیں
قہقہے ٹوٹ کر اشکوں میں بدل جاتے ہیں
عمر بھر کون کسی کو یاد کیا کرتا ہے
وقت کے ساتھ خیالات بھی بدل جاتے ہیں

عائشہ.....اسلام آباد

خوشیوں بھرا یہ سال ہو میرے ساتھ یہ دعا کرو!
اب کسی کے ساتھ برا نہ ہو میرے ساتھ یہ دعا کرو
اجڑے نہ گھر کسی کا نہ غم ہی پاس آئیں!
امن وسکوں کا سال ہو میرے ساتھ یہ دعا کرو!

انیق الرحمان.....فیصل آباد

سب کے ہونٹوں پہ میرے بعد ہیں باتیں میری
میرے دشمن میرے لفظوں کے بھکاری نکلے
ہم کو ہر دور کی گردش نے سلامی دی ہے
ہم وہ پتھر ہیں جو ہر دور میں بھاری نکلے

فیصل احمد.....جھڈو

وہ بے ارادہ سہی تتلیوں میں رہتا ہے
کہ میرا دل مٹھیوں میں رہتا ہے
الاؤ بن کے دسمبر کی سرد راتوں میں
تیرا خیال میرے طاقچوں میں رہتا ہے!

www.Paksociety.com

www.Paksociety.com

گلناز......پشاور

وحشت جو پڑی دیوانہ ہوا
در در پہ صدائیں دینے لگا
جس در پہ گیا آئی یہ صدا
اس گھر میں تمہارا کوئی نہیں

سحرش......کراچی

جس نے تیری روشن آنکھیں دیکھی ہوں
کیسے گھبرائے گا تیز شعاعوں میں
دکھڑے سہتے مرجاؤں گا جب نیر
کمی کرے گا تب وہ میری سزاؤں میں

فرزانہ......کورنگی' کراچی

تو کرم کرنہیں سکتا تو ستم توڑ کے دیکھ
میں تیرے ظلم کوبھی حسن ادا دے جاؤں گا
رخ بدل دوں گا صبا کا تیرے کوچے کی طرف
اور طوفان کو اپنا ہی پتا دے جاؤں گا

فرحین احمد......کہروڑپکا

آتی ہیں بدلتے موسم کی صدائیں
دیتا ہے کوئی عمرگزشتہ کی صدائیں
لوٹ آئے ہیں نکھرے دن' چاندنی راتیں
کس دیس سے اے دوست تجھے ڈھونڈ کے لائیں

عشرت......فیصل آباد

جس نے گھر اپنا شیشے کا بنا رکھا ہے
اس نے بھی سنگ ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے
کانٹوں سے بھلا وہ پیار کیا کرتا ہوگا
جس نے ہر موڑ پر پھولوں کو خفا رکھا ہے

عمادحسین......کراچی

اپنی بربادی کا ہم خود ہی سبب ہیں یارو
اب کس کو بتائیں کس کوسنا کے رونا
جاتے ہوئے وہ ہاتھ بھی تو ملا کر نہیں گیا
میں نے چاہا تھا جسے سینے سے لگا کے رونا

نوشین وسیم......گوجرانوالہ

ہجر کی ماری آنکھوں کا ہر باب علیحدہ رکھنا
سورج' چاند الگ رکھنا اور خواب علیحدہ رکھنا

امبرین علی شوکت......میرپورآزادکشمیر

تیری بانہوں کے جھولے میں پلی بابل
چھوڑ کے جارہی ہوں تیری گلی بابل
یہ عیش و آرام یاد آئیں گے
جنہیں چاہ کر بھی ہم بھلا نہ پائیں گے

شاہد خان......لاہور

جس شخص کی قربت میں قرار بہت تھا
اس شخص سے ملنا دشوار بہت تھا
جو شخص ہاتھوں کی لکیروں میں نہ تھا
اس شخص سے ہمیں پیار بہت تھا

حنافرحان......کراچی

میرے ماتھے پہ تیرا پیار دمکتا ہے ابھی
میری سانسوں میں تیرا لمس مہکتا ہے ابھی
میرے سینے میں تیرا نام دھڑکتا ہے ابھی
زیست کھونے کو میرے پاس بہت کچھ ہے ابھی

سمیرا......کراچی

مٹی میری قبر سے چرا رہا ہے کوئی
مر کر بھی یاد آرہا ہے کوئی
اے خدا اک پل زندگی دے دے مجھے
اداس میری قبر سے جارہا ہے کوئی

دلدار حسین......فیصل آباد

پیاس بخشی ہے تو ابر بھی کھل کر دینا
ابر مانگے میری دھرتی تو سمندر دینا!
اپنی اوقات سے بڑھنا مجھے گم کردے گا
مجھ کو سایہ بھی میرے قد کے برابر دینا!



خوشبوئے سخن

عمراسرار

غزل

جو بھی ہم چھوٹے بڑے ہیں دوستو
خواب غفلت میں پڑے ہیں دوستو
ہے سوا نیزے پر سورج آج کل
دھوپ میں سارے کھڑے ہیں دوستو
در حقیقت زندہ رہنے کے یہاں
مرحلے سارے کڑے ہیں دوستو
دور منزل راستہ دشوار ہے
پاؤں میں چھالے پڑے ہیں دوستو
آنے والا ہے بہاروں کا چلن
زرد پتے اب جھڑے ہیں دوستو
دوستوں کو ہم نے مارا ہے قمر
دشمنوں سے کب لڑے ہیں دوستو

ریاض حسین قمر......منگلا ڈیم

کوئی تو ہوا ایسا

کوئی تو ہوا ایسا جو صرف میرا ہو
باتوں میں اس کی خوش بو ہو
دل میں اس کا بسیرا ہو
چاہے تو چاہت میری
مانگے تو محبت میری
وہ چاند کی چاندنی ہو
تو چاند صرف میرا ہو
وہ دن کی روشنی ہو
تو سورج صرف میرا ہو
وہ پھولوں کی خوش بو ہو
تو احساس صرف میرا ہو
وہ رات کا اجالا ہو
تو چراغ صرف میرا ہو
وہ عشق اور محبت ہو
تو دل صرف میرا ہو
وہ پانی کا چھینٹا ہو
تو دریا صرف میرا ہو
وہ قسمت کی لکیر ہو
تو ہاتھ صرف میرا ہو

مجاہد ناز عباسی......سنجر پور

غزل

نہیں ہے زور دل پر میرا اب
جانے گا حالت میری وہ آخر کب
روتا رہا رات بھر اس کی یاد میں
ہوگا اس پہ راز دل افشا آخر کب
دیکھا ہے میں نے بھی دیوانوں کو
وہ سمجھے گا میری دیوانگی کو آخر کب
زندگی کٹ رہی ہے یاد یار میں
دل سے میرا وہ ہوگا آخر کب
بیٹھا رہا وہ ساتھ رقیبوں کے
اثر ہوگا میری فریاد کا اس پر آخر کب
اس بے وفا سے اک الفت سی ہے فہد
ورنہ خود کو کسی نے دکھ دینے کا سوچا آخر کب

محمد فہد......مظفرگڑھ

ہنسی ہنسی میں

یونہی ہنسی میں
ہم دلوں سے کھیل لیتے ہیں
کبھی چبھتا ہوا جملہ
کوئی چھوٹی سی بات
بظاہر بے ضرر مگر ذومعنی سی
کبھی تلخ سا لہجہ

www.paksociety.com

www.Paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

دل پر گھاؤ لگاتا ہے
تلافی کا کوئی مرہم
مداوا بن نہیں سکتا
قطرہ قطرہ خون
ہمیشہ رستا رہتا ہے
ٹپکتا رہتا ہے
وہ آنسو
جو آنکھ سے نہیں گرتے
کہیں اندر جم سے جاتے ہیں
جیسے شبنم کہر آلود شاموں میں جم جاتی ہے
برف کو تو سورج کی کرنیں پگھلا دیتی ہیں
لیکن آنسو کا وہ قطرہ
جب بھی جمنے کے لیے نکلتا ہے
اکثر پھیل جاتا ہے
شاید اسی لیے
ہنسی ہنسی میں
ہم تم
دلوں سے کھیل لیتے ہیں

طاہرہ جبیں تارا.....لاہور

غزل

تُو جو آئے تو بات بنتی ہے
ورنہ عمروں کا رائیگاں ہونا
میری سوچیں جلا کے رکھ دے گا
تیری یادوں کا سائباں ہونا
ایک محبت ہے بد گماں ہونا
ایک حقیقت سے داستاں ہونا
آنکھ کشتی ہے وقت پانی ہے
دل پہ لکھا ہے بادباں ہونا
تُو جو آئے گا تو بات بنتی ہے
ورنہ عمروں کا رائیگاں ہونا
ایک تکلم ہے بے زباں ہونا
ایک دوری ہے رازداں ہونا
واجد ہوتی ہیں ایسی باتیں بھی
جن کا ممکن نہیں بیاں ہونا

ڈاکٹر واجد نگینوی.....ملیر کراچی

احساس

برسات کی بوندوں سے
بھیگ رہی ہوں
سمندر کی گیلی ریت پر
ننگے پاؤں
چل رہی ہوں
چلتے چلتے
نکل آئی ہوں بہت دور
اتنی دور کہ
واپسی دشوار ہے
سرد ہواؤں کی ٹھنڈک
رگِ جاں میں اتر کر
مجھے میرے ہونے کا
احساس دلاتی ہے

ماہ نور.....لانڈھی کراچی

غزل

بول اے سکوتِ دل کہ درِ بے نشاں کھلے
مجھ پر کبھی تو عقدۂ ہفت آسماں کھلے
یوں دل سے ہمکلام ہوئی یادِ رفتگاں
جیسے اک اجنبی سے کوئی رازداں کھلے
سہمی کھڑی ہیں خوفِ تلاطم سے کشتیاں
موجِ ہوا کو ضد کہ کوئی بادباں کھلے
وہ آنکھ نیم وا ہو تو دل پھر سے جی اٹھیں
وہ لب ہیں تو قفلِ سکوتِ جہاں کھلے
وہ جبر ہے کہ سوچ بھی لگتی ہے اجنبی

ایسے میں کس سے بات کریں کیا زباں کھلے؟
جتنا ہوا سے بند قبا کھل گیا تیرا
ہم لوگ اس قدر بھی کسی سے کہاں کھلے؟
محسن کی موت اتنا بڑا سانحہ نہ تھی
اس سانحے پر بال تیرے رائیگاں کھلے

محمد عثمان علی.....میاں چنوں

غزل

جب سے تُو گیا ہے
میرا حال عجب ہوا ہے
خزاں کی رت ایسی آئی
درخت کا ہر پتا گرا ہے
کس طرح بچے گا وہ
اکیلا دشمنوں میں گھرا ہے
بہت شوق تھا شہر دیکھنے کا
فصیلِ شہر پر تنہا کھڑا ہے
کہاں سائے میں کوئی بیٹھے
جنگل کا ہر درخت کٹا ہے
غریب باپ کھانے کو نہ لا سکا
بچہ تھک کر پھر سو گیا ہے

وسیم اختر.....راولپنڈی

غزل

دکھ تو یہی ہے اس سے کنارا نہیں ہوا
جو شخص لمحہ بھر بھی ہمارا نہیں ہوا
میں کیا کسی کے ساتھ چلوں گا تمام عمر
میرا تو اپنے ساتھ گزارا نہیں ہوا
جس شخص کے لیے مجھے ٹھکرا گئے ہو تم
میں نے سنا ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہوا
تم کیا سمیٹ سکتے ہو رنج والم میرے
تم سے تو ایک درد کا چارا نہیں ہوا
خوابوں کے ٹوٹنے سے بدن ٹوٹنے تلک
وہ دکھ بتا جو ہم نے سہارا نہیں ہوا
کیسے مقامِ عشق پر پہنچے ہوئے ہیں ہم
ہارے ہیں جان اور خسارا نہیں ہوا
احباب دے رہے ہیں نئے عشق کی خبر
اپنا تو ایک شخص بھی سارا نہیں ہوا
میثم تمام عمر یہی دکھ رہا مجھے
میں کیوں کسی کو جان سے پیارا نہیں ہوا

میثم علی آغا

نظم

انسان پابندِ سلاسل ہو
پھر بھی
سوچیں آگہی کے نئے در
کھولتی ہیں
کبھی
زہر پیالہ پلاتی ہیں
کبھی
مغلوب کرتی ہیں
کہ
سوچیں سقراط ہوتی ہیں
سوچیں منصور ہوتی ہیں

ریحانہ سعیدہ.....لاہور

غزل

بس گیا میری آنکھ میں وہ خواب کی طرح
گزر رہی ہے ہر شب میری عذاب کی طرح
میرے سامنے سے وہ پھر ایسے گزرے آج
میں لفظ در لفظ پڑھوں اسے کتاب کی طرح
میں کیسے اسے اپنے دل سے پھر بھلا دوں
میری چاہت کو گھیرے ہے وہ گرداب کی طرح
لمحہ در لمحہ اس کے احساس کی خوش بو مہکے
برس جائے وہ میرے جیون پر سحاب کی طرح

www.paksociety.com

میں راہ وفا کے اس مقام پر ہوں جاوید
کانٹے بھی گلے ملتے ہیں گلاب کی طرح
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل

ہمیں تو کوئی گلہ نہیں ہے
پر تو نے اچھا کیا نہیں ہے
یہ چاہتوں کا صلہ نہیں ہے
جو چاہا میں نے ملا نہیں ہے
ملے تو یوں بے شمار ہم سے
تم سا لیکن ملا نہیں ہے
ہزار غم سے پڑا ہے پالا
غم زمانہ نیا نہیں ہے
نیا ہے وہ جو پہلی بار دیکھا ہے
جہاں میں کچھ بھی نیا نہیں ہے

محمد عبداللہ عاطر......منگلا کینٹ

نظم

میری زندگی میری دوستی
میری خاموشی
میری بے بسی
میرا علم بھی
صابر نام بھی
میری صبح بھی میری شام بھی
کہ جو بھی مل سکے میرے دام بھی
وہ سبھی کچھ تجھے عطا کرے
او میرے چارہ گر
تو یقین کر
فقیر کو مانگنا تو نہ آسکا
فقیر نے پھر بھی مانگی
یہی دعا
فقیر نے جب بھی اس سے طلب کیا
نہیں مانگا کچھ بھی
پیارے تیرے سوا
صرف تیرے سوا

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ......پرانا خانیوال

غزل

جب کبھی دشمن نگاہیں مجھ کو دکھلانے لگے
ہم کو بے اختیار سارے دوست یاد آنے لگے
ایسا لگتا ہے تصور میں ہے اب تصویر یار
آئینے میں خود کو دیکھا اور شرمانے لگے
وقت مشکل ہو تو کوئی ساتھ یاں دیتا نہیں
دشمنوں کو چھوڑیے اب دوست کترانے لگے
سر زمین پاک پر دشمن مسلط ہوگئے
جل اٹھا سارا چمن اور پھول مرجھانے لگے
جا چکے ہو دل سے تم پھر خواب میں آتے ہو کیوں
زخم سارے روح کے اب مجھ کو سمجھانے لگے
وہ ہوئے کچھ بدگماں ایسے کہ دل کہنے لگا
بے خبر دنیا سے تھے اب ہوش میں آنے لگے
ذکر ان کا چھیڑ کر یاروں نے بسمل کر دیا
ٹیس بھی اٹھنے لگی آنسو بھی اب آنے لگے
عشق کے دعوے بہت کرتے تھے یاران چمن
دیکھ کر حالت غزل کی وہ بھی پچھتانے لگے

سلمیٰ غزل

ذوق آگہی

عفان احمد

اصحاب کہف

”کیا تم سمجھتے ہو کہ غار اور کتبے والے ہماری کوئی بڑی عجیب نشانیوں میں سے تھے؟ جب چند نوجوان غار میں پناہ گزیں ہوئے اور انہوں نے کہا ”اے پروردگار، ہم کو اپنی رحمت خاص سے نواز اور ہمارا معاملہ درست کردے۔“ تو ہم نے انہیں اسی غار میں تھپک کر سالہا سال کے لیے گہری نیند سلا دیا، پھر ہم نے انہیں اٹھایا تا کہ دیکھیں اُن کے دو گروہوں میں سے کون اپنی مدت قیام کا ٹھیک شمار کرتا ہے۔
(سورۂ کہف: آیات: ۱۱۔۱۲)

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت کے دن اہل دوزخ میں سے ایک شخص سے کہا جائے گا ”زمین میں جو کچھ ہے اگر وہ تیرا ہو جائے تو کیا تو اس سب کو دوزخ کی سزاؤں کے بدلے دے دے گا؟“ وہ کہے گا، ہاں۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا ”میں نے تجھ سے اس کی نسبت بہت کم چاہا تھا، میں نے تجھ سے اُس وقت وعدہ لیا تھا جب کہ تو اپنے باپ حضرت آدم کی پیٹھ میں تھا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا لیکن تو نے پھر بھی شرک کا ارتکاب کیا۔“

فاطمہ ظہیر......کراچی

انبیاء کرام کے مقبرے

حضرت محمد ﷺ......مدینہ منورہ سعودی عرب
حضرت آدم علیہ السلام......سری لنکا
حضرت نوح علیہ السلام......جورڈن
حضرت داؤد علیہ السلام......یمن
حضرت صالح علیہ السلام......لبنان
حضرت لوط علیہ السلام......عراق
حضرت ابراہیم علیہ السلام......اسرائیل
حضرت اسماعیل علیہ السلام......اُر
حضرت اسحاق علیہ السلام......فلسطین
حضرت یعقوب علیہ السلام......فلسطین
حضرت یوسف علیہ السلام......فلسطین
حضرت ایوب علیہ السلام......اومان
حضرت صہیب علیہ السلام......سائبیریا

محمد عثمان علی......میاں چنوں

قناعت

قناعت یہ نہیں کہ تم کم خوری کرو اور اپنے حق کو غصب ہوتے دیکھ کر چپ کی چادر اوڑھ لو قناعت یہ بھی ہے کہ اپنے حق کو حاصل کرو اور اس کے دروازے دوسرے پر کھول دو۔ قناعت نیکی کا زینہ ہے جہاں سے گزر کر نیک روحیں اس سکون کو حاصل کرلیں جسے خداوند کریم اپنے لوگوں کے لیے مخصوص کرتا ہے۔

قناعت صبر کی کنجی بھی ہے۔ قناعت پسند شخص جب صحراؤں میں چلتے ہوئے جھگڑوں سے الجھتا ہے تو ایک سیسہ پلائی دیوار بن کر طوفان کا رخ موڑ دیتا ہے۔

قناعت حرص و آز کے جال میں الجھنے سے بچالیتی ہے کہ حرص و آز دوزخ کا ساتھی اور نیک روحوں کو شیطان کے روپ میں بھٹکانے میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف رہتا ہے جبکہ نیک روحیں اس کے جال میں نہیں آتیں کیونکہ قناعت اس کے تاروں کو مسلسل کاٹتی رہتی ہے۔
(خلیل جبران کی کتاب جبرانیات سے اقتباس)

www.paksociety.com

رياض بٹ...... حسن ابدال

صلہ رحمی کے فوائد

صلہ رحمی سے محبت بڑھتی ہے' مال بڑھتا ہے' عمر بڑھتی ہے' رزق میں کشادگی ہوتی ہے' آدمی بری موت نہیں مرتا' ملک کی آبادی اور سرسبزی بڑھتی ہے' نیکیاں قبول کی جاتی ہیں' جنت میں جانے کا استحقاق حاصل ہوتا ہے' صلہ رحمی کرنے والے سے اللہ اپنا رشتہ جوڑتا ہے' صلہ رحمی کرنے والے پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

ماں کی وصیت

عرب کی ایک مشہور عالم ادیبہ نے اپنی بیٹی کی رخصتی پر اس کو دس وصیتیں کی تھیں کسی بھی زمانے میں اگر ہر بیوی ان دس وصیتوں پر عمل کرے تو اس کا گھر جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

ا:۔ میری پیاری بیٹی شوہر کے گھر جا کر قناعت والی زندگی بسر کرنا' جو دال روٹی ملے اس پر راضی رہنا جو روکھی سوکھی شوہر کے ساتھ مل جائے وہ مرغ پلاؤ سے بہتر ہے۔

۲:۔ اس بات کا خاص رکھنا کہ اپنے شوہر کو ہمیشہ توجہ سے سننا اور ہر حال میں ان باتوں پر عمل کرنا۔ اس طرح تم ان کے دل میں جگہ بنالو گی۔

۳:۔ اپنی زینت و جمال کا ایسا خیال رکھنا ہے کہ جب وہ تجھے نگاہ بھر کے دیکھے تو اپنے انتخاب پر خوش ہو۔

۴:۔ اپنے شوہر کی نگاہ میں پرکشش معلوم ہونے کے لیے خوش بو کا اہتمام ضرور کرنا اور اپنی آنکھوں کو سرمے اور کاجل سے آراستہ کرنا۔

۵:۔ شوہر کا کھانا وقت سے پہلے اہتمام سے تیار رکھنا کیونکہ دیر تک برداشت کی جاتے والی بھوک بھڑکتے ہوئے شعلے کی مانند ہوتی ہے۔

۶:۔ ان کے گھر اور ان کے مال کی نگرانی کرنا کیونکہ مال کی بہتر نگہداشت حسن انتظام سے ہوتی ہے اور اہل و عیال کی بہتر حفاظت حسن تدبیر ہے۔

۷:۔ ہمیشہ ان کی راز دار رہنا نافرمانی ہرگز نہ کرنا اور اگر تم ان کا راز اوروں سے نہ چھپا سکیں تو اس کا تم پر سے اعتماد ہٹ جائے گا اور پھر تم بھی اس کے دورخ پن سے محفوظ نہیں رہ سکو گی

۸:۔ جب وہ کسی بات پر غمگین ہو تو اپنی کسی خوشی کا اظہار ان کے سامنے نہ کرنا یعنی ان کے غم میں برابر کی شریک رہنا۔

۹:۔ اگر تم ان کی نگاہوں میں قابل تکریم بننا چاہتی ہو تو اس کی عزت و احترام کا خوب خیال رکھنا اور اس کی مرضی کے مطابق چلنا پھر تو تم اس کو بھی ہمیشہ اپنی زندگی کے ہر ہر مرحلے میں اپنا بہترین رفیق پاؤ گی۔

۱۰:۔ میری پیاری بیٹی میری اس نصیحت کو پلو سے باندھ لو اور اس پر گرہ لگالو کہ جب تک تم ان کی خوشی اور مرضی کی خاطر کئی بار اپنا دل نہیں مارو گی اور ان کی بات اوپر رکھنے کے لیے خواہ تمہیں پسند ہو یا ناپسند زندگی کے کئی مرحلوں میں اپنے دل میں اٹھنے والی خواہشوں کو دفن نہیں کرو گی۔ اس وقت تک تمہاری زندگی میں بھی خوش بو کے پھول نہیں کھلیں گے۔

پیاری قارئین بہنو! اگر آپ بھی ان نصیحتوں پر عمل کریں تو اپنے شوہر کی نگاہوں میں قابل تکریم بن سکتی ہیں۔

مجاہد ناز عباسی...... سنجر پور

معلومات

☆ شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالمگیر نے "فتاویٰ عالمگیری" مرتب کروائی تھی۔

☆ ہندوستان کے صوبہ بنگال میں اردو کی ترویج و اشاعت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اہم کردار رہا ہے۔

☆ اردو زبان کے قدیم اور عظیم شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کے والد کا نام عبداللہ بیگ تھا۔

☆ آزادی ہند کی تحریک کے رہنما مولانا حسرت موہانی نے مشہور اساتذہ قدیم کے دیوان فراہم کر کے ان کا انتخاب شائع کیا تھا۔

☆ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی اور قوم کے معمار سرسید احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی میں پیدا ہوئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء میں فوت ہوئے۔

☆ سرسید احمد خان کے استاد کا نام حمید الدین ہے۔

☆ ۱۹۰۸ء میں شاعر مشرق علامہ اقبال کو جرمنی کی میونخ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی تھی۔

☆ ایران کے فارسی زبان کے شاعر فردوسی نے "شاہ نامہ" کتاب لکھی تھی۔

☆ برصغیر کے مشہور شاعر حفیظ جالندھری نے "شاہنامہ اسلام" لکھی ہے۔

☆ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے "غنیتہ الطالبین" کتاب لکھی تھی۔

☆ مشہور تاریخی مصنف خواجہ حسن نظامی کا لقب "مصور غم" ہے۔

☆ ریاست حیدرآباد دکن کے نواب بہادر یار جنگ کا خطاب "لسان الامت" ہے۔

پروفیسر واجد نگینوی...... ملیر' کراچی

ہنسنا منع ہے

ایک بچہ روتا ہوا اپنی امی کے پاس آیا۔

امی نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ "ابو دیوار پر کیل ٹھونک رہے تھے تو ہتھوڑی ان کے انگوٹھے پر لگ گئی۔"

ماں نے کہا "اچھے بچے روتے نہیں تمہیں تو ہنسنا چاہیے تھا۔"

بچہ نے کہا۔ "میں ہنسا ہی تھا۔"

عبدالرحمٰن...... کراچی

دو سہیلیاں بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

پہلی بولی۔ "کاش میں وقت ہوتی۔"

دوسری۔ "وہ کیوں۔"

پہلی۔ "دیکھو ہر کوئی وقت کی کتنی قدر کرتا ہے' ہر انسان وقت کا غلام ہے۔"

پہلی بولی۔ "اگر تم وقت ہوتیں تو لوگ تمہیں دیکھ کر اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے۔"

دوسری۔ "وہ کیوں۔"

پہلی۔ "لوگ کہتے وہ دیکھو کتنا برا وقت آ رہا ہے۔"

محمد اکرم...... سرگودھا

بیوی نے شوہر کو فون کیا۔ "کہاں ہیں آپ؟"

شوہر۔ "تمہیں وہ جیولری کی دکان یاد ہے جہاں تم نے ڈائمنڈ کا سیٹ پسند کیا تھا۔"

بیوی خوش ہوتے ہوئے۔ "ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔"

شوہر۔ "میں اس کے برابر والی نائی کی دکان پر بال کٹوا رہا ہوں۔"

مسز شہزاد...... کراچی

دو جڑواں بچے بیٹھے تھے جن میں سے ایک رو رہا تھا اور ایک ہنس رہا تھا۔

ابو نے وجہ پوچھی تو ہنسنے والا بچہ بولا۔

"آج پھر امی نے دونوں بار ہی بھائی کو نہلا دیا۔"

مبارک علی...... چیچہ وطنی

⌘

اُمیدِ سحر

محمد یعقوب بھٹی

محبت اک الوہی جذبہ ہے۔ اس کا تعلق ربّ کی ذات و صفات سے ہے یہی جذبہ تخلیق آدم کا سبب بنا۔ یہ محبت ہی تھی جس کی شدت نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہ السلام کو معافی دلائی۔ یہ محبت ہی ہے جس نے ابلیس لعین کو متکبر بنایا اور اسے سجدۂ آدم سے روکا۔ یہ رب کی اپنے بندوں سے محبت ہی ہے جس کے تحت خالق کون و مکان نے انبیا کو دنیا میں ہادی و رہنما بنا کر بھیجا کہ اس کے محب راہ سے نہ بھٹکیں اس کی راہ پر چلتے ہوئے بہشت کا سفر کریں۔
اس محبت کے کئی رنگ و روپ ہیں۔ الجبرا کا حساب بھی ہے اور فزکس کا کلیہ بھی جغرافیہ کا سوال بھی ہے اور معاشیات کے اصول بھی۔ نگاہ اور سوچ کے زاویے درست ہوں تو بندہ جاگتی آنکھوں سے اپنے خالق کا مشاہدہ کرلیتا ہے۔ اندازہ اوز سوچ میں ذرا سی غلطی ہوجائے تو ولی کامل بھی جانے ان جانے میں شیطان کا پیرو بن جاتا ہے۔
وطن کی محبت سے سرشار ان لوگوں کا فسانہ' جن کے ہاتھوں میں آہنی ہتھیار تھے لیکن دل پیار کی لے پر جھوم رہے تھے۔

عشق وفرض کی راہ پر محوسفر دیوانوں کا احوال

غزالہ نقش کو بے حد پسند کرنے لگی تھیں مگر یہ سوچ کران کا دل دہل جاتا تھا کہ وہ بیچاری محض ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ بہرحال امید پر دنیا قائم ہے اسی امید کو لے کرانہوں نے پہلے ماہم کو ٹٹولا انہیں ہم خیال پاکر ماہم کھل گئی۔ پھر ماہم کی کوششوں سے بری طرح شرمائی نقش بھی غزالہ کے سامنے اعتراف محبت کربیٹھی۔ غزالہ نے اس کی پیشانی چوم کراپنی بھرپور مدد کا یقین دلایا تھا۔

ساتھ ہی ان پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ شامیر لڑکیوں سے متنفر کیوں تھا۔ اس راز سے غزالہ نے ہی پردہ ہٹایا تھا۔ شامیر کے متنفر ہونے کی وجہ بظاہر عام سی تھی مگراس میں چند خاص پہلو بھی تھے۔

عام بات یہ تھی کہ وہ شروع ہی سے اپنی چچازاد روما سے اٹیچ تھا۔ روما بھی اس کی طرف مائل تھی اوران میں ساتھ زندگی گزارنے کے عہدوپیماں بھی ہوچکے تھے۔ ان دنوں شامیر بے حد ہنس مکھ شرارتی' فقرے باز اور کھلنڈرا ہوتا تھا۔

غزالہ محسوس کرتی تھیں کہ وہ دل وجان کی گہرائیوں سے روما کو پسند کرتا ہے۔ دوسری طرف نوجوانی کی جذباتیت میں روما اس کی طرف ملتفت تو ہوگئی تھی مگر شاید اس کے جذبوں میں شامیر جتنی گہرائی اور مضبوطی نہیں تھی۔ انہی دنوں روما کی بڑی خالہ جو عرصے سے انگلینڈ میں تھیں۔ ان کا بیٹا دانش پاکستان آیا ہوا تھا۔

غزالہ نے دانش کو دیکھا تھا' وہ گورا چٹا بے حد خوبرو تھا۔ انگلینڈ کے ماحول اورآزادی نے اسے بے حد پراعتماد کردیا تھا۔ مدمقابل کو وہ چٹکیوں میں اڑادیتا تھا۔ لڑکیوں کو تو وہ لمحوں میں گرویدہ بنالیتا تھا۔

معلوم نہیں پہل کس جانب سے ہوئی تھی مگر روما کے خوابوں پر اچانک ہی دانش کا قبضہ ہوگیا تھا۔ دانش بھی اس میں بھرپور دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے روما کو انگلینڈ کی آزاد فضاؤں اور وہاں کے تعلیمی اداروں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ روما ایم' بی' اے انگلینڈ سے کرنے پر نہ صرف رضامند ہوگئی بلکہ اس نے مخالفت کی کمزور آوازوں کو بھی اپنے جارحانہ رویے سے دبادیا تھا۔

روما کی ماں بیٹی کے ساتھ تھیں اور دانش کی روما میں دلچسپی سے خوش اور مطمئن بھی۔ دونوں بہنیں بالا ہی بالا ''فیصلے'' بھی کرچکی تھیں۔

ان دنوں روما' شامیر کو مکمل طور سے نظر انداز کررہی تھی۔ جس کے سبب شامیر کا حال بن پانی کی مچھلی جیسا تھا۔ آنے والے وقت کی آہٹ اس نے سن لی تھی۔ اس نے روما سے علیحدہ ملنے کی بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ روما' دانش کو کراچی اور گردونواح کی سیر کرانے میں مشغول تھی۔

شامیر اپنے باپ سے بے حد قریب تھا۔ شامیر کی والدہ کے فوت ہونے پر انہوں نے شامیر کو ماں بن کر پالا تھا۔ اس وقت شامیر محض چار سال کا تھا۔ سمیر البتہ سمجھدار ہوچکا تھا۔

نصیر صاحب کو شامیر سے بے حد محبت تھی۔ وہ ہر پل اسے اپنے سائے میں رکھتے تھے۔ شامیر اسکول داخل ہوا تو ان کا سارا دن بے چینی میں گزرتا تھا۔ وہ چھٹی سے بہت پہلے ہی اسکول کے گیٹ پر پہنچ جاتے تھے۔

شامیر بھی ان پر جان چھڑکتا تھا۔ دنیا میں واحد ہستی باپ کی تھی جس کے سامنے وہ دل کا حال بیان کردیتا تھا۔ ورنہ وہ اپنے جذبات واحساسات خود تک محدود رکھتا تھا۔

نصیر صاحب' شامیر اور روما کے باہمی تعلق سے بے حد خوش تھے۔ روما کو بھی وہ دل وجان سے چاہتے تھے۔ محبت کرنے والی بیوی کی جدائی نے انہیں دل کا مریض بنا دیا تھا۔ دو ہارٹ اٹیک وہ برداشت کرچکے تھے۔

سمیر شروع ہی سے شوروم کے معاملات میں دلچسپی لیتا تھا۔ سو محض ایف' ایس' سی کے بعد ہی نصیر صاحب نے شوروم کلی طور پر اس کے سپرد کردیا تھا۔ حوری کی پیدائش کے بعد تو انہوں نے شوروم جانا بھی ترک کردیا تھا۔ ان کا سارا دن حوری کے گرد ہی گزرتا تھا۔ اس ننھی سی گڑیا کو پاکر وہ جیسے دوبارہ سے جی اٹھے تھے۔

شامیر اور روما کے معاملات میں آنے والی تبدیلی سے بھی وہ باخبر تھے اور شامیر کی بے چینیاں اور گہرا فکر واضطراب بھی ان سے چھپا نہیں تھا۔ شامیر خود انہیں سارے معاملات کی خبر دے رہا تھا۔ انہوں نے معاملات کو مزید بگڑنے سے پہلے ایک فیصلہ کن قدم اٹھانے کا سوچا اور۔ وہ بغیر چھوٹے بھائی سے مشورہ کیے ایک شام سمیر اور غزالہ کے ساتھ شامیر کے لیے روما کا رشتہ مانگنے چھوٹے بھائی کے گھر پہنچ گئے۔

غزالہ کی دبی دبی مخالفت کے باوجود انہوں نے مٹھائی کے ٹوکرے اور پھل وغیرہ بھی لے لیے تھے۔ ان کا ارادہ بات پکی کرکے آنے کا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ چھوٹا بھائی انہیں خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا۔

شامیر گھر پر ہی امید اور روما کے رویے کے سبب پیدا ہونے والی ناامیدی کے درمیان لٹکا شدت سے گھر والوں کی واپسی کا منتظر تھا۔

مٹھائی وغیرہ دیکھ کر نصیر صاحب کی بھاوج کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اس نے قدرے سردمہری سے ان کا استقبال کیا تھا۔ البتہ نصیر صاحب کے چھوٹے بھائی نے بظاہر خوشدلی دکھائی تھی مگر دل ہی دل میں وہ بھی اضطراب کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کی بیوی' دانش کا نام اس کے کانوں میں انڈیل چکی تھی اور اسے بھی دانش پسند تھا۔

نصیر صاحب نے اپنی بیماری اور زندگی میں شامیر کے سر پر سہرہ سجا دیکھنے کی خواہش کی تمہید کے ساتھ اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو بھائی اور بھاوج کے چہرے پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ بھائی نے تو رسمی طور پر مشورہ وغیرہ کے لیے وقت مانگا' بڑے بھائی کو منہ پر جواب دینے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ بھاوج کی پیشانی پر البتہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

غزالہ یہ سب دیکھ اور محسوس کر رہی تھی۔ اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ چھوٹا بھائی' بیوی اور بیٹی کے ہاتھوں مجبور ہے۔ یہ بیل انہیں منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

نصیر صاحب اپنی سادگی اور بڑے پن کے سبب اصرار کرنے لگے کہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکی' لڑکا دونوں گھر کے ہیں ابھی منہ میٹھا کرنے کی رسم ادا کر دی جائے۔

نصیر صاحب کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا جبکہ بھائی بھاوج اس کشمکش و پنج میں تھے کہ کیسے جواب دیں۔ ان دونوں کی مشکل کو روما نے آسان کر دیا تھا۔ وہ کہیں قریب ہی سب دیکھ اور سن رہی تھی۔ اس نے سامنے آتے ہوئے کہا تھا۔

''مما اور پاپا! آپ لوگوں کو مشکل پیش آ رہی ہے تو میں فیصلہ سنا دیتی ہوں۔'' اس کا انداز ولہجہ بڑا گستاخانہ تھا۔ اس کی اس جسارت پر سبھی ششدر رہ گئے تھے۔ اس نے بڑی بے باکی سے نصیر صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔

''بڑے تایا! شامیر' بطور زندگی کا ساتھی میرے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ آپ اس کے لیے کوئی اور لڑکی دیکھ لیں۔'' اس جسارت پر اس کے باپ نے اس کے منہ پر تھپڑ بھی مارا تھا مگر اسے پروا نہیں تھی۔

نصیر صاحب شاک کی سی کیفیت میں رہ گئے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کی بھتیجی' ان سے اس طرح بھی پیش آ سکتی ہے۔ یقین آیا تو بائیں بازو اور سینے میں درد کی چنگاریاں چھوٹنے لگیں۔ چھوٹے بھائی کے گھر سے وہ سیدھے ہسپتال لے جائے گئے۔ شامیر کو اطلاع ہوئی تو وہ بھی ہسپتال دوڑا گیا۔

ہسپتال میں دو دن زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد انہوں نے موت کا دامن تھام لیا۔ ان کا بے جان ہاتھ شامیر کے ہاتھ میں دبا رہ گیا تھا۔

باپ کی موت کے بعد شامیر مکمل طور سے بدل گیا ۔ وہ روما کو اپنے باپ کی موت کا ذمہ دار سمجھنے لگا تھا۔ محبت' شدید ترین نفرت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ روما پرسے کے لیے آئی تو شامیر نے اسے گھر میں ٹھیک طرح سے داخل بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ جس کے سبب چچا کی فیملی ہی واپس چلی گئی تھی اور دونوں خاندانوں کے درمیان نہ بھرنے والا خلا پیدا ہو گیا تھا۔

شامیر نے ہر وہ چیز جلا دی تھی جو روما سے وابستہ تھی۔ اس کے کمرے کا سارا فرنیچر اور سیٹنگ روما کے مشورے پر ہوئی تھی۔ شامیر نے فرنیچر توڑ ڈالا تھا اور اپنا کمرہ تہس نہس کر دیا تھا۔ بعد میں وہ اوپر کے پورشن پر شفٹ ہو گیا تھا۔ اس کا کمرہ جہاں جگہ جگہ روما کی یادوں کے نشان تھے' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا تھا۔

اگر یہ گھر نصیر صاحب نے بڑے چاؤ سے نہ بنوایا ہوتا تو شاید شامیر اسے بھی ڈھا دیتا کہ یہاں کبھی روما آتی تھی۔ پھر بھی وہ گھر سے دور رہنے لگا تھا۔

پڑھائی کے علاوہ اس نے ہر طرح کی ایکٹی وٹیز ختم کر دی تھیں۔ شمیر کو پتا چلا تھا کہ وہ زیادہ وقت ساحل سمندر پر بھٹکتا رہتا تھا۔ شامیر کی شخصیت کا خاص پہلو یہ تھا کہ وہ ضدی' شدت پسند اور مضبوط

قوت فیصلہ کا مالک تھا۔ ایک بار جو فیصلہ کر لیتا تھا' اس پر ڈٹ جاتا تھا جو شخصیت اس کے فیصلوں کو تبدیل کرنے کی طاقت رکھتی تھی وہ منوں مٹی کے نیچے جا سوئی تھی۔

پھر وہ اپنے باپ سے بھی بے پناہ پیار کرتا تھا' روما کی وجہ سے باپ اسے دائمی جدائی دے گیا تھا۔ پھر روما کی بے وفائی کی وجہ بھی تھی۔ سو وہ روما سے نفرت کرنے میں حق بجانب تھا۔ مگر یہ نفرت شدت پسندی کا روپ دھار گئی تھی۔ اس کا زندگی میں صرف ایک ہی لڑکی سے واسطہ پڑا تھا جسے اس نے دل وجان سے چاہا تھا۔ اب اسے ہر لڑکی میں روما نظر آنے لگی تھی۔ وہ صنف نازک سے مکمل طور پر متنفر ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ بے حد محبت کرنے والی بھابی سے بھی وہ کھنچا کھنچا رہنے لگا۔

اس کی محبت برقرار تھی تو صرف حوری سے..... بلکہ اس میں کچھ زیادہ شدت آ گئی تھی۔ شاید ایک یہ وجہ بھی تھی کہ اس کا باپ بھی حوری پر جان چھڑکتا تھا۔

بھابی اور بھائی کی اسے زندگی کی طرف واپس لانے کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہوئی تھی پھر اچانک ہی اس نے آرمی جوائن کر لی۔ وہ بھی شاید ایک بھرپور مردانہ ماحول کے خیال سے' مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ دوران تربیت اچانک اسے انٹیلی جنس ونگ کے لیے منتخب کر لیا جائے گا اور آرمی میں ہونے کے باوجود اس کا واسطہ لڑکیوں سے پڑ جائے گا۔

......☆☆☆......

ساری تفصیل جاننے کے بعد نقش کی محبت میں ہمدردی کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ اس نے غزالہ کے سامنے پورے یقین کے ساتھ عہد کیا کہ وہ شامیر کو ''بدل'' کر دکھائے گی۔ شامیر کو یقین کرنا پڑے گا کہ ہر لڑکی ''روما'' نہیں ہوتی۔

اس نے غزالہ سے بھی وعدہ لیا کہ وہ شامیر کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی۔ ہو سکتا تھا کسی ویک اینڈ پر شامیر پوچھ ہی لے کہ یہ 'لمبے بالوں والی آنی' کون ہے؟

مگر غزالہ کو یقین تھا کہ وہ نہیں پوچھے گا۔ بہرحال انہوں نے وعدہ کر لیا تھا۔

نقش ذہن میں ایک واضح خاکہ بنا چکی تھی۔ اس نے پہلے بڑی مشکل سے ماں کو راضی کیا پھر رات کو جنرل صاحب کی اسٹڈی میں جا دھمکی۔

''بابا' میں آرمی جوائن کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے دھماکہ کیا۔

آہنی اعصاب کے جنرل صاحب بالکل نہیں چونکے۔ انہوں نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے بغور اس کی طرف دیکھا۔ وہ' ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ انہوں نے پور پور اسے بڑھتے دیکھا تھا۔ اس کا ذہن ان کے لیے ایک کھلی کتاب کی مانند تھا۔ مگر..... آج پہلی دفعہ انہیں یہ کتاب پڑھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ مگر انہوں نے کسی بے اطمینانی کا اظہار نہیں کیا اور نقش کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پہلے چشمہ اتارا اور پھر حال ہی میں ریٹائرڈ ہونے والے ایک چینی جنرل کی لکھی کتاب بند کر دی۔

نقش دونوں مٹھیاں دبائے اپنے اضطراب پر قابو پانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

جنرل صاحب نے دھیمے انداز میں کہا۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے بیٹا! مگر اس کا کوئی پس منظر بھی تو ہو گا۔ تمہاری دلچسپی کا محور تو کمپیوٹر سائنس رہا ہے۔ ہمارا ''چاند'' یکلخت محور سے کیسے ہٹ گیا؟'' نقش کی کیفیت ان سے چھپی نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے شگفتہ انداز اپنایا تھا۔

نقش دھیرے سے مسکرائی۔ باپ سے اس کا دوستی کا مضبوط رشتہ بھی تھا۔ اس کے باوجود ایک جھجک تھی۔ اس کے چہرے پر کشمکش کے آثار دیکھ کر جنرل صاحب نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے کہا۔

"بیٹا! ہم بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ آج پہلی دفعہ میں تمہیں ہچکچاتے دیکھ رہا ہوں۔ یار! کچھ دیر کے لیے مجھے 'مونی' ہی سمجھ لو...... تم اس سے زیادہ بے تکلف ہو۔"

"اوہ ...... بابا" اس نے لاڈ سے کہا۔ "میں دراصل ایک بندے کے خیالات "درست" کرنا چاہتی ہوں۔" بند میں پہلی دراڑ پڑنے کے بعد پانی روانی سے بہنے لگا۔ "ایک لڑکی کی بے وفائی نے اسے شدت پسند بنا دیا ہے۔ وہ ساری لڑکیوں کو شدت پسندی کی عینک لگا کر دیکھنے لگا ہے۔ میں نے اس کی بھابی سے اسے درست کرنے کا وعدہ کرلیا ہے۔"

جنرل صاحب کے لیے دوبارہ سے کتاب پڑھنا ناممکن ہوگیا تھا۔ ایک جہاندیدہ باپ کی آنکھیں پڑھ رہی تھیں کہ ان کی بیٹی کسی کی طرف متوجہ ہوچکی ہے۔ محبت کا بیج ہمدردی کی زمین پر تو زیادہ تیزی سے پہلے پھوٹتا ہے تو پھر پودا بن کر تناور درخت بن جاتا ہے۔

انہوں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "مجھے زیادہ خوشی ہوتی اگر میں یہ سنتا کہ تم آرمی جوائن کر کے ملک و قوم کی خدمت اور وطن کے دشمنوں کے دانت کھٹے کرنا چاہتی ہو۔"

نقش پر گھڑوں پانی پڑگیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور شاکی لہجے میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے بابا! آپ نے اپنے خون پر شک کیا۔ وطن کی خاطر جان لینا اور دینا تو ہمارے خون میں شامل ہے۔ 1965ء کی جنگ میں سینے پر گولیوں کے داغ اور تمغہ شجاعت پانے والے میجر حسن لودھی میرے دادا تھے اور اسی دادا نے 1948ء میں جنگ آزادی کشمیر کے دوران ایک لاوارث کشمیری لڑکی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنایا تھا تو کیا وہ کشمیر میری دادی کی خاطر لڑنے گئے تھے۔"

نقش کی آواز جذبات کے سبب لرزنے لگی تھی اور آنکھوں سے آتشیں سیال بہہ نکلا تھا اور جنرل صاحب کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

نقش اسی انداز میں کہے جارہی تھی۔ "کیا آپ کے بازو پر کارگل محاذ کا دیا زخم کا نشان اور میرے دادا کی شہادت یہ بتانے کے لیے کافی نہیں کہ ملک وقوم کی خدمت اور دفاع ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم ہے اور ہمیں اس کے لیے کسی زبانی اظہار کی ضرورت نہیں۔ باقی سب باتیں ثانوی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جنرل صاحب نے اٹھ کر کرسی پر بیٹھی نقش کو عقب سے بانہوں کے گھیرے میں لے لیا اور اس کا سر چومنے کے بعد اس کے سر پر ٹھوڑی جمادی۔

"مجھے معاف کردو بیٹی!" انہوں نے کسی قدر بھیگی آواز میں کہا۔ "مجھے آج اپنی بیٹی کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ حب الوطنی ہمارے خون میں شامل ہے اور زبان سے اس کے اظہار کی قطعی ضرورت نہیں۔ اپنی بیٹی کا دل دکھانے کے سبب میں ایک دفعہ پھر معافی مانگتا ہوں۔"

"اور شرمندہ نہ کریں بابا!" اس نے آنسوؤں کے درمیان حقیقی شرمندگی سے کہا اور پھر بڑے والہانہ انداز میں باپ کے بازو سے اپنا چہرہ رگڑنے لگی۔

جنرل صاحب نے گھومنے والی کرسی گھما کر نقش کا رخ اپنی طرف کیا اور اس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے یہ بھی آج ہی پتا چلا ہے کہ ہماری بیٹی

اب بڑی ہوگئی ہے۔" نقش نے اٹھ کر ان کے سینے میں منہ چھپانے ہی میں عافیت سمجھی۔

"کون ہے وہ؟" جنرل صاحب نے اس کے کان کے نزدیک معنی خیز انداز میں پوچھا۔

نقش نے آہستہ سے باپ کے چوڑے سینے پر مکا مارا۔ "جو آپ سمجھ رہے ہیں ویسا کچھ نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ جھینپ گئی تھی۔

"بھئی میں کب کہہ رہا ہوں کہ ایسا کچھ ہے۔" وہ شرارت سے ہنسے تھے۔

بعد میں نقش نے انہیں شامیر کے متعلق بتایا۔

پندرہ دن بعد ایک اور سٹنگ میں جنرل صاحب نے اسے بتایا کہ شامیر کاکول اکیڈمی کے جس حصے میں زیر تربیت ہے۔ وہاں لڑکیوں کا گزر بھی نہیں ہوسکتا۔ میڈیکل کے بعد ایک ہی شعبہ ایسا تھا جہاں خواتین اچھی خاصی تعداد میں تھیں اور وہ تھا انٹیلی جنس۔

جنرل صاحب نے پس پردہ رہ کر ڈوریاں ہلائی تھیں۔ شامیر کو انٹیلی جنس ونگ کی خصوصی تربیت کے لیے "منتخب" کرلیا گیا تھا۔

جنرل صاحب نے نقش کے ڈاکومنٹس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ "تم جب چاہو آرمی اور شامیر کو جوائن کرسکتی ہو۔"

نقش شرما کر رہ گئی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کا باپ اس کے دل کی "واردات" سے آگاہ ہوگیا ہے۔

❁ ...... ❁ ❁

اپنے خیمے میں شامیر بھی بے چین ہو رہا تھا۔ نقش کی سنائی غزل نے اس کے زخموں کو تازہ کردیا تا۔ یہ غزل اس کی فیورٹ تھی۔ روما کو فاسٹ میوزک پسند تھا۔ وہ اس غزل سے بہت چڑتی تھی۔

ایک دفعہ لانگ ڈرائیو کے دوران اس نے سی ڈی پلیئر سے اس غزل والی سی ڈی ہی نکال کر توڑ دی تھی۔

alislampk.com

ملک کا منفرد دینی و اصلاحی رسالہ



تازہ شمارہ شائع ہوگیا ھے

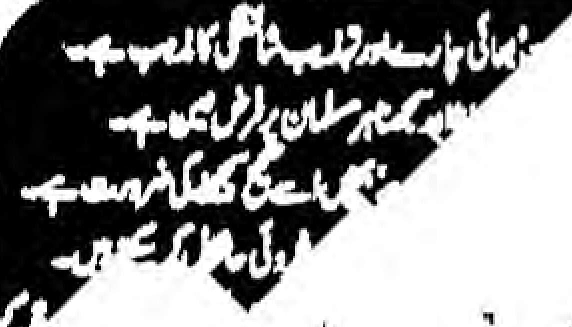
ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیرادارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوریؒ

روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

خوابوں کی تعبیر: حافظ عبدالقیوم نعمانی



دنیائے اسلام کے تمام مسالک سے متعلق علماء کرام کی نگارشات اور آراء پر مشتمل

وہ سب کچھ جو آپ جاننا اور پڑھنا چاہتے ہیں

پتہ: کمرہ نمبر 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

فون: 35260771/2 فیکس: 35260773

alislamkhi@gmail.com

شامیر کو غصہ تو بہت آیا تھا مگر محبت نے غصے کو دبا دیا تھا۔

آج بہت دنوں بعد اس نے یہ غزل سنی تھی اور شاید پہلی دفعہ نقش کو بھی نظر بھر کے دیکھا تھا۔ آگ کی قربت کے سبب اس نے دستانے اتارے ہوئے تھے۔ اس کے دودھیا کبوتروں جیسے ہاتھ اور ٹوپی سے نکلے لمبے برنش بالوں کی لٹیں رہ رہ کر اس کے دماغ میں کسی الجھن کو چھیڑ رہی تھیں۔ اسے لگتا تھا جیسے یہ ہاتھ اور بال اس نے پہلے بھی کہیں دیکھے ہیں۔ مگر یہ بات تحت الشعور سے شعور میں نہیں آرہی تھی۔

پھر اس نے خود پر چڑھائے خول کے سبب خود کو جھڑکا کہ وہ کیوں ایک لڑکی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ نقش کو ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش میں لگ گیا۔ مگر اسے ناکامی ہوئی۔ آنکھیں بند کرتے ہی نقش کی آواز اس کے دماغ میں چکرانے لگی۔ پسندیدہ غزل کا سب سے پسندیدہ شعر گونج رہا تھا۔

شب انتظار آخر کبھی ہوگی مختصر بھی
یہ چراغ بجھ رہے ہیں میرے ساتھ جلتے جلتے

اس نے غصے کے سبب اپنا سر زور سے نیچے مارا۔

شجاع بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ وہ بولا۔ ”کیوں بھائی! سنو سلائیڈنگ کو پکار رہے ہو۔ آواز کی معمولی سی دھمک پر ہی وہ چل پڑتی ہے۔“ اس نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

شامیر نے چپ رہنا ہی بہتر جانا۔ شجاع کو جواب دینے کا مطلب ایک لمبی تکرار تھا۔



اگلے دن دوپہر کے کھانے کے بعد جب سب لوگ اٹھنے لگے تو کرنل سلیم نے نقش کو روک لیا۔ یہ حکم نقش سمیت سب کے لیے حیرانی کا باعث تھا۔

تنہائی میسر آتے ہی کرنل سلیم نے توصیفی انداز میں کہا۔ ”نقش! تمہارے بنائے نقشے لاجواب ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ تم بہت آگے تک جاؤ گی۔“

نقش کو مسرت کے ساتھ ساتھ حیرانی بھی ہوئی۔ زیر تربیت کیڈٹس کی کارکردگی کی رپورٹ ایک مخصوص وقت سے پہلے ان سے مخفی رکھی جاتی تھی۔

کرنل سلیم نے اس کی حیرانی بھانپ لی۔ ”اگرچہ یہ رولز کی خلاف ورزی ہے لیکن تمہارے فادر میرے سی او رہے ہیں اور تم ایک بہادر خاندان سے ہو۔ سپاہیوں کا مورال یہ دیکھ کر بڑھا ہوا ہے کہ ایک جنرل کی بیٹی بھی ان کے ساتھ اس ”ہارڈ ایریا“ میں موجود ہے اور سب سے بڑھ کر تمہارے پانچوں ساتھی منتخب کردہ ہیں مگر تم نے رضاکارانہ طور پر اس ”کورس“ میں شمولیت اختیار کی ہے۔ میں تم سے بہت متاثر ہوں۔ کاش خدا نے دو بیٹوں کی بجائے مجھے تمہارے جیسی ایک بیٹی سے نوازا ہوتا۔“ کرنل سلیم کی آنکھوں میں دو اوسط درجے کی صلاحیتوں کے مالک بیٹوں کا دکھ تیرنے لگا۔

جبکہ نقش کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔ وہ اپنے کیمپ کمانڈر کو کیسے بتاتی کہ اس مشکل ترین کورس کو منتخب کرنے کی وجہ کوئی ”اور“ ہے۔

کرنل سلیم نے ہاتھ بڑھا کر اس کا سر چھوا۔ ”مجھے یقین ہے تم اپنے خاندان کا نام ضرور مزید روشن کرو گی۔“ نقش کا سر کچھ اور جھک گیا۔

کچھ دیر بعد وہ ”آفیسرز میس“ سے باہر نکلی تو اس کے کندھوں پر باپ کے بعد کیمپ کمانڈر کی امیدوں کا بوجھ بھی تھا۔

ویک اینڈ کا دن سبھی نے اپنی صفائی ستھرائی میں لگایا تھا۔ اگلے دن سے وہ دوبارہ سخت ترین معمولات کی طرف لوٹ گئے تھے۔

وقت اپنی معمول کی رفتار سے گزر رہا تھا۔ اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ان

لوگوں کو چار دن کے طویل سفر پر بھی روانہ کیا گیا تھا۔

کیمپ سے باہر انہوں نے خیموں کی بجائے برف کے بلاکس کی مدد سے گھروندے بنا کر خود کو ہوا کی مار سے بچایا تھا اور کھانا وغیرہ بھی فیول ٹیبلٹس کی مدد سے خود گرم کیا تھا۔ اس کٹھن ترین مشق نے ان لوگوں کی صلاحیتوں کو جلا بخشی تھی۔

اس سفر کے دوران ایک دو چھوٹے حادثات اور واپسی پر ایک بڑا حادثہ بھی رونما ہوا۔ اس کے علاوہ نقش اور کاشف کے درمیان قدرے تلخی بھی ہوئی۔

چھوٹے حادثات میں نقش کا ایک چھوٹے سے گڑھے میں گرنا تھا۔ برف سے ڈھکا یہ گڑھا چار فٹ سے زیادہ گہرا نہیں تھا۔ انہیں چھوٹے موٹے حادثات سے اپنی مدد آپ کے تحت نمٹنے کے لیکچر دیئے گئے تھے۔

نقش بڑے آرام سے گڑھے سے نکل سکتی تھی مگر کاشف فوراً اس کی مدد کو بڑھا اور اسے کھینچنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نقش نے اس کا ہاتھ تھامنے کی بجائے اپنی اسٹک گڑھے کے کنارے پھنسائی اور اچک کر باہر آگئی۔ ”شکریہ۔ ہمیں اپنی مدد آپ کرنے کا درس دیا گیا ہے۔“ اس نے کہا تھا۔

اس دفعہ کاشف برداشت کا دامن چھوڑ بیٹھا۔ اس نے غصے سے کہا تھا۔ ”آخر تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔ ایک جنرل کی خود سر بیٹی! جس کے لیے ساتھی محض ایک معمولی کیڈٹ ہیں۔ جن سے بات کرنا بھی اسے گوارا نہیں۔“

جواباً نقش نے بھی اس کی طبیعت صاف کردی تھی۔ ساتھیوں نے بمشکل دونوں کو چپ کروایا تھا۔

شامیر، نقش میں کاشف کی دلچسپی تو محسوس کرچکا تھا۔ آج اس نے دوسری دفعہ نقش کو بغور دیکھا تھا۔ وہ لال بھبوکے چہرے والی لڑکی اسے اتنی اجنبی نہیں لگی تھی۔

واپسی پر ان لوگوں نے نایاب ترین برفانی چیتا دیکھا۔ وہ ایک صحت مند چیتا تھا تبھی اس خوب صورت جانور کو دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔ جو اپنی لمبی اور موٹی دم کی مدد سے ایک خطرناک اور بے حد مختصر راستے پر توازن کے ساتھ چلا جارہا تھا۔

ان لوگوں کے پاس بے حد طاقتور نائن ایم ایم پسٹل تھے۔ جس کی مناسب مقام پر لگی ایک گولی برفانی ریچھ کو بھی ڈھیر کرسکتی تھی۔ مگر یہ انہیں صرف اپنی حفاظت کے لیے دیئے گئے تھے۔ نہ کے جنگلی حیات پر گولی چلانے کے لیے۔ ویسے بھی چیتے سے انہیں کوئی خطرہ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ ان لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

اس کے علاوہ برفیلی ڈھلانوں کے درمیان فائر کرنا ویسے بھی بے حد خطرناک تھا۔ آواز کے ارتعاش سے تھوڑی سی برف کھسک پڑتی تو ہزاروں ٹن برف انہیں نگلنے کے لیے دوڑ پڑتی۔

انہیں اپنی صوابدید پر اس وقت گولی چلانے کی اجازت تھی جب اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ ہو۔

بڑا حادثہ ایوالانچ کی صورت میں رونما ہوا تھا۔ جو ان کے ساتھ جانے والے تین رہبروں میں سے ایک کی قربانی لے گیا تھا۔

واپسی پر کیمپ سے باہر ان کی آخری رات تھی۔ ہوا کی رفتار بے حد تیز تھی۔ ہر طرف برف کے ذرات اڑتے پھر رہے تھے۔ موسم شناس رہبر پریشان تھے۔ یہی تیز ہوائیں تو ایوالانچ کا باعث بنتی تھیں۔ کسی بھی چھوٹے سے برفانی تودے کے اپنی جگہ سے لڑھکنے کا خوفناک نتیجہ نکل سکتا تھا۔ ایسے تودے اپنی راہ میں آنے والی برف کو ساتھ لے لیتے تھے اور اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز کو ملیامیٹ کردیتے تھے۔

رہبروں نے انہیں ہدایت دی کہ لانی (ایوالانچ کو مقامی زبان میں لانی کہا جاتا ہے) آنے کی صورت میں سبھی اونچی آواز میں اذان دیں۔ یہ آزمودہ بات تھی کہ لانی کو صرف اذان کی آواز ہی روک سکتی تھی۔ باقی دنیا کی ہر طاقت اس کے سامنے بے بس تھی۔

ایوالانچ کے خوف کے سبب نیند سبھی کی آنکھوں سے دور تھی۔ پھر نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب ایک دل دہلا دینے والی گڑگڑاہٹ ابھری۔ برف پر موجود زندگی کی ہر علامت کو مٹا دینے کے لیے 'لانی' حرکت میں آچکی تھی۔ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک مخصوص سرسراہٹ بھی تھی۔

رہبر چیخے تھے۔ "اذان دو صاحب..... اذان دو....."

سبھی مردوں نے اذان دینا شروع کردی پھر انہوں نے خدا کی کبریائی کا معجزہ دیکھا۔ صبح ہونے پر انہوں نے اپنے برفانی اگلوز کے قریب برف کی اونچی دیوار دیکھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے اس برف کو ان کے اگلوز تک پہنچنے سے پہلے روک دیا تھا۔

نم آنکھوں کے ساتھ ان کے ایمان پہلے سے بھی مضبوط ہوگئے تھے۔ بے شک اللہ سب سے بڑا ہے۔

گلابی اردو بولنے والا شیر دل غائب تھا۔ لانی آنے سے کچھ دیر پہلے وہ رفع حاجت کی غرض سے اگلو سے باہر نکلا تھا۔ کافی دیر اسے ڈھونڈنے کے بعد انہوں نے وائرلیس کے ذریعے کیمپ کو اس کی گمشدگی سے آگاہ کیا۔

باقی ماندہ دونوں رہبروں کا کہنا تھا کہ وہ لانی کا شکار ہوگیا ہے مگر محض اس مفروضے پر اسے چھوڑا تو نہیں جاسکتا تھا۔ کیمپ سے ریسکیو ٹیم پہنچ گئی تھی۔ وہ ریسکیو ٹیم کے ساتھ مل کر شیر دل کو ڈھونڈتے رہے پھر بارہ گھنٹے کے بعد اس کی تلاش ختم کردی گئی۔ بوجھل دلوں کے ساتھ واپسی ہوئی تھی۔

اسے یقیناً لانی نے نگل لیا تھا۔

❀......❀......❀

اونچے برفیلے علاقوں میں "ریکی" کی تربیت کا کورس آخری مرحلے میں تھا۔ شجاع اور حنظلہ کی طبیعت ناساز ہوگئی تھی۔ حنظلہ کو تو معمولی بخار تھا مگر شجاع متلی اور سر چکرانے کی شکایت کررہا تھا۔ اس کا ارتکاز بھی متاثر ہورہا تھا۔ یہ ہوا کے ہلکے پن کے سبب تھا۔ آرمی کے ایئر آفیسر اور جوان ان علاقوں میں اس کیفیت سے دوچار ہوجاتے تھے۔ اس کا واحد علاج دس ہزار فٹ سے کم بلندی تھی۔ جہاں وہ خود بخود نارمل ہوجاتے تھے۔ اس کے بعد زیادہ بلندی پر وہ شاذ ہی اس کیفیت سے دوچار ہوتے تھے۔ ان کا جسم یہ بلندی پہلے جھیل چکا ہوتا تھا۔ اس سبب ان کے جسم میں ہلکی ہوا سے مطابقت کی گنجائش پیدا ہوجاتی تھی۔

ایک لاما ہیلی کاپٹر رسد لے کر سیاہ چن جارہا تھا۔ اسے واپسی پر شجاع کو پک کرنے کی ہدایت مل چکی تھی۔

حنظلہ البتہ کیمپ میں ہی تھا اور ایک انسٹرکٹر جو "آدھا ڈاکٹر" بھی تھا اس کی دیکھ بھال کررہا تھا۔

دو ممبرز کی بیماری کے سبب باقی ممبرز کی تربیت تو رک نہیں سکتی تھی۔ اس لیے وہ جاری تھی۔ کیمپ کے گرد دس کلومیٹر کے نیم دائرے میں سپاہیوں نے فرضی دشمن کے دو خفیہ ٹھکانے بنائے تھے۔ انہیں تلاش کرنے کا مشن باقی چار ممبروں کو سونپا گیا۔ اس مشن کا کوڈ نام (برفانی گیدڑوں کا شکار) تھا اور گروپ کو "چارلی" کا نام دیا گیا تھا اور چارلی کی سربراہی نقش کو سونپی گئی تھی۔

وہ چاروں علی الصبح ہی کیمپ سے نکل آئے تھے۔ آپس میں صلاح و مشورے کا حکم انہیں کیمپ سے کل جانے کے بعد کا دیا گیا تھا۔

سربراہ بے شک نقش تھی مگر سب سے آگے شامیر تھا۔ تربیت انسٹرکٹر شامیر کو "محتاج رو" سمجھتے تھے اسی سبب شامیر آگے تھا۔

اس کے بعد کرن، نقش اور آخر میں کاشف تھا۔

نقش کو یہ ترتیب بالکل پسند نہیں تھی وہ کرن کی جگہ چاہتی تھی۔ اپنے عقب میں اسے کاشف کی موجودگی کے سبب بے چینی سی ہورہی تھی۔ اس کی عورتوں والی مخصوص حس کہہ رہی تھی کہ کاشف کی نظریں گردوپیش کی بجائے اس کی پشت پر جمی ہیں اور یہ حقیقت تھی مگر وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ کاشف کی نظروں میں محبت اور اپنائیت کے جذبے کی بجائے نفرت، حقارت اور ایک سرخ سا طیش تھا۔

کیمپ سے نکلنے کے فوراً بعد وہ یکجا ہوگئے۔ دس کلومیٹر کے نیم دائرے میں جو علاقہ آتا تھا، اس کا کرنل سلیم کے ہاتھ کا بنا نقشہ ان کے درمیان تھا۔ آپس کے اختلاف اور رنجشیں بھلا کر وہ اس نقشے پر جھکے اپنے سفر کا پلان ترتیب دینے لگے۔

بظاہر تو یہ دس کلومیٹر کا علاقہ تھا۔ مگر اپنی دشوار گزاری کے سبب کسی بھی صورت تیس کلومیٹر سے کم نہیں تھا۔ شاید اسی سبب انہیں تین دن کا راشن دیا گیا تھا۔

کافی دیر سر کھپانے کے بعد وہ ایک ٹریک ترتیب دینے میں کامیاب ہوگئے۔

کرن کی نظریں نقشے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پرخیال انداز میں بولی۔ "نیم دائرے کی جو لکیر شروع ہورہی ہے اس نے پورے کیمپ کو اپنے اندر لیا ہوا ہے۔ ممکن ہے ایک ٹھکانہ کیمپ میں ہی قائم کیا گیا ہو۔"

یہ بات سبھی کے دل کو لگی۔ کاشف نے پرجوش انداز میں کہا۔ "بالکل ممکن ہے یہ سادگی اور پرکاری کا امتزاج ہے۔ بالکل سامنے کی چیز عموماً نظر نہیں آتی۔"

"ٹھیک ہے......" نقش نے کندھے اچکائے۔ "ابتدا کیمپ سے ہی کرتے ہیں۔" وہ واپس ہولیے۔

ان کے واپس آنے کی خبر پہلے ہی کرنل سلیم کو ہوگئی تھی۔ سو وہ ان کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھا۔ اس کے چہرے پر قدرے حیرانی کے ساتھ برہمی بھی تھی۔

وہ کیمپ کی حدود میں داخل ہوئے تو کرنل سلیم نے قدرے کرخت انداز میں کہا۔ "کیا مسئلہ ہے؟ تم لوگ واپس کیوں آئے ہو؟"

گروپ لیڈر کی حیثیت سے نقش نے جواب دیا۔ "سر! ہم اپنے مشن کا آغاز کیمپ سے کرنا چاہتے ہیں۔ نقشے میں کیمپ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔"

کرنل سلیم نے اپنے تاثرات پر قابو رکھا۔ "ویلکم۔" اس نے ہاتھ سے کیمپ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا لہجہ البتہ نرم ہوگیا تھا۔

وہ چاروں کیمپ میں پھیل گئے۔ کچھ ہی دیر بعد شامیر نے رفع حاجت کے لیے مخصوص دو چھوٹے خیموں کے عقب میں برف کے بلاکس سے بنا فرضی دشمن کا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا۔ اس کی چھت پر مخصوص سیاہ دائرہ بنا ہوا تھا اس نے شور مچایا تو اس کے باقی ساتھی بھی پہنچ گئے۔

شامیر کی دریافت دیکھنے کے بعد وہ خوش ہوگئے تھے۔ کرن کا چہرہ تو چمکنے لگا تھا۔ یہ اسی کی ذہانت کا کمال تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ پچھلے چار زیر تربیت بیچز میں سے کسی نے بھی کیمپ کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ کرنل سلیم نے نقش سے پوچھا۔ "کیمپ کی طرف کس کا دھیان گیا تھا؟"

"کرن کا......اور کاشف نے بھی اس کی بھرپور تائید کی تھی۔" نقش نے فراخ دلی سے کہا۔ وہ چاہتی تو

کاشف کا ذکر گول ہی کر سکتی تھی۔

کرنل سلیم کی توصیفی نظریں چند لمحے کرن اور کاشف کا احاطہ کیے رہیں پھر اس نے مختصراً کہا۔

"گڈ......"

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ کیمپ سے نکل رہے تھے۔ یہ بات ان کے لیے بڑی طمانیت کا باعث تھی کہ انہیں اب فرضی دشمن کا ایک ہی ٹھکانہ ڈھونڈنا ہے۔

سارا دن وہ برف میں چلتے رہے تھے۔ مگر انہیں کامیابی نہیں ملی تھی۔ سورج غروب ہونے سے کافی پہلے انہوں نے رکنے کا فیصلہ کیا اور ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر برف کے دو اگلو بنا لیے۔

لڑکیوں نے اپنے لیے ٹن پیک گرم کیے تو ازراہ عنایت شامیر اور کاشف کے لیے بھی کر دیئے۔ کھانے کے بعد نقش نے اپنی کمر پر بندھا بیگ اتارا اس بیگ میں جی پی آر ایس کے علاوہ ایک وائرلیس سیٹ اور ہائی انرجی پروٹین بسکٹ کے ساتھ چائے بنانے کے لوازمات بھی تھے۔ چند خاص قسم کی ادویات اور ایمرجنسی میں کام آنے والی کئی اشیاء تھیں۔

نقش نے پہلے جی پی آر ایس پر اپنی لوکیشن چیک کی۔ وہ درست سمت میں سفر کر رہے تھے۔ پھر اس نے وائرلیس سنبھال لیا۔ اس وائرلیس کی رینج دس کلومیٹر سے زیادہ تھی۔ اسے کیمپ سے رابطہ کرنے میں قطعی دشواری نہیں ہوئی۔

اس نے کرنل سلیم کو آج کے دن کی ساری رپورٹ دی اور اپنی پوزیشن بھی بتائی۔ کرنل سلیم نے اپنی نیک خواہشات کے اظہار کے ساتھ رابطہ منقطع کر دیا۔

کرن اور نقش نے ابھی اگلو میں گھسنے والا راستہ بند نہیں کیا تھا۔ اچانک شامیر کو اس خلا سے جھانکتا دیکھ کر نقش کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

شامیر نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "باہمی رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس لیے تم لوگوں کی پرائیویسی میں مخل ہونے پر تو پہلے معذرت کرتا ہوں۔ دراصل قریب میں ایک اونچا ٹیلا ہے۔ روشنی بھی ابھی باقی ہے۔ میرا خیال ہے اسے دیکھ لیتے ہیں۔ اس کی اونچائی "کمین گاہ" کے لیے خاصی مناسب ہے۔"

نقش نے اس کی سحر انگیز آنکھوں میں ایک لحظے کے لیے جھانکا تھا۔

شامیر پیچھے ہٹ گیا۔

باہر نکل کر نقش نے ٹیلے کا جائزہ لیا۔ اس سے پہلے "چمک" سے نگاہوں کو بچانے والا چشمہ اس نے دوبارہ لگا لیا تھا۔

ٹیلا قریب ہی تھا۔ وہ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے میں اسے چیک کر کے واپس آ سکتے تھے مگر اونچے پہاڑوں کے سبب اچانک ہی سورج کسی پہاڑ کے عقب میں چھپ بھی سکتا تھا۔ اس لیے نقش نے سبھی کو ہیڈ لائٹ لگا لینے کے لیے کہا۔

ایک لچکدار گول پٹی سے منسلک ایمرجنسی لائٹس تھیں۔ جنہیں پیشانی پر ایڈجسٹ کیا جا سکتا تھا۔ نقش کا اندازہ تھا کہ واپسی پر انہیں ہیڈ لائٹس کے استعمال کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

انہوں نے خود کو طویل رسے سے منسلک کیا اور پھر ٹیلے کی طرف چل دیئے۔

ٹیلا خاصا بلند تھا۔ احتیاط کے سبب انہیں مزید تاخیر ہو گئی۔ ٹیلے پر مایوسی کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔ واپسی پر انہیں ہیڈ لائٹس جلانی پڑی تھیں۔ وہ دو گھنٹے میں واپس پہنچے تھے۔ اس مشقت نے کھایا پیا ہضم کر دیا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے "تھیلوں" کے منہ بند ہی رکھے تھے۔ واپسی پر باقی ماندہ خوراک کا بھی جائزہ لیا جاتا تھا اور زیادہ خوراک بچا کر لانے والے کو اضافی نمبر دیئے جاتے تھے۔

البتہ دودھ والی چائے کی "عیاشی" انہوں نے ضرور کی تھی۔

اگلے دن صبح سے ہی موسم کے تیور بدلے نظر آ رہے تھے۔ سورج کو مکمل طور سے بادلوں نے ڈھانپا ہوا تھا اور ہوا میں بھی تیزی تھی۔

انہوں نے روشنی بہتر ہونے کا انتظار کیا اور پھر قدرے تاخیر سے روانہ ہوئے۔ دوپہر تک موسم اور خطرناک ہو گیا۔ ہوا کی تیزی کے سبب برف کے ذرات اڑنے لگے تھے اور حد نگاہ بے حد کم ہو گئی تھی۔ ہوا کی رفتار خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ صاف محسوس ہو رہا تھا وہ طوفان کے دہانے پر ہیں۔

انہوں نے چہروں پر ماسک چڑھا لیے تھے۔ اس وقت وہ ایک خطرناک ڈھلان پر تھے۔ دور کہیں گڑگڑاہٹ گونجی۔ کہیں لینڈ سلائیڈنگ ہو رہی تھی۔

شامیر بے حد احتیاط کے ساتھ ایک ایک قدم پھونک پھونک کر بڑھا رہا تھا اچانک ہی اس کا توازن بگڑا یوں محسوس ہوا جیسے برف اس کے قدموں کے نیچے سے کھسکی ہو اور یہ حقیقت تھی۔ ڈھلوان کی برف کھسک رہی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ چاروں بے توازن ہو کر گرے تھے اور پھر طوفانی رفتار کے ساتھ برف کے ساتھ گرتے چلے گئے۔ بدحواس ہو کر پہلے تو وہ چیخے چلائے تھے پھر تربیت نے رنگ دکھایا۔ انہوں نے پشت کے بل خود کو متوازن کر کے اپنی چھڑیوں کے ذریعے رفتار کو کم کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ بپھرے طوفان کے سامنے کمزور بند باندھنے والی بات تھی۔ اس کوشش میں وہ اپنی چھڑیوں سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ کاشف کسی قدر کامیاب ہوا تھا مگر ایک ہی رسے سے منسلک ہونے کے سبب باقی تینوں کا وزن اسے بھی کھینچ لے گیا تھا۔

موت بالکل سامنے تھی۔ شامیر نے کلمہ پڑھا اسی لمحے اسے محسوس ہوا کہ وہ جیسے کسی تاریک خلا میں گرا ہے۔ زندگی کی آخری امید بھی ختم ہو گئی تھی۔ وہ کسی کھائی یا غار میں گرا تھا۔

گرتے ہوئے نجانے کیوں اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ زندگی میں اس کے لیے رکھا ہی کیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ نا صرف برف میں دھنستا جا رہا ہے پھر اس کا جسم تاریکی میں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا اور ناقابل برداشت درد کے سبب اس کی چیخ نکل گئی اس کا ذہن تیزی سے تاریک ہو گیا۔ آخری احساس اپنے جسم کے ساتھ کسی اور وجود کے ٹکرانے کا تھا۔

دو افراد کا وزن کم ہونے کے سبب کاشف پر دباؤ محض نقش کے وزن کا ہی رہ گیا تھا۔ نقش پاؤں کی ایڑھیاں برف میں رگڑ کر رفتار کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اسے کھائی نظر آئی جس میں اس کے دونوں ساتھی غائب ہوئے تھے۔ اس نے خود کو روکنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس کی رفتار خاصی کم ہو گئی تھی مگر وہ خود کو گرنے سے نہ بچا سکی۔ اضطراری کیفیت میں اس نے ہاتھ پاؤں مارے۔ اچانک ہی اس کے ہاتھ کسی پتھر پر جم گئے۔ اس نے مضبوطی سے اس پتھر کو تھام لیا۔

وہ رک گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی چند گہرے سانس لیے اور ذہن کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ وہ کھائی کے کنارے سے چند فٹ نیچے کسی پتھر کے سہارے لٹکی ہوئی تھی اور اس کے جسم کا سارا زور بازوؤں پر تھا۔ شکر کا مقام تھا کہ پہلے گرنے والے ساتھی کسی ٹھوس جگہ تک پہنچ چکے تھے اور ان کے وزن کا دباؤ اس پر نہیں تھا۔ ورنہ وہ چند سیکنڈ بھی ان کا وزن نہیں سنبھال سکتی تھی۔

یہ سوچ کر نقش کو کچھ ڈھارس بندھی کہ کاشف نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اس کا دماغ کچھ کام کرنے لگا۔ اسے اپنے گرنے والے ساتھیوں کی فکر ہوئی۔ چلتے ہوئے ان کے درمیان دس گز کا فاصلہ ہوتا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ زیادہ سے زیادہ بیس گز کی گہرائی میں تھے۔ اگر اس سے زیادہ گہرائی میں ہوتے تو ان کا وزن نقش کو بھی اپنی طرف کھینچ چکا ہوتا۔

نقش کے بازو شل ہوئے جا رہے تھے۔ اس نے کہیں پاؤں جمانے کی کوشش کرتے ہوئے کاشف کو آواز دی۔ ”کاشف! کہاں ہو؟ ہیلپ ی۔“ اسی دوران اس کا ایک پاؤں کسی دراڑ وغیرہ میں جم ہی گیا۔ اس نے فوراً اپنا وزن متوازن کیا اور ایک ہاتھ سے ٹٹول کر اپنی ہیڈ لائٹ روشن کرلی۔

نیچے دیکھتے ہوئے اس کا سانس رک گیا۔ لامتناہی گہرائی تھی۔ تو پھر اس کے ساتھی کہاں گئے؟ اگر وہ اس گہرائی میں گرتے تو یقیناً نقش اور کاشف کو بھی کھینچ لیتے۔

نقش نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا طویل سانس لیا کہ جہاں وہ لٹکی ہوئی تھی اس کے دوسرے کنارے پر تقریباً پندرہ گز نیچے ایک قدرتی شیڈ سا نکلا ہوا تھا جس پر برف کے ڈھیر میں کسی کے سیاہ بوٹ نظر آرہے تھے۔ جوائنٹ رسا یہاں سے وہاں تک تنا ہوا تھا۔

نقش نے زور سے شامیر اور پھر کرن کو آوازیں دیں مگر جواب ندارد۔ اس کا دل ڈوب سا گیا۔

اسی وقت کھائی کے کنارے پر کاشف کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے بھی اپنی ہیڈ لائٹ روشن کرلی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی نقش نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنا وزن خود سہار رکھا ہے۔ تم پیچھے ہٹ کر مضبوطی سے قدم جماؤ‘ میں رسا تھام کر نکل آؤں گی۔ ہمارے ساتھیوں کو فوری مدد کی ضرورت ہے۔“

پیچھے ہٹنے کی بجائے وہیں بیٹھ کر کاشف نے اپنے چہرے سے ماسک ہٹایا۔

یہ دیکھ کر نقش ششدر سی رہ گئی کہ اس کے چہرے پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

کاشف نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اوہ...... یہ آج اونچی ناک والا مغرور آسمان‘ زمین تک کیسے جھک آیا۔ تمہیں تو کسی کی مدد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ ساتھ ہی اس نے پنڈلی سے بندھا کمانڈو خنجر نکال لیا تھا۔

نقش کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ کاشف معمولی رنجش کو اس طرح خطرناک سنجیدگی سے لے گا۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ”لگتا ہے تم ہوش میں نہیں ہو۔ ایک معمولی سی بات کی خاطر تم ہماری زندگیوں سے کھیلنے جا رہے ہو۔“

”ہوش تو میرے تمہارے حسن نے چھین لیے ہیں۔ باقی تم لوگ ایوالانچ کا شکار ہوگئے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔“ اس کے چہرے پر بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ اس کا اپنے بچاؤ کا منصوبہ بے حد واضح تھا۔

ایک دفعہ تو نقش کے جی میں آئی کہ پتھر چھوڑ دے اور اس شیطان کو بھی اپنے ساتھ اتھاہ گہرائیوں میں لے جائے۔ اس نے بڑی مشکل سے اس خواہش پر قابو پایا۔ اور ایک دوسرے زاویے سے کاشف کو سمجھانا چاہا۔

”دیکھو...... میری مدد بے شک نہ کرو۔ مگر باقی دونوں ساتھیوں کا تو خیال کرو۔ انہوں نے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑا اور بگاڑا تو میں نے بھی کچھ نہیں۔“ بے بسی کے احساس کے سبب آنسوؤں کا ایک گولا سا اس کے حلق میں پھنس گیا تھا۔

”وہ مر چکے ہیں۔“ کاشف نے بے پروائی سے کہا اور اچانک ہی جھک کر نقش پر خنجر سے وار کیا۔ نقش کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ خنجر اس کے کندھے پر لگا تھا۔ اس وار کا مقصد اس کی جان لینا نہیں بلکہ کچھ اور تھا۔ اس کی کمر سے بندھے تھیلے کا اسٹرپ نصف سے زیادہ کٹ گیا تھا۔

کاشف جنونی انداز میں چلایا۔ ”لاؤ...... یہ تھیلا مجھے دے دو۔“ ساتھ ہی اس نے وہ رسا بھی کاٹ دیا جس سے وہ بھی منسلک تھا۔

نقش کی امید دم توڑ گئی۔ کاشف‘ اسے مارنے کا پکا فیصلہ کر چکا تھا۔ پھر باقی ماندہ اسٹرپ ٹوٹ گئی اور نقش کا تھیلا اس کی کمر سے پھسل کر اتھاہ گہرائیوں میں جا گرا۔

کاشف نے کھڑے ہو کر غصے سے برف پر پاؤں مارا‘ بہت ساری برف نقش کے چہرے پر آگری۔ کاشف کا ارادہ ان تینوں کی ”ایوالانچ“ کی سبب گمشدگی کے بعد کیمپ سے اپنے لیے مدد مانگنے کا تھا۔ اس لیے اسے نقش کا تھیلا درکار تھا۔ جس میں وائرلیس کے علاوہ جی پی آر ایس بھی تھا‘ مگر اب وہ تھیلا سبھی کے لیے بیکار ہو چکا تھا۔

کاشف نے نفرت سے کہا۔ ”لٹکتی رہو...... اس سرد جہنم میں۔ تمہارا تھیلا ”تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی وہ پیچھے ہٹ گیا۔

نقش نے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کے سر سے اوپر کھائی کے کنارے تک کا حصہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہاں تک پہنچنا ناممکن تھا۔ جس باہر نکلے ہوئے پتھر کے سہارے وہ لٹکی ہوئی تھی۔ وہ بھی یوں محسوس ہوتا تھا قدرت نے محض اس کی مدد کے لیے ہی باہر نکالا ہے۔

نقش نے صدق دل سے اپنے اور اپنے مصیبت زدہ ساتھیوں کے لیے دعا مانگی۔ دعا مانگنے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ زیادہ دیر تک یہاں لٹکا رہنا مشکل تھا۔ دراڑ والے پاؤں کی تو خیر تھی مگر ہاتھ کی انگلیاں اسے سن ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ دل ہی دل میں اس نے ایک فیصلہ کیا اور پھر تن بالتقدیر ہو کر خود کو متوازن کرنے کے بعد اس شیڈ پر چھلانگ لگا دی۔ جہاں اس کے ساتھی موجود تھے۔

وہاں نرم برف کا ڈھیر تھا مگر اس کے باوجود نقش کے گھٹنوں پر خاصی چوٹ لگی۔ خود کو سنبھالتے ہی اس نے بے تابانہ انداز میں شامیر کو ٹٹولا۔ وہ برف میں پورے کا پورا دھنسا ہوا تھا۔ اور منہ کے بل پڑا تھا۔ شکر کا مقام تھا کہ اس کے چہرے پر ماسک تھا۔

نقش نے بڑی مشکل سے اسے برف سے نکال کر سیدھا کیا۔ اس کی کہنی اور ایک ٹانگ غیر فطری انداز میں مڑے ہوئے تھے یقیناً ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ کرن البتہ سلامت نظر آرہی تھی۔ اور اس کی مدھم سانسوں کا زیر و بم بھی نمایاں تھا۔ نقش نے بے قرار ہو کر شامیر کی دھڑکن ٹٹولی۔ وہ زندہ تھا۔ نقش نے اطمینان کا عمیق سانس لے کر اس کا کنٹوپ اور پھر اس کی اونی ٹوپی اتاری۔ سر پر بھی چوٹ آئی تھی اور خون نکل کر جم گیا تھا۔ نقش نے جلدی سے کنٹوپ اور ٹوپی وغیرہ درست کی۔ اس کا دل غم و غصے سے بھر گیا تھا۔ کاشف اس وقت اس کے سامنے ہوتا تو یقیناً وہ‘ اسے شوٹ کر دیتی مگر وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ اسے ابھی بھی سزا دینے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اس نے ہولسٹر سے طاقتور نائن ایم ایم نکالا اور کھائی کے دہانے کی طرف نال کا رخ کر کے یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیے۔

زوردار دھماکوں کی آوازوں سے کھائی گونج اٹھی۔ آواز کی ارتعاش کے سبب کئی جگہوں سے برف ٹوٹ کر ان پر گری تھی۔ دھماکوں کی گونج ابھی باقی تھی کہ

www.paksociety.com

نقش کے کانوں نے وہ مخصوص سرسراہٹ سنی جو اس لمحے اسے کسی نغمے سے کم محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ سرسراہٹ کاشف کے لیے موت کی آواز ثابت ہوسکتی تھی۔ دھماکوں کے سبب جو ارتعاش پیدا ہوا تھا' اس نے ڈھلوان کی رک جانے والی برف کو دوبارہ حرکت دے دی تھی۔

پھر نقش نے کاشف کی دلدوز چیخ سنی۔ اگلے ہی پل سیکڑوں ٹن برف اسے اڑا کر لے گئی۔ اور اس برف نے کھائی کے منہ کو بھی دوبارہ سے ڈھانپ لیا تھا۔ بہت ساری برف ان تینوں پر بھی گری تھی۔ وہ تینوں ایک برفیلی قبر میں قید ہوگئے تھے۔ مدد نہ ملنے کی صورت میں ٹھٹھری ہوئی موت ہی ان کا مقدر تھی۔

مدد ملنے کی کوئی امید بھی نہیں تھی۔ پی ٹی آر ایس اور وائرلیس' جن کے ذریعے مدد مانگی جاسکتی تھی۔ کھائی کی اتھاہ گہرائیوں میں نقش کے تھیلے کے ساتھ ہی غائب ہوچکے تھے۔ ایک' دو دن ان کی تلاش میں صرف کرنے کے بعد ان کی گمشدگی بلکہ شہادت کا اعلان کردیا جاتا مگر یہ سوچ کر نقش مایوس نہیں ہوئی۔ مایوسی کفر اور حوصلوں' امیدوں کو توڑ دینے والی بلا تھی۔ اس نے خوش امیدی کا دامن تھاما۔ دس کلومیٹر کے نیم دائرے میں ایک بڑا ریسکیو آپریشن ان کی تلاش میں کامیاب بھی ہوسکتا تھا۔ ان کی آخری رپورٹ' جس میں پوزیشن بھی بتائی گئی تھی۔ خاصی مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔ وہ اس پوزیشن سے زیادہ دور نہیں تھے۔

یہ سوچ کر نقش کا وجود امید اور حوصلے سے بھر گیا تھا۔ اسے مدد آنے تک نہ صرف خود زندہ رہنے کی جدوجہد کرنی تھی بلکہ اپنے دونوں ساتھیوں کی دیکھ بھال بھی کرنی تھی۔ ساتھی' جن میں سے ایک شامیر بھی تھا۔ جس کے جسم کی کم از کم دو ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔

نقش بڑی تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس نے اپنی پنڈلی سے بندھی ایک چھ انچ کی لمبوتری سی ٹیوب کھولی۔ دوسری پنڈلی کے ساتھ کمانڈو خنجر بندھا تھا۔

لمبوتری ٹیوب دراصل ایک حفاظتی خول تھا۔ جس کے اندر پلاسٹک کی ایک اور ٹیوب تھی۔ یہ خاص قسم کی ایمر جنسی لائٹ تھی۔ اس ٹیوب میں ایک کیمیکل اور گیس بھری ہوئی تھی۔ جب یہ دونوں آپس میں ملتے تھے تو کئی گھنٹے تک اچھی خاصی زرد رنگ کی روشنی کی شکل اختیار کرلیتے تھے۔ ان دونوں کو آپس میں ملنے سے روکنے کے لیے ٹیوب کے درمیان میں رکاوٹ تھی جو چند جھٹکے دے کر ہٹائی جاسکتی تھی۔

ہیڈ لائٹ کی بیٹری بچانے کی غرض سے نقش نے وہ ٹیوب نکالی تھی۔ ویسے اس ٹیوب کی روشنی ہیڈ لائٹ سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اس نے ٹیوب کو جھٹکے دیئے۔ چند ہی لمحوں میں ٹیوب سے زرد رنگ کی بیمار سی روشنی پھوٹنے لگی۔

نقش نے ہیڈ لائٹ آف کی۔ اسی لمحے شامیر کے کراہنے کی آواز گونجی۔ وہ ہوش میں آرہا تھا۔ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے ابتدائی طبی امداد کا کورس کیا تھا۔ شامیر کی ٹوٹی کہنی اور ٹانگ کو اس نے قدرتی انداز میں سیدھا کیا تو شامیر کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ مکمل طور سے ہوش میں آگیا تھا اور اب ٹھنڈے پڑجانے والے جوڑ تکلیف دے رہے تھے۔

شامیر نے آنکھیں کھولیں تو نقش کو خود پر جھکے پایا۔ اس کی آنکھوں میں فکر مندی نمایاں تھی۔

"کیا ہم زندہ ہیں؟" شامیر نے بے حد مدھم آواز میں پوچھا۔

نقش نے اس کے چہرے سے ماسک ہٹایا۔

"ہاں' خدا کو ہماری زندگیاں بچانا مقصود تھا۔ ہم ایک کھائی میں گرے ہیں۔ مدد ابھی آتی ہی ہوگی۔" اس

نے دانستہ سنگین حقائق چھپائے۔

زرد روشنی میں شامیر کا چہرہ زرد تر نظر آرہا تھا۔ اس نے کرب میں ڈوبی آواز میں کہا۔ "لگتا ہے میرے بازو اور ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

"ہاں۔" نقش نے تصدیق کی۔ "میں نے کہنی اور ٹانگ کو سیدھا کردیا ہے۔ تم انہیں ہلانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں کرن کو دیکھ لوں پھر تمہیں مزید طبی امداد دیتی ہوں۔"

شامیر نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسے مدد کا انتظار تھا۔ ہڈیاں ٹوٹنے کے بعد وہ لاچار ہوکر ایک لڑکی کے رحم و کرم پر تھا اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا مگر وہ بے بس تھا۔

نقش' کرن کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے ٹٹولنے لگی۔ اس کی ہڈیاں سلامت تھیں۔ نرم برف اور شامیر کے جسم پر گرنے کے سبب وہ سلامت رہی تھی۔ بے ہوشی صرف صدماتی کیفیت تھی۔

نقش نے اس کا ماسک اتار کر اس کی ناک اور منہ کو بیک وقت بند کردیا۔ چند سیکنڈ ہی میں کسمسا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مکمل ہوش میں آنے سے پہلے وہ ہذیانی انداز میں چیخی چلائی اور اس نے ٹانگیں اور ہاتھ یوں آسمان کی طرف اٹھائے جیسے کسی چیز کو خود پر گرنے سے روک رہی ہو۔

نقش نے اس کے گال تھپتھپائے کچھ دیر میں وہ مکمل ہوش میں آگئی۔

یقین نہیں آرہا۔ ہم زندہ ہیں۔ اس نے باقاعدہ خود کو ٹٹول کر دیکھا۔

نقش کی توجہ دوبارہ شامیر کی طرف ہوگئی تھی۔ اس نے شامیر کے خصوصی لباس کے بٹن کھولے تو شامیر نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی کرب انگیز سوالیہ نظریں نقش پر تھیں۔

نقش نے کہا۔ "تمہاری ہڈیوں کے ٹوٹے حصوں کو اپنی جگہ بٹھانا ضروری ہے۔"

"رہنے دو......" شامیر نے کسی قدر رکھائی سے کہا۔ "مدد آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اور اتنی برداشت مجھ میں ہے۔"

نقش کے ہاتھ نہیں رکے۔ شامیر کی رکھائی تو اس نے نظر انداز کردیا تھا۔ "مدد آنے میں تاخیر بھی ہوسکتی ہے اور تاخیر تمہارے حق میں مناسب نہیں۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ شامیر اسے روک نہ سکا۔

کرن بھی قریب کھسک آئی تھی شامیر کی حالت دیکھ کر وہ بھی پریشان ہوگئی۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ کاشف ان کے درمیان نہیں ہے۔ کسی خوفناک اندیشے کے سبب اس نے ڈرتے ڈرتے کاشف کے بارے میں استفسار کیا تو نقش نے سرد انداز میں کہا۔

"اسے ایوالانچ نے نگل لیا ہے۔"

اس انکشاف پر جہاں کرن کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ وہیں شامیر کے چہرے پر بھی دکھ کے تاثرات نمایاں ہوگئے تھے۔ مگر اسے' نقش کا انداز پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے انداز میں ایک ساتھی کا تاثر نہیں تھا۔

نقش کی انگلیاں خصوصی لباس کے اندر شامیر کی ٹانگ پر گردش کررہی تھیں۔ اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹی تھی۔ خصوصی لباس کے نیچے اونی لباس تھا۔

چند ہی لمحوں میں نقش کی انگلیاں ٹوٹی ہوئی ہڈی والے حصے کو چھو رہی تھیں۔ شامیر نے دانتوں پر دانت جما کر درد برداشت کرنے کی کوشش کی تھی۔

نقش نے کرن سے مخاطب ہوکر قدرے درشت انداز میں کہا۔ "یہ رونا' دھونا چھوڑو اور خول کے لمبائی کے رخ پر تین حصے کرو۔" اس کا اشارہ ایمر جنسی لائٹ کے حفاظتی خول کی طرف تھا۔ یہ خول لچکدار مگر مضبوط پلاسٹک سے بنا تھا۔

کرن نے آنسو پونچھ کر خود کو سنبھالا۔ وہ نقش کا مقصد جان گئی تھی۔ اس نے اپنا کمانڈو خنجر نکالا اور اس خول کے لمبائی کے رخ تین مساوی ٹکڑے کردیے۔

"اپنے بوٹ کا آدھا تسمہ نکالو!" نقش نے نیا حکم جاری کیا۔

کرن نے تکمیل کی۔ آدھے تسمے سے بھی جوتے کو مضبوطی سے بند کیا جاسکتا تھا۔

نقش نے اچانک جھٹکا دیا۔ شامیر کے حلق سے بے اختیار کراہ نکلی۔ مگر کھٹک کی آواز سے ہڈی اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تھی۔ شدید سردی کے باوجود شامیر کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہوگئے تھے اور وہ ہانپنے لگا تھا۔

نقش نے کرن کی مدد سے ٹوٹی ہوئی ہڈی کے گرد پلاسٹک کے خول کے ٹکڑے رکھے۔ چوتھی طرف شامیر کے خنجر کو استعمال کیا اور تسمے کی مدد سے خوب کس کر باندھ دیا۔

پھر وہ بازو کی طرف آئی' بازو کی حالت زیادہ نازک تھی۔ کلائی کی ہڈی بھی ٹوٹی تھی اور کہنی کا جوڑ بھی نکل گیا تھا۔ کوشش کے باوجود کہنی کا جوڑ ٹھیک طرح سے نہیں بیٹھا تھا' بہرحال نقش نے شامیر کی دوسری پنڈلی سے بندھی ایمرجنسی لائٹ والی ٹیوب کا خول استعمال کرکے بازو کو بھی باندھ دیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے بوٹ کا نصف تسمہ استعمال کیا تھا۔

شامیر کے بوٹ کا تسمہ نکال کر اس کے ذریعے ٹوٹا بازو اس کے گلے سے لٹکا دیا پھر اس نے شامیر کا تھیلا اتارا' اس میں بھی چند ادویات تھیں۔ اس نے ایک پین کلر انجکشن شامیر کو لگادیا۔

اس کی فکرمندی اور کوششوں سے شامیر قدرے متاثر ہوا۔ شاید پہلی دفعہ اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ "تمہاری بھاگ دوڑ سے تو یوں محسوس ہوتا ہے' ہمیں جیسے کئی دن اس جگہ پر گزارنے ہوں۔ ہم کے' ٹو کی بلندیوں میں نہیں کھوئے ہوئے۔ مدد پہنچنے میں چند گھنٹے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔"

پھر اسے خیال آیا۔ "تم نے جی' پی' آر' ایس پر "مے ڈے" کا میسج بھیج دیا ہے نا؟"

نقش' اس کا تھیلا ٹٹولنے میں مصروف تھی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ کرن بھی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

اب جبکہ وہ دونوں ابتدائی شاک سے سنبھل گئے تھے انہیں حالات کی سنگینی سے بے خبر رکھنا مناسب نہیں تھا۔ نقش نے انہیں سب کچھ بلا کم و کاست بتادیا۔ بشمول کاشف کے منفی کردار اور اسے سزا دینے کے اپنے اقدام کے۔

آگاہی ملتے ہی وہ دونوں سکتے کی سی کیفیت میں رہ گئے تھے۔ شامیر نے اپنے دل میں نقش کے لیے بے پناہ عزت و احترام اترتا محسوس کیا۔ انتہا پسندی کے قلعے کی فصیل میں پہلی دراڑ پڑ گئی تھی۔ جبکہ کاشف کے لیے حقارت اور نفرت کا طوفان سا اٹڈ آیا تھا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ "تم نے بروقت اور بالکل درست قدم اٹھایا۔ وہ ایسے ہی انجام کا مستحق تھا۔" آخری فقرہ اس نے زہرخند انداز میں کہا تھا۔

نہ جانے کرن کو کیا ہوا کہ وہ نقش کے گلے لگ کر رونے لگی۔

نقش نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "کم آن گرل' صورت حال اتنی بھی مایوس کن نہیں ہے۔ ہم آخری بتائی پوزیشن سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ہمیں جلد ہی تلاش کرلیا جائے گا۔" وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ٹنوں برف نے کھائی کے تنگ دہانے کو ڈھانپ لیا ہے اور

بغیر نشان دہی کے ان تک پہنچنا ناممکن ہے۔"

شامیر نے کہا۔ "ہم کوشش کریں تو ممکن ہے' جی' پی' آر' ایس والا تھیلا مل ہی جائے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔

نقش نے بے اختیار اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تمہارا ہلنا' جلنا کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔"

شامیر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ کئی دفعہ اسے محسوس ہوا تھا کہ یہ لڑکی اس کے لیے اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ رکھتی ہے اور آج مصیبت کی اس گھڑی میں تو یہ کچھ زیادہ ہی واضح تھا۔ شامیر نے ہمیشہ کی طرح اسے وہم جان کر دماغ سے جھٹکا اور بے حرکت ہوگیا۔ پین کلر کے سبب درد دب گیا تھا مگر اس نے محسوس کرلیا تھا' حرکت اس کے لیے ناممکن حد تک مشکل ہے۔

نقش کی نگاہوں کی تپش سے بچنے کی غرض سے اس نے آنکھ موند لینے میں عافیت جانی۔

کرن کو جی' پی' آر' ایس والے تھیلے تک رسائی کا خیال پرجوش کر گیا تھا۔ نقش سے علیحدہ ہوکر اس نے آنسو پونچھے۔ "کس پتھر سے تم لٹکی ہوئی تھیں' جب تھیلا گرا تھا؟"

شامیر نے بھی دلچسپی کے سبب آنکھیں کھول دی تھیں۔

نقش نے کہا۔ "پہلے سامان یکجا کرنے میں میری مدد کرو۔ دیکھیں تو سہی ہمارے پاس زندہ رہنے کا کتنا سامان ہے پھر اپنی توانائیاں تھیلے کی تلاش میں صرف کریں گے۔"

بات معقول تھی۔ کرن نے بھی اپنی کمر پر بندھا تھیلا اتار کر نقش کے سامنے رکھ دیا پھر دونوں نے مل کر دونوں تھیلوں کا سامان یکجا کیا۔ خوراک ان کے پاس مایوس کن حد تک کم تھی۔ دونوں تھیلوں میں سے تین' تین ہائی پروٹین بسکٹ نکلے تھے۔ ایک بسکٹ ایک وقت کے کھانے جتنی توانائی دیتا تھا۔ آدھا کلو خشک دودھ کا پیکٹ تھا۔ تقریباً اتنی ہی چینی اور چند چائے کی پتی اور کافی کے ساشے تھے۔ ایک پاؤ چکن پاؤڈر' ایک ٹن پیک چکن بریانی کا تھا۔ ایک چھوٹی سی دیگچی تھی اور چند فیول ٹیبلٹس تھیں۔

ایمرجنسی میں کام آنے والی ادویات میں چند خاص قسم کے انجکشن بھی تھے۔ اس کے علاوہ کئی چھوٹی موٹی اشیاء تھیں۔

خوراک کا حال دیکھ کر ان تینوں کے چہروں پر مایوسی نظر آنے لگی تھی۔ وہ کفایت شعاری سے بھی کام لیتے تو یہ خوراک زیادہ سے زیادہ دو دن چل سکتی تھی۔

نقش نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔ "مجھے یقین ہے کہ خوراک ختم ہونے سے پہلے مدد پہنچ جائے گی۔ ہماری تلاش کے لیے ریسکیو ٹیمیں نکلنے ہی والی ہوں گی۔"

"مجھے یقین نہیں ہے۔" شامیر نے تلخی سے کہا۔ زخمی ہونے کے سبب وہ چڑچڑا ہوگیا تھا۔ "بغیر نشاندہی کے اس برفانی قبر میں ہمارا سراغ ملنا ناممکن ہے۔"

"مایوسی کفر ہے شامیر!" نقش نے تادیبی انداز میں کہا۔ "جس خدا نے ہمیں ایوالانچ کا نشانہ بننے سے بچانے کیلیے اس کھائی میں گرادیا ہے وہی یہاں سے نکالنے کی بھی کوئی سبیل نکالے گا۔"

کھائی میں گرنے سے پہلے والی پوزیشن کا تصور کرو۔ ہم گولی کی رفتار سے لڑھک رہے تھے۔ اگر ہم کھائی میں نہ گرتے تو ممکن ہے اس وقت برف کے نیچے دبے ہوتے۔ ہمارے سانس ختم ہوچکے ہوتے۔" پھر اس کا لہجہ نرم ہوا۔ "مثبت انداز میں سوچو۔ زندہ رہنے کی امنگ ہی خدا کے بعد ہمارا آخری سہارا ہے۔"

شامیر اس لڑکی کے ہمت و حوصلے سے متاثر ہوا' اپنے انداز پر اسے ندامت محسوس ہوئی وہ دھیرے سے بولا۔ "ویری سوری! مجھے مایوس کن باتیں کر کے تم دونوں کا حوصلہ توڑنے کا کوئی حق نہیں۔"

نقش کے چہرے پر بڑی اجلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کرن نے دوبارہ اس سے پتھر کی لوکیشن پوچھی تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

آپس کے تبادلہ خیال کے بعد پتا چلا کہ کرن ایک فیول ٹیبلٹ جلا کر اس پتھر کے عین نیچے پھینکنا چاہتی تھی تاکہ گہرائی کا اندازہ کیا جاسکے۔

نقش نے فیول ٹیبلٹ ضائع کرنے کی بجائے ایک اور آئیڈیا دیا۔ یہ آئیڈیا کرن اور شامیر دونوں کو بے حد پسند آیا تھا۔ اس سے نہ صرف کھائی کی گہرائی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا بلکہ نیچے اترنے کے لیے کسی مناسب مقام کو بھی تلاش کیا جاسکتا تھا۔ وہ تینوں جس رسے سے منسلک تھے وہ بیس گز سے زیادہ تھا۔ انہوں نے اسے کھول کر اس کے ایک سرے پر ایمرجنسی ٹیوب باندھی اور پھر احتیاط سے اسے نیچے لٹکا دیا باہر نکلے ہوئے شیڈ سے نیچے کھائی روشن ہونے لگی۔

نقش اور کرن نے شیڈ کے کنارے پر لیٹ کر نظریں نیچے جما دی تھیں۔ رسے کا دوسرا سرا کرن کی کلائی سے بندھا تھا اور وہی رسے کو آہستہ آہستہ نیچے لٹکا رہی تھی۔ دس فٹ سے زیادہ چوڑی اس کھائی میں ابھی تک نیچے اترنے کے لیے کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا پھر رسا ختم ہوگیا مگر کھائی کی گہرائی ختم نہیں ہوئی۔ بیس گز نیچے خاصی روشنی تھی مگر کھائی کی تہہ نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ یقیناً سینکڑوں فٹ گہری تھی۔

ناامید ہو کر کرن نے رسا کھینچنا شروع کردیا۔

نقش نے ہاتھ میں آجانے والا ایک پتھر گہرائی میں اچھال دیا۔ خاصی دیر بعد اس کے تہہ سے ٹکرانے کی مدہم آواز سنائی دی۔ اس آواز کو شامیر نے بھی سن لیا تھا۔ امید کا مدھم اجالا کھائی کے گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ کھائی کی گہرائی میں اترنا اور تھیلا تلاش کرنا ناممکن تھا۔ ویسے بھی اتنی بلندی سے گرنے کے سبب وائرلیس سیٹ اور جی' پی' آر' ایس ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے ہوں گے۔

رسا واپس کھینچ لینے کے بعد کرن برف پر ڈھیر ہوگئی۔

انہیں وہاں کئی گھنٹے بیت گئے۔ بڑھتے ہوئے منفی درجہ حرارت سے اندازہ ہوا تھا کہ سورج غروب ہوگیا ہے اور ان برف زاروں پر ایک اور ٹھٹھری ہوئی رات اتر آئی ہے۔

مایوسی کے عالم میں منفی بیس سینٹی گریڈ کی سردی بھی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ سب سے برا حال شامیر کا تھا۔ پین کلر انجکشن کا اثر ختم ہوچکا تھا۔ ٹانگ اور بازو میں شدید درد کے سبب وہ بے چین ہو رہا تھا پھر جب درد حد سے بڑھا تو وہ کراہنے لگا۔

سردی کے سبب کپکپاتی نقش کو ان کراہوں نے بے چین کردیا۔ وہ شامیر کے قریب ہوئی۔ اس کے چہرے پر تمتماہٹ دیکھ کر نقش نے تھوڑا سا دستانہ اتار کر اس کی پیشانی چھوئی۔ اسے تیز بخار تھا۔ نقش نے مایوسی کو جھٹکا اور کرن کا بھی حوصلہ بڑھایا۔ شامیر پر بخار کے سبب غفلت سی طاری ہونے لگی تھی۔ پیٹ میں بھی کچھ نہیں تھا۔ خالی پیٹ شامیر کو ادویات دینا مناسب نہیں تھا۔ نقش کے کہنے پر کرن نے چکن پاؤڈر میں برف ملا کر دیگچی کے نیچے فیول ٹیبلٹ جلا کر سوپ تیار کیا۔

پھر نقش ہی کی ہدایت پر کرن نے جھجکتے ہوئے شامیر کا سر اپنی گود میں رکھا۔ نقش سوپ اور پلاسٹک کا چمچ لے کر نزدیک ہوگئی۔ اس نے آہستہ سے شامیر کے گال تھپتھپائے۔

"شامیر...... یہ پی لو! پھر میں تمہیں انجکشن لگاتی ہوں۔"

شامیر نے آنکھیں کھول دیں۔ نقش نے چمچ اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ اس نے سوپ حلق سے اتار لیا۔ خاطر خواہ سوپ شامیر کے پیٹ میں منتقل ہوچکا تو باقی ماندہ سوپ اور نصف نصف ہائی پروٹین بسکٹ نقش اور کرن نے بھی اپنے حلق سے اتار لیا۔

پیٹ میں غذا جاتے ہی وہ سردی کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی ہوگئے تھے۔

فیول ٹیبلٹ ابھی تک جل رہی تھی۔ نقش نے شامیر کی ٹانگ اور بازو کا معائنہ کیا۔ ٹانگ تو نسبتاً بہتر تھی مگر بازو پر اچھی خاصی سوجن تھی۔

نقش نے ایک کپڑا لے کر اسے فیول ٹیبلٹ کے شعلے پر گرم کیا اور اس سے شامیر کے متاثرہ بازو کی ٹکور کرنے لگی۔ باقی ماندہ شعلے پر کرن نے برف پگھلا کر پانی بنالیا تھا۔

اس ٹکور سے شامیر کو خاصا فائدہ ہوا۔ دھندلائی آنکھوں سے اس نے نقش اور کرن کی اپنے لیے فکر مندی دیکھی تھی۔ اس کی دماغ کی گہرائیوں میں ایک سرگوشی ابھری۔ ساری لڑکیاں روما جیسی نہیں ہوتیں۔ کچھ نقش اور کرن جیسی بھی ہوتی ہیں۔ خاص طور پر نقش جیسی۔

قلعے کی دیواریں گرنے لگی تھیں۔

ایمرجنسی ٹیوب کی روشنی خاصی کمزور ہوگئی تھی۔ باقی ماندہ روشنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کرن کے بنائے پانی سے نقش نے شامیر کو چند گولیاں نگلنے پر مجبور کیا اور پھر اسے ایک اور پین کلر انجکشن لگا دیا۔

کچھ دیر بعد نقش نے کہا۔ "ہمیں سونے کی کوشش کرنی چاہیے۔" پھر اس نے شامیر کے چہرے پر ماسک چڑھایا اور اس کے قریب ہی لیٹ گئی۔ کرن بھی اس کے قریب آگئی۔

اسی لمحے ایمرجنسی ٹیوب بجھ گئی اور ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا اوپر کھائی کے بند منہ پر البتہ برف کا سفید انعکاس محسوس ہو رہا تھا۔ برف...... جس نے ان تک مدد پہنچنے کی ہر راہ مسدود کر رکھی تھی۔

دوسری طرف ان لوگوں کی تلاش کے لیے ریسکیو آپریشن شروع ہوچکا تھا۔ کرنل سلیم نے جنرل عاطف لودھی کو نقش اور اس کے تین ساتھیوں کی گمشدگی کی اطلاع دے دی تھی۔

جنرل صاحب جانتے تھے برف زاروں میں گمشدگی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے دل کو مضبوط کرلیا۔ نقش کی ماں کو البتہ انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

موسم خراب ہونے کی وجہ سے گلگت کے لیے پرواز دستیاب نہیں تھی۔ انہوں نے کراچی سے اسلام آباد تک بائی ایئر اور پھر بائی روڈ سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔

❋......❋......❋

اگلے دن انہوں نے تین میں سے ایک ہیڈ لائٹ جلائی۔ شامیر کا بخار خاصا کم تھا۔ مگر ایک اور سنگین علامت نظر آرہی تھی۔ وہ سانس کھینچ کھینچ کر لے رہا تھا اور اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے۔ قوت مدافعت کم ہوجانے اور مسلسل برف میں رہنے کے سبب پھیپھڑوں پر برف کی ہلکی سی تہہ جمنے لگتی ہے جو رفتہ رفتہ پھیپھڑوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور انسان موت کے منہ میں چلا جاتا تھا۔

ادویات میں تین خاص قسم کے انجکشن پھیپھڑوں کو فعال کرنے کے لیے تھے۔ ان بلندیوں پر لڑنے والے سولجرز کو بطور خاص ان انجکشنوں کے

استعمال کی تربیت دی جاتی تھی۔

نقش کے کہنے پر کرن فوراً وہ انجکشن تیار کرنے لگی۔ جبکہ نقش نے شامیر کے سینے کو عریاں کرنا شروع کردیا۔ شامیر بھی سب دیکھ اور سمجھ رہا تھا۔ اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔ "مجھے مرجانے دو۔ میں تم دونوں پر بوجھ بن رہا ہوں۔" اس کے ذہن پر برسوں کی جمی برف پگھلنے لگی اور باپ کی موت کے بعد پہلی دفعہ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ دل گداز ہوگیا تھا۔

نقش نے نرمی سے اس کے آنسو صاف کیے۔

"مشکل وقت میں کیسے تمہیں چھوڑ دیں۔ اچھا اور یادگار وقت بھی تو ہم نے اکٹھے گزارا ہے۔ ویک اینڈ کی رات بھول گئے، جب تم نے "تارے ڈوب گئے رات مک گئی اے" سنایا تھا۔"

شامیر کے ہونٹوں پر مدہم سی مسکراہٹ ابھری۔

"اور تم نے میری پسندیدہ ترین غزل سنائی تھی۔"

نقش ایک لمحے کے لیے سب کچھ بھول گئی۔ کئی مہینوں کے ساتھ نے انہیں اتنا قریب نہیں کیا تھا جتنا مصیبت کے ان چند گھنٹوں نے کردیا تھا۔ "ریئلی، وہ تمہاری بھی پسندیدہ غزل ہے؟"

شامیر نے اثبات میں سرہلایا تو نقش بے طرح خوش ہوگئی۔

کرن اُسے حال میں لے آئی۔ "یہ لو انجکشن۔"

نقش کو جھٹکا سا لگا۔

شامیر، کرن کی طرف متوجہ ہوا۔ پچھلی والے واقعے کی تلخی کے بعد ان کے درمیان ابھی تک بات نہیں ہوئی تھی۔ مشکل وقت نے سارے منفی جذبات کو دھو ڈالا تھا۔

شامیر نے کہا۔ "کرن مجھے معاف کردو۔ اس دن میس میں تمہارے ساتھ میں نے بہت زیادتی کی تھی۔ شاید میں زندہ نہ بچوں، تمہارے ساتھ زیادتی کا بوجھ میں دل پر لے کر نہیں جانا چاہتا۔"

کرن نے تڑپ کر بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

کوئی اور وقت ہوتا تو نقش، کرن کی اس بے اختیاری پر پیچ و تاب کھاتی مگر آج اسے برا نہیں لگا، لاشعور میں تھا کہ شاید زندگی کا اختتام قریب ہے۔ اس لیے اس نے شامیر پر کرن کا حق بھی تسلیم کرلیا تھا۔ اس کی بے اختیاری پر شامیر ششدر رہ گیا تھا۔

نقش نے کرن کے ہاتھ سے انجکشن لے کر اس کی سوئی شامیر کی پسلیوں میں اتار دی۔ انجکشن لگانے کے بعد اس نے تیزی سے شامیر کا لباس درست کردیا۔ زیادہ دیر حفاظتی لباس کے بغیر گزارنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اپنی بے اختیاری کے سبب کرن شرمندہ سی نظر آرہی تھی اور اس کی نظریں نیچے گڑھی تھیں۔ نقش ناشتے کی تیاری میں لگی تو کرن اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

شامیر کے لیے انہوں نے دودھ میں نصف ہائی پروٹین بسکٹ نرم کرکے بنایا اور پھر اسے چمچ کی مدد سے کھلا دیا زود اثر انجکشن نے فوراً کام دکھایا تھا۔ شامیر کی سانسوں میں روانی آگئی تھی اور ہونٹوں کی نیلاہٹ تیزی سے کم ہوگئی تھی۔ باقی نصف بسکٹ سے کرن اور نقش نے ناشتہ کرلیا پھر انہوں نے چائے بنالی۔ شامیر نے بھی چائے پی تھی۔ اس کے بعد مدد کا انتظار شروع ہوگیا۔ جو طویل سے طویل ہوتا چلا گیا۔

پھر دو دن گزر گئے۔ شامیر کے ہونٹوں پر دوبارہ نیلاہٹ نے جگہ بنالی تھی۔ نقش نے اسے ایک اور انجکشن لگا دیا۔ سردی اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ خود نقش کو سانس لینے میں دشواری ہورہی تھی۔ رات کو کرن بھی

اکھڑی اکھڑی جھٹکے دار سانسیں لینے لگی۔

ان کے پاس اب خوراک کے نام پر تھوڑا سا چکن پاؤڈر بچ گیا تھا اور دو فیول ٹیبلٹ۔ نقش نے نصف چکن پاؤڈر کا سوپ تیار کرکے شامیر کو پلانے کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ مار کر کاغذی کپ گرادیا۔

"مرجانے دو مجھے۔" وہ بے حد تلخی سے چلایا۔ "ہمیں یہاں مرنے کے لیے بھیجنے والوں کو ہماری پروا نہیں تو تم کیوں میری فکر کرتی ہو۔" پھر وہ چلا چلا کر رونے لگا۔

نقش ساکت بیٹھی برف پر گرے سوپ کو دیکھ رہی تھی۔ پہلی دفعہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ کرن لاتعلقی سے برف پر پڑی اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔ اسے انجکشن کی ضرورت تھی۔ شامیر کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو اس نے نقش کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں کہا۔ "تم خود کو کیوں میری خاطر ہلکان کررہی ہو۔"

"کیونکہ حوری کو تمہارا انتظار ہے۔" نقش کی زبان سے پھسلا۔ "میں اس سے وعدہ کرکے آئی ہوں کہ بہت جلد اس کے چاچو کو اس کے پاس لے کر آؤں گی۔"

شامیر کو جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھے گیا۔ پھر اس کے ذہن میں برق سی لپکی۔ چند دن پہلے ویک اینڈ کی رات نقش کے دودھیا کبوتروں جیسے ہاتھ اور لمبے بالوں کی لٹیں دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا تھا کہ یہ بال اور ہاتھ اس نے پہلے بھی کہیں دیکھے ہیں۔ آج . نقش کے انکشاف کے ساتھ ہی اسے یاد آگیا تھا کہ اس نے یہ ہاتھ اور بال کہاں دیکھے تھے۔

حوری نے اپنی "لمبے بالوں والی آنی" کی تصویر اسے ایم ایم ایس کی تھی۔ آخری لمحوں پر اس لڑکی نے اپنا چہرہ چھپالیا تھا مگر اس کے ہاتھ اور بال نمایاں تھے۔ شامیر نے وہ تصویر فوراً صاف کردی تھی مگر بلاشبہ وہ لڑکی نقش ہی تھی۔

پھر اسے وہ خوبصورت ایس ایم ایس یاد آنے لگے۔ ذہن سے کئی پردے ہٹتے چلے گئے۔

شامیر نے اس کے چہرے کی طرف سلامت ہاتھ کی انگلی اٹھائی۔ "حوری کی لمبے بالوں والی آنی تم ہی ہو......؟"

نقش نے اعتراف جرم کے انداز میں سر جھکالیا۔

اس رات جو ان کی زندگی کی آخری رات بھی ثابت ہوسکتی تھی۔ نقش نے شامیر کا سر گود میں رکھے اسے اپنے دل کی ساری وارداتوں سے آگاہ کردیا تھا۔ اس نے آخر میں بڑے جذب سے کہا تھا۔

"تمہارے سنگ حوری سے کھیلتے ہوئے زندگی بتانے کی خواہش تو پوری نہیں ہوئی مگر تمہارے ساتھ موت کو گلے لگانے کی آرزو ضرور پوری ہوگی۔"

جواب میں شامیر نے اس کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگالیا تھا۔

اس رات...... کچھ فاصلے پر پڑی کرن بڑی خاموشی سے اپنی نومیدہ محبت سے نقش کے حق میں دست بردار ہوگئی تھی۔ اس نے سب کچھ سنا تھا۔ نقش نے شامیر کو چاہنے کا حق ادا کردیا تھا۔ اپنی محبت اسے نقش کی محبت کے سامنے ہیچ نظر آئی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے دو آنسو بہہ کر کنپٹیوں سے بہہ کر برف سے جاملے۔

نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب شامیر نے نقش کا ہاتھ تھام کر بڑے جذب سے پکارا۔

"نقش......"

"جی...... جانِ نقش" زندگی کا اختتام قریب تھا سو شرم کا جذبہ مٹ چکا تھا۔ جذبات اپنی خالص ترین شکل میں نمایاں تھے۔

"میری ایک خواہش جو ممکن ہے آخری ہو وہ تو پوری کردو۔"

نقش تڑپ اٹھی۔ محبوب نے پہلی دفعہ کچھ مانگا تھا۔ "حکم کرو۔"

شامیر چند لمحے خاموش رہا پھر دھیرے سے بولا۔ "ویک اینڈ کی رات والی غزل تو ایک دفعہ پھر سنادو۔" نقش نے سانس کھینچی تو کھانسنے لگی۔ کرن کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہنے لگے۔

کھانسی رکی تو نقش نے بمشکل گانا شروع کیا۔

یونہی کوئی مل گیا تھا سر راہ چلتے چلتے
نظر تھم کے رہ گئی تھی میرے ساتھ چلتے چلتے

شامیر کی خواہش پر نقش نے یہ شعر کئی دفعہ گایا تھا۔

شب انتظار آخر کبھی ہوگی مختصر بھی
یہ چراغ بجھ رہے ہیں میرے ساتھ جلتے جلتے

پھر شامیر کا ہاتھ نقش کے ہاتھ ہی میں رہ گیا اور وہ طویل ترین رات بھی بیت گئی۔

صبح کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا مگر کرن کی طبیعت سنبھلی ہوئی تھی۔ ایک عجیب دغریب خیال نے اسے طاقت دی تھی۔ اس نے اپنا منصوبہ نقش کے سامنے رکھا تو نقش رضامند ہوگئی۔ بے بسی کی موت مرنے سے پہلے ایک کوشش کی جاسکتی تھی مگر نقش نے کرن کی جگہ خود کو پیش کیا مگر کرن کسی بھی صورت رضامند نہ ہوئی۔ یہ کہہ کر اس نے نقش کو خاموش کردیا تھا کہ چونکہ اس کوشش میں فوری موت کا خطرہ بہت زیادہ ہے اس لیے نقش باز رہے۔ شامیر کو ابھی اس کی مدد کی ضرورت تھی۔

نقش کا سر جھک گیا۔ اسے اندازہ ہوگیا کرن اس کے جذبات سے آگاہ ہوچکی ہے۔ رات وہ بے خودی کی حالت میں نہ جانے کیا کیا بول گئی تھی۔

آخری انجکشن اور چکن سوپ کی آخری خوراک کے بارے میں کرن کو البتہ شامیر اور نقش کے بے پناہ اصرار کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے۔

نقش نے پہلے اس کی پسلیوں میں انجکشن لگایا جس کے سبب اس کی سانسوں میں مزید روانی آگئی۔ چکن سوپ نے اسے توانائی دی۔ اب وہ حرکت میں آنے کے لیے تیار تھی۔

آخری ہیڈ لائٹ کرن نے سر پر چڑھائی اور آخری ایمر جنسی ٹیوب بے حد احتیاط کے ساتھ اپنی ایک زپ والی جیب میں بند کرلی۔ سارا کام اسی ٹیوب کا تھا جس میں بند گیس اور کیمیکل آگ دکھائے جانے پر سخت دھماکہ خیز ثابت ہوئے تھے۔ یہ دراصل اس ٹیوب کا سائیڈ ایفیکٹ تھا جس کے اچھوتے استعمال کا خیال کرن کے ذہن میں آیا تھا۔

رسے کا ایک سرا نقش نے اپنی کمر سے باندھ لیا۔ دوسرے سرے پر کرن نے پھندا بنایا اور اپنی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں تقریباً پندرہ گز اوپر باہر نکلے ہوئے پتھر کی طرف اچھالا۔ کئی بار کی کوششوں کے بعد رسے کا پھندا پتھر کے "گلے" میں پڑ ہی گیا۔

کرن نے کھینچ کر پھندا کسا اور ان کی طرف سر گھما کر وکٹری کا نشان بنایا اور بولی۔ "تیار ہوجاؤ میں روانہ ہونے لگی ہوں۔" نقش نے خود سمیت رسے کا ایک بل شامیر کے گرد دیا اب ان دونوں نے مل کر کرن کا وزن برداشت کرنا تھا۔ رسے کے محدود ہونے کی وجہ سے نقش اور شامیر کے جسم ایک دونوں میں پیوست ہوگئے مگر اس لمحے لمس کی جادوگری بے اثر تھی۔

رسا تن گیا اور پھر رسے کے سہارے کرن نے برفیلے شیڈ کو چھوڑ کر پتھر کی طرف انچ انچ سرکنا شروع کردیا۔ ناتوانی کے سبب یہ بے حد مشکل کام تھا جو کرن سرانجام دینے چلی تھی۔ اس کے علاوہ معمولی سی لغزش کا مطلب کھائی کی اتھاہ گہرائی تھی۔

نقش اور شامیر کے وزن نے مل کر کرن کا وزن سہار لیا تھا۔ کرن رسے سے لپٹی آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھ رہی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا بلندی کی طرف اٹھنے میں اسے بے پناہ مشکل ہو رہی ہے مگر وہ اپنی قوت ارادی کے سہارے اوپر اٹھ رہی تھی۔

نقش اور شامیر دم سادھے اس کے ہیولے کو دیکھ رہے تھے۔ ہیڈ لائٹ کی سیدھی پڑنے والی روشنی کے سبب وہ انہیں ہیولے کی مانند ہی نظر آرہی تھی۔ البتہ کرن کی نظریں جس ٹارگٹ پر تھیں وہ صاف نظر آرہا تھا۔ یہ ٹارگٹ وہ پتھر تھا جس کے گلے میں کرن نے پھندا ڈالا تھا۔

آخر کار کمانڈوز کو دی جانے والی سخت ترین تربیت کام آئی اور کرن پتھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی مگر سب سے مشکل مرحلہ بھی اب درپیش تھا۔ کرن کو اب جمناسٹری مہارت درکار تھی۔ اب کسی طرح اسے ایک فٹ سے بھی کم چوڑے اس گول پتھر پر کھڑے ہو کر ایمر جنسی ٹیوب کو اوپر کھائی کے منہ پر جمی برف میں پھنسانا تھا۔

کرن نے پتھر تک دونوں پاؤں پہنچائے اور ہانپتی ہوئی آواز میں چلائی۔ "رسے کو کھینچ کر تناؤ دو!" نقش نے اپنی پوری طاقت صرف کی۔ شامیر نے بھی سلامت بازو سے پورا زور لگایا رسا آخری حد تک تن گیا۔

کرن نے پاؤں ہٹا کر ہاتھوں سے کام لیا اور پتھر کو تھام لیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے رسے پر دونوں پاؤں ٹکائے' کیلوں والے بوٹ اس کی مدد کررہے تھے۔

نقش اور شامیر کے بازو شل ہوئے جارہے تھے۔ ساتھ ہی ان کی سانسیں بھی جیسے رک گئی تھیں۔ کرن پتھر کو تھامے رسے کے اوپر اکڑوں بیٹھی تھی۔ پھر کرن کے ہاتھ پتھر سے آہستہ آہستہ کھائی کی دیوار کے ساتھ جا لگے۔ وہ خود بھی دھیرے دھیرے اٹھ رہی تھی پھر اچانک ہی اس نے دونوں پاؤں پتھر پر رکھ دیے۔

نقش اور شامیر کے کافی دیر سے رکے سانس بیک وقت خارج ہوئے۔ کرن نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ اب اس کی پشت ان دونوں کی طرف تھی اور وہ پتھر پر کھڑی کھائی کی دیوار کے ساتھ چپکی اپنا توازن درست کررہی تھی۔

متوازن ہوتے ہی اس نے اپنی جیب سے ایمر جنسی ٹیوب نکال کر اسے جھٹکے دے کر روشن کیا اور اسے ایک سرے سے پکڑ کر آدھے سے زیادہ کھائی کی برفانی چھت میں دھنسادیا۔

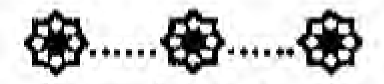
اپنا کام اس نے مکمل کردیا تھا۔ بلندی پر نصب ہونے والی ٹیوب نے ہر طرف روشنی پھیلا دی تھی۔ کرن آہستہ آہستہ پتھر پر بیٹھنے لگی۔ اس کے اعتماد میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔

شامیر نے خوشی سے چیخ کر کہا۔ "ویل ڈن کرن! تم نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔" زندگی کی امید نے ان میں نئی روح پھونک دی تھی۔

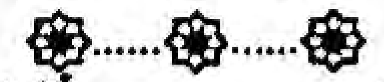
شامیر کی توصیف نے کرن میں نئی ترنگ پیدا کردی تھی۔ شاید اسی سبب وہ قدرے بے پروا ہوئی۔ اس نے اندازے سے رسے کی طرف پاؤں بڑھائے۔ نقش اور شامیر نے دوبارہ رسے پر گرفت کرلی تھی۔

رسے کی بجائے کرن کا پاؤں خلا میں گیا جس کے سبب پتھر پر اس کا توازن بگڑا۔ وہ پتھر سے نیچے لڑھکی۔ آخری لمحے میں اس نے رسے پر ہاتھ ڈالنا چاہا' مگر گرفت نہ کرسکی۔ رسے کو صرف ایک جھٹکا لگا تھا۔ اس کا جسم پتھر کی مانند کھائی کی اتھاہ گہرائیوں

میں گرتا چلا گیا۔
وہ دونوں اپنی جگہ پتھر کے بت بنے رہ گئے۔ اور کرن انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر کھائی کی اتھاہ گہرائیوں میں قیامت تک کے لیے گم ہوگئی۔
پھر اس کا جسم کھائی کی گہرائیوں میں پتھریلی چٹانوں سے ٹکرانے کی آواز گونجی تو وہ دونوں ہوش میں آئے۔ نقش ہذیانی انداز میں چیخی اور گہرائی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ وہ قطعاً ہوش کے عالم میں نہیں تھی۔ شامیر نے سلامت بازو سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ شامیر سے لپٹ کر اونچی آواز میں سسکیاں بھرنے لگی۔
خود شامیر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کرن نے اپنی جان قربان کر کے ان کے زندہ رہنے کی امید پیدا کر دی تھی۔

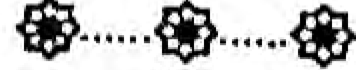


میجر جنرل عاطف لودھی، جہلم سے اوپر ٹریننگ کیمپ میں پہنچ چکے تھے۔ انہی کی وجہ سے گم ہوجانے والوں کو ابھی تک ڈھونڈا جا رہا تھا۔
حالانکہ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ ایک بڑا ایوالانچ انہیں نگل چکا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ضرور "مے ڈے" کا میسج بھیجتے۔
مگر جنرل صاحب کا دل بیٹی کو مردہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ خود ایک ریسکیو ٹیم کے ساتھ نکلے ہوئے تھے۔ کرنل سلیم بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ اس جگہ کے قریب ہی تھے۔ جہاں برف کے نیچے نقش اور شامیر دفن تھے۔ کرن انہیں چھوڑ کے جا چکی تھی۔



خود کو سنبھالنے کے بعد شامیر نے نقش کو جھنجوڑا تھا جو ابھی تک سسکیاں لے رہی تھی۔ "نقش حوصلہ کرو! کرن نے ایک مقصد کے لیے جان دی ہے۔ اس کا نام آرمی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ وہ شہید ہوئی ہے۔ خود کو سنبھالو ہمیں اس کی قربانی کو ضائع ہونے سے بچانا ہے اور دنیا کو اس کے عظیم کارنامے سے آگاہ کرنا ہے۔"
نقش بھی کچھ سنبھلی اس نے شامیر سے جدا ہوتے ہوئے کہا۔ "ہم زندہ رہے تو ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔" شامیر نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنا نائن ایم ایم سنبھال لیا۔ وہ لیفٹ ہینڈر تھا۔ اور اس کا الٹا ہاتھ ہی سلامت تھا۔ نشانہ بازی میں اس نے ہمیشہ پوزیشن لی تھی اور آج تو اسے اپنی زندگی کا سب سے اہم نشانہ لگانا تھا۔ اگر نشانہ چوک جاتا اور اپنے قریب لگنے والی گولی کے سبب ایمرجنسی ٹیوب برف کے ساتھ کرن کے قریب جا گرتی تو انہیں دنیا کی کوئی طاقت مرنے سے نہیں بچا سکتی تھی۔
شامیر نے نشانہ لیا۔ اس کا بازو جیسے فولاد میں ڈھل گیا تھا۔ معمولی سی لرزش بھی نہیں تھی۔ اس کے بازو میں۔ نقش نے آنکھیں بند کرلیں۔
ایک دھماکے سے گولی چلی، نشانہ بالکل درست لگا۔ برف میں دبی ایمرجنسی ٹیوب زوردار دھماکے سے پھٹی اور کھائی کے منہ پر جمی ٹنوں برف اڑ گئی۔
دھماکے کے ساتھ ہی ان پر بھی ڈھیروں برف گری تھی۔
نقش نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ سورج کی روشنی کھائی میں اتر آئی تھی۔ روشنی...... جو زندگی کی علامت تھی۔
کچھ دیر بعد کچھ لوگوں نے کھائی میں جھانکا، نقش کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ کرنل سلیم کے ساتھ اس کے بابا بھی تھے۔ جنہیں اپنے تاثرات قابو رکھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔
پھر شامیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نقش نے

دیکھا۔ اس کی بجھ جانے والی سحر انگیز آنکھوں میں دوبارہ سے زندگی جھلملانے لگی تھی اور آج تو اس کی آنکھوں میں اور بھی کئی دلفریب رنگ تھے۔
نقش جیت گئی تھی۔ اس نے شامیر کو بدل دیا تھا، مگر اس تبدیلی کا زیادہ کریڈٹ کرن کو جاتا تھا۔ جس نے اپنی جان کی قربانی دے کر ثابت کر دیا تھا کہ سبھی لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں، کچھ بہتر سے بہتر کی تلاش میں خود کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی ہیں تو کچھ اپنی جان دے کر محبوب کو زندگی بخشنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔
شامیر کھائی کے ساتھ ساتھ اپنے تعمیر کردہ انتہا پسندی کے قلعے کو بھی توڑ کر باہر نکل آیا تھا۔



تین ماہ گزر چکے تھے۔ ان تین ماہ میں بہت کچھ ہوا تھا۔ شامیر مکمل صحت یاب ہو چکا تھا مگر کھائی میں گزاری اپنی آخری رات کی بے اختیاری کے سبب نقش شرم کے مارے اس کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔ وہ صرف ایک دفعہ ماہم کے ساتھ سی ایم ایچ گئی تھی مگر شامیر کی نگاہوں کے دائرے سے گھبرا کر بھاگ آئی تھی۔ ماہم نے اس کا خوب ریکارڈ لگایا تھا۔
کرن کو بعد از شہادت تمغہ شجاعت دیا گیا تھا۔ اس کی کہانی میڈیا کے سامنے آچکی تھی۔ اسے اور اس کی فیملی کو داد و تحسین سے نوازا جا رہا تھا۔
کاشف کا نام البتہ آرمی کی خفیہ تاریخ میں سیاہ حروف سے لکھا گیا تھا۔ آرمی کی نیک نامی کو قائم رکھنے کے لیے اس کے "کارنامے" کو دبا دیا گیا تھا۔ نقش اور شامیر نے بھی اس سلسلے میں زبان بند رکھی تھی۔
نقش اپنے گھر میں تھی جب شامیر کی پوری فیملی آدھمکی۔ خلاف معمول جنرل صاحب بھی گھر پر تھے۔ شامیر، حوری کو لے کر اس کے پاس لاؤنج میں آ گیا تھا۔
حوری سے نقش کئی دفعہ مل چکی تھی۔ اس کے باوجود حوری آ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس نے حسب معمول دو پونیاں بنا رکھی تھیں۔ مگر اب اس کے بال خاصے لمبے ہوگئے تھے۔
نقش نے اسے چوما تو وہ پھیل کر نقش کی گود میں لیٹ گئی۔ "آنی..... آپ ہمارے گھر پکی پکی کب آئیں گی؟" اس نے بڑے لاڈ سے پوچھا تھا، یقیناً اس کی "چابی" بھری ہوئی تھی۔
نقش نے شامیر کی طرف دیکھا جو شرارت سے مسکرا رہا تھا۔
"بتائیں نا؟" حوری ٹھنکی۔
"جب آپ کے چاچو..... کہیں بہت دور چلے جائیں گے۔"
چاچو کے دوبارہ دور جانے کا سن کر حوری ڈر گئی۔ اس نے نقش کی گود چھوڑی اور چاچو سے جا لپٹی۔

سچ ہے یہ

⌘ انسان جب حد سے زیادہ خوش ہوتا ہے تو فطرت اس سے انتقام لیتی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔
⌘ اپنی سوچوں کو پانی کے قطروں کی طرح صاف و شفاف رکھیں جس طرح قطروں سے دریا بنتا ہے۔ اسی طرح سوچوں سے ایمان بنتا ہے۔
⌘ اتنا اونچا مت اڑو کہ سورج کی شعاعیں تمہیں پگھلا دیں اور تم بے جان جسم کی طرح زمین پر گر پڑو۔
⌘ بعض ناموں کے ساتھ بہت سی یادیں وابستہ ہوتی ہیں مگر وہ وقت کی مجبوریوں کے ساتھ اس لیے زبان پر نہیں لائے جاتے کہیں ان کے ساتھ کسی قسم کی گراوٹ نہ منسوب کر دی جائے۔
(جویریہ چٹھہ، برج چٹھہ)

"نہیں ...... چاچو اب کہیں نہیں جائیں گے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

شامیر نے اس کے لمبے بالوں والی پونیاں چومیں "آنی نے مذاق کیا ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" مگر حوری مطمئن نہیں تھی۔ وہ اس سے لپٹی رہی۔

شامیر نے نقش پر نگاہیں جمائیں۔ نقش کا سر جھک گیا۔ شامیر نے سنجیدہ انداز میں کہا۔ "میرے بھائی اور بھابی تمہیں ہمیشہ کے لیے مانگنے آئے ہیں۔"

"نہیں ...... شامیر ......" نقش نے بے ساختہ کہا۔

"کیوں ......؟" شامیر نے بھوئیں اچکائیں۔

"نارمل زندگی کی طرف تم ہی مجھے لائی ہو۔ اب تو باقی زندگی تمہارے ساتھ ہی گزرے گی۔ ماہم اور بھابی اوراس سے پہلے میرا دل مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔"

نقش کے چہرے پر سرخی امڈ آئی۔ پھر اس نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ "مگر شامیر ...... تمہیں چاہتے چاہتے میرا جذبہ کچھ ارفع ہوگیا ہے۔ بے شک میں نے تمہاری خاطر آرمی جوائن کی تھی مگر میں اب اس ملک کی خاطر جینا چاہتی ہوں۔ میرے ملک پر دشمنوں نے سیاہ رات طاری کردی ہے۔ اب مجھے اس رات کی "سحر" کرنی ہے۔"

شامیر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہم مل کر بھی تو یہ سحر کرسکتے ہیں۔" اس نے بے حد جذب سے کہا۔

نقش کا دل پگھلنے لگا۔ اس نے کمزوری آواز میں کہا۔ "مگر میرے دل پر کرن کی شہادت کا بہت بوجھ ہے۔ میں نے تو صرف تم سے محبت کی ہے مگر اس نے تمہاری محبت میں جان دی ہے۔ تمہاری بگڑتی حالت کے سبب ہی اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگائی تھی۔"

شامیر کا بھی سر جھک گیا۔ پھر ایک خیال سے اس کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ "اسے ہمیشہ یاد رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔" نقش نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

شامیر نے کہا۔ "ہم خدا سے ایک "کرن" مانگیں گے اور اسے کرن کی مانند ہی پروان چڑھائیں گے۔"

اس کا مطلب جان کر نقش بری طرح سے شرما گئی تھی۔ مگر بات اس کے دل کو لگی تھی۔ وجود میں میٹھی سی سنسنی دوڑنے لگی تھی۔ شامیر اس کے فرار کی ہر راہ مسدود کررہا تھا۔

اس کے چہرے کے خوبصورت رنگوں پر نظر جماتے ہوئے شامیر نے کہا۔ "پتا نہیں جنرل صاحب کیا فیصلہ کرتے ہیں۔"

نقش شوخ ہوئی۔ "اپنی بیٹی کے لیے ایک کیڈٹ کا رشتہ ...... جس کے کندھوں پر ابھی سیکنڈ لیفٹیننٹ کے اسٹار بھی نہیں لگے۔ وہ یقیناً صدمے سے بے ہوش ہوجائیں گے۔"

"میں کیپٹن بننے تک انتظار کرسکتا ہوں۔" شامیر نے گھبراہٹ کے مارے بوکھلا کر کہا تو نقش بے اختیار ہنسنے لگی۔

کچھ دن بعد نقش اور شامیر اپنی ادھوری ٹریننگ مکمل کرنے کے لیے کرنل سلیم کے ٹریننگ کیمپ پہنچ گئے۔ کیمپ میں ان کا شاندار استقبال ہوا تھا۔

نقش سوچ رہی تھی شامیر کی زندگی پر چھائی سیاہ رات کی سحر تو اس نے کرن کی قربانی کے سبب کردی تھی۔ اس ملک پر چھائی سیاہ رات کی سحر نہ جانے کب اور کس کس کی قربانی لے کر ہوگی، مگر وہ مایوس نہیں تھی۔ "امید سحر" باقی تھی۔

